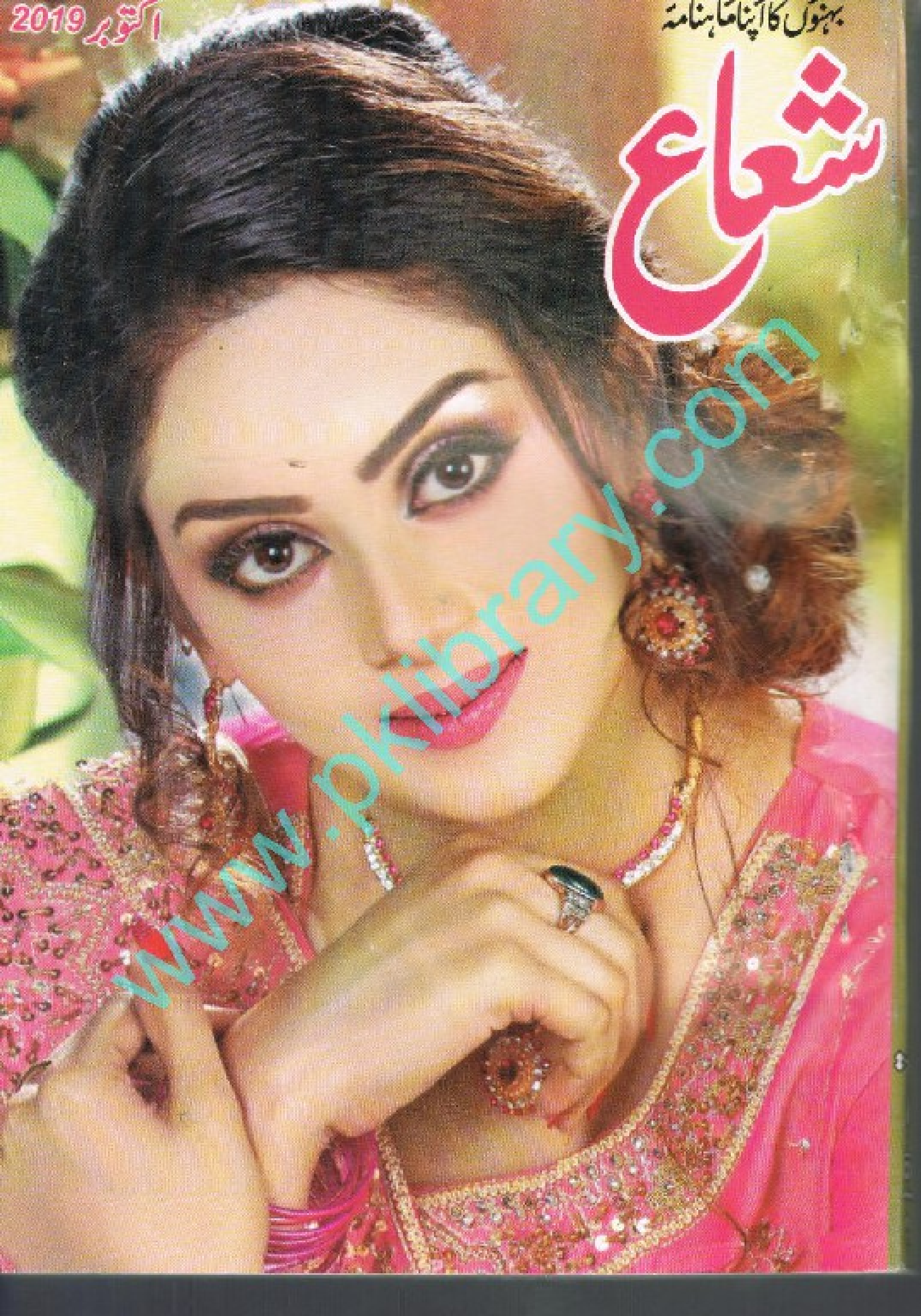

www.pklibrary.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — آفتاب ریاض

مدیرہ اعزازی — امت الصبور

قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
(ایڈووکیٹس اینڈ لیگل ایڈوائزرز)

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 - اردو بازار کراچی

اکتوبر 2019
جلد 34 شمارہ 2
قیمت 70 روپے

پاکستان (سالانہ) .... -/700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ .... -/6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا _ -/7000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

www.pklibrary.com

پہلی شعاع	رضیہ جمیل	8
حمد	ریحانہ چوہدری	9
نعت	مسعود صدیقی	9
نبی کی باتیں	ادارہ	10

انٹرویو

بنتِ حسن	نبیلہ ابر راجہ	18
دستک	شاہین رشید	15
جب تجھ سے ناتا	مسز س ص	24

ناول

شہرِ تمنا	نعیمہ ناز	36
شام کی حویلی میں	رخسانہ نگار عدنان	184

مکمل ناول

ایک دیا رہنے دیا	نگہت سیما	98
اسیرِ حب	فرح بھٹو	132

ناولٹ

چولہا، تم اور میں	امت العزیز شہزاد	70
بے مروت	فائزہ رابعہ	168
وہ نازنین	فرح بخاری	206

افسانے

دوست چڑیا	صدف آصف	56
یار دلدار	افشین نعیم	164
حسن آرا	سمیرا گل	63
چڑیاں چگ گئیں	زارا جمیرا	94
راجا کی بیٹی	سعدیہ رئیس	125

حسین غزلیں

غزل	حبیب جالب	230
غزل	قابل اجمیری	230
نظم	گل زار	231
غزل	انیاف ابرک	231

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	29	تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	247
مسکراہٹیں	ادارہ	232	آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	238
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	234	موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	255
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	237	خوبصورت ہے	ادارہ	257

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [redacted]
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

www.paklibrary.com

رخسانہ نگار

شعاع اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

وطن عزیز پر جانے کیسی افتاد ہے کہ پریشانیوں کا سلسلہ تھمنے میں نہیں آتا ہے۔ بے چینی اور بے اطمینانی جیسے یہاں کے باسیوں کا مقدر بن گئی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا مسئلہ۔ ملک میں استحکام کی صورت کیسے بنے۔ آسمان کو چھوتی مہنگائی۔ گیس اور بجلی کے بھاری بھرکم بل اور اداروں کے بند ہونے کی وجہ سے بے روزگاری کے مسائل کم نہیں تھے کہ حال ہی میں دل دہلانے والے واقعات سامنے آئے ہیں۔ بچوں کو اغوا کے بعد زیادتی کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔

قصور کی تحصیل چونیاں جہاں یہ لرزہ خیز واقعات سامنے آئے ہیں، یہ وہی علاقہ ہے جہاں کی زینب کے واقعے نے ملک گیر شہرت حاصل کی تھی۔ الیکٹرانک میڈیا نے اس واقعہ پر موثر شو پروگرام کر ڈالے تھے۔ خبروں میں زینب کے علاوہ کوئی موضوع ہی نہ تھا۔ پرنٹ میڈیا نے بھی بڑی بڑی سرخیاں لگا کر خبریں شائع کیں۔ اداریے لکھے گئے جس میں حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ______ اداروں نے بھی متاثرہ خاندان سے ہمدردی کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ مجرمان کو جلد از جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا لیکن اب اس طرح کے کئی واقعات رپورٹ ہونے کے باوجود کوئی آواز بلند نہیں ہو رہی۔ میڈیا مکمل خاموش ہے۔ شاید اسی لیے پولیس اور انتظامیہ کوئی توجہ نہیں دے رہی، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ میڈیا کی اس بے حسی کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ اگر انتظامیہ اور پولیس توجہ دے تو کم از کم دیگر معصوم بچوں کو بچایا جا سکتا ہے۔

ہم سب کو بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً مائیں اپنے بچوں پر کڑی نظر رکھیں۔ اپنے گرد کے لوگوں میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہو تو اس کو نظر انداز نہ کریں۔ فوراً نوٹس لیں۔ ریاست، انتظامیہ اور میڈیا کی کارکردگی دیکھتے ہوئے ان سے کوئی توقع رکھنا عبث ہے۔ ہمیں اپنی مدد خود ہی کرنا ہو گی۔

ایک اور چراغ بجھا

ماہر خطاط اور آرٹ ڈائریکٹر محترم صابر حسین صاحب اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

صابر حسین صاحب کا اس ادارے سے دیرینہ تعلق تھا۔ وہ ریاض صاحب کے اس دور کے ساتھی تھے جب ریاض صاحب نے پرچوں کی دنیا میں قدم نہیں رکھا تھا۔

صابر حسین کا فن بے مثال تھا اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ ان کی محبت اور وفاداری بھی مثالی تھی۔ اس ادارے سے وابستہ ہوئے تو آخری سانس تک دوسری طرف نہیں دیکھا۔ ایسے بے مثال فنکار اور ایسی وضع دار شخصیات بہت کم ہوتی ہیں۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- ایک دیا جلے دیا۔ نگہت سیما کے ناول کی آخری قسط،
- اسیر جنب۔ فرح بھٹو کا مکمل ناول،
- ثانت عابد، فرح بخاری اور امتہ العزیز شہزاد کے ناولٹ،
- صدف آصف، سمیرا گل، سعدیہ رئیس، ذارا ہجرا اور انجیلا نعیم کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور نعیم ناز کے ناول "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے"۔ تحقیق کے تجربات،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ نبیلہ ابر راجہ اور کاشف محمود کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، باتوں سے خوشبو آئے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

سن لے دل کی صدا، اپنے در پہ بلا
اے خدا، اے خدا، اے خدا، اے خدا

میں گناہ گار ہوں، میں خطا کار ہوں
تیری رحمت کا دامن فراخ اور کھلا
اے خدا، اے خدا، اے خدا، اے خدا

اپنی آنکھوں میں اشکِ ندامت بھرے
سر جھکائے کھڑی ہوں میں آگے تیرے
اے خدا، اے خدا، اے خدا، اے خدا

میں جو ڈالوں نظر اپنے اعمال پر
بجز تاریکیوں کے، کچھ نہ آئے نظر
اے خدا، اے خدا، اے خدا، اے خدا

حرفِ توبہ میرے، ذہن و دل میں بھرے
میرا دامن فگار اور روح تار تار
اے خدا، اے خدا، اے خدا، اے خدا

مسکان چوہدری

نعت رسول مقبولؐ

میں یوں تڑپتا ہوں ہر لحہ حاضری کے لیے
کہ زندگی ہو مری جیسے آپؐ ہی کے لیے

یہ سوچ کر کے ہوں نعلین میرے سر کو عطا
غلام بن کے میں حاضر ہوں نوکری کے لیے

خدا کے بعد محمدؐ وہ لفظ ہے جس کو
ہے بے حساب لکھا میں نے خوشخطی کے لیے

اسی سے زندگی پائی ہے زندگانی نے
کہ انتظار کیا چودھویں صدی کے لیے

میں نعت لکھتا ہوں آقا کی اور سب الفاظ
دعائیں کرتے ہیں میری سلامتی کے لیے

ہوا جو ایک اشارے سے چاند دو پارہ
جڑا تو ایک کرشمہ تھا چاندنی کے لیے

ہے دل کے غار میں بستی حضورؐ کی خوشبو
جو کام آتی ہے سانسوں کی تازگی کے لیے

مسعود صدیقی

www.pklibrary.com

پیارے نبی کی پیاری باتیں

قرآن پڑھنا اور اسے حفظ کرنا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(روز قیامت) صاحب قرآن (قرآن پڑھنے اور اسے حفظ کرنے والے) سے کہا جائے گا: قرآن پڑھتا جا اور (درجے) چڑھتا جا اور اس طرح آہستہ آہستہ تلاوت کر جیسے تو دنیا میں ترتیل سے پڑھتا تھا۔ چنانچہ تیرا مقام وہ ہوگا جہاں تیری آخری آیت کی تلاوت ختم ہوگی۔“

(اسے ابو داود اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل: (1) اس میں قرآن کریم کے حافظ اور کثرت سے تلاوت اور اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کی فضیلت کا ذکر ہے۔

(2) چڑھنے سے مراد جنت کے درجوں پر چڑھنا ہے۔ یعنی جتنا قرآن یاد ہوگا اسی حساب سے وہ ترتیل سے پڑھتا جائے گا اور جنت کے درجات پر فائز ہوتا چلا جائے گا۔

(3) اس میں قرآن کی تلاوت اور اس کے حفظ کرنے کی ترغیب ہے تاکہ وہ جنت میں حفظ قرآن کی بدولت زیادہ سے زیادہ بلند درجات حاصل کر سکے۔

قرآن کریم کی دیکھ بھال اور اس کو بھلا دینا

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس قرآن کی حفاظت (دیکھ بھال) کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! یہ (قرآن سینوں سے) نکل جانے میں اس اونٹ سے زیادہ تیز ہے جو رسی میں بندھا ہو (اور اسے کھول کر بھاگ نکلنے والا ہو)۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

قرآن کریم کی حفاظت اور دیکھ بھال کا مطلب ہے کہ پابندی سے اس کی تلاوت کی جائے۔ ورنہ غفلت کی صورت میں انسان اسے اتنی تیزی سے بھولتا ہے کہ اتنی تیزی سے اونٹ بھی رسی تڑوا کے نہیں بھاگتا۔ یہ تیزی سے بھول جانے میں تشبیہ ہے۔

حافظ قرآن

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حافظ قرآن کی مثال رسی سے بندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے۔ اگر وہ اس اونٹ کا خیال رکھتا ہے تو وہ (اپنے کھونٹے سے) بندھا رہتا ہے اور اگر اسے کھول دے گا تو چلا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

(1) صاحب قرآن سے مراد، قرآن کا حافظ ہے، مکمل حافظ ہو یا کچھ اجزاء کا حافظ جتنا بھی یاد ہو اسے پڑھتا رہے گا تو یاد رہے گا، جیسے اونٹ پر کڑی نظر رکھی جائے تو وہ بندھا رہتا ہے اور اگر اسے کھول دیا جائے تو اتنا بھاگے گا کہ اسے تلاش کرنا اور پکڑنا مشکل ہو جائے گا۔

(2) اس میں ان والدین کے لیے بھی سبق ہے جو بچوں کو حفظ کروا کر اسکول داخل کروا دیتے اور پھر وہ قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے، اسی طرح منزل یاد کیے بغیر جلدی حفظ کرنے والے حضرات

www.paklibrary.com

کے لیے بھی تنبیہ ہے۔

قرآن خوش الحانی سے پڑھنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”اللہ تعالیٰ کسی چیز کے لیے اس طرح کان نہیں لگاتا جس طرح وہ اس خوش آواز پیغمبر کے لیے کان لگاتا ہے جو قرآن کو غنا کے ساتھ اونچی آواز سے پڑھتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

کان لگاتا ہے کے معنی ہیں: سنتا ہے۔ اور یہ اشارہ ہے کہ ایسے پڑھنے والے سے اللہ خوش ہوتا اور اس کے عمل کو قبول فرماتا ہے۔

فوائد و مسائل: (1) اللہ تعالیٰ کان لگا کر توجہ سے سنتا ہے۔ یہ جہاں ایک طرف اس کی رضا اور قبولیت کی دلیل ہے، وہاں دوسری طرف اس کی ایک صفت (کان) اور اس سے سننے کا بیان ہے جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ تاہم ہم اس کی کیفیت بیان کر سکتے ہیں نہ اسے کسی کے ساتھ تشبیہ ہی دے سکتے ہیں۔

(2) غنا کے ساتھ پڑھنے کا مطلب گانے کی طرح تکلف اور تصنع سے پڑھنا نہیں ہے، جیسے آج کل کے بہت سے قاری بالخصوص مصر کے بعض قراء پڑھتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب تجوید و حسن صوت کے ساتھ ایسے سوز سے پڑھنا ہے جس سے رقت طاری ہو۔ (3) اس میں خوش آوازی اور سوز سے قرآن پڑھنے کی ترغیب ہے، تاہم یہ ضروری ہے کہ حرفوں کی ادائیگی اس طرح ہو کہ اس میں کمی یا بیشی نہ ہو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”تمہیں حضرت داؤد کے سروں میں سے ایک سر (خوش آوازی) دی گئی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”اگر تم مجھے دیکھ لیتے جب کہ گزشتہ رات میں تمہاری قرأت سن رہا تھا (تو یقیناً تم خوش ہوتے۔)“

فوائد و مسائل:

حسن صوت حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا کیا گیا تھا۔ حسن صوت بھی اللہ کا ایک انعام ہے۔ جس کو چاہے وہ اس سے نواز دے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں یہ نعمت ملی اور وہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو اللہ کا کلام سنا کر اللہ کے دین کی طرف بلاتے ہیں۔ خوش آوازی کو دنیا کمانے کے لیے بے حیائی پھیلانے کا ذریعہ نہیں بناتے۔ جس کا انجام نہایت برا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی نماز میں سورت (وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ) پڑھتے ہوئے سنا، چنانچہ میں نے آپ سے زیادہ اچھی آواز والا کوئی نہیں سنا۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں صراحت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح دیگر تمام خوبیاں عطا کی گئی تھیں، حسن صوت سے بھی آپ کو نوازا گیا تھا اور دعوت تبلیغ میں اس کی آپ کو ضرورت بھی تھی۔

حضرت ابو لبابہ بشیر بن عبدالمنذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو قرآن کو غنا کے ساتھ نہ پڑھے، وہ ہم میں سے نہیں۔“ (اسے ابو داؤد نے جید سند سے روایت کیا ہے۔)

غنا کے ساتھ پڑھنے کے معنی ہیں: وہ خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھتا ہے۔

فائدہ:

ہم میں سے نہیں، کا مطلب ہے ہمارے طریقے اور سنت پر نہیں ہے۔ اس میں بھی خوش آوازی اور سوز ورقت سے قرآن پڑھنے کی ترغیب ہے۔ کیونکہ اس سے قرآن کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔

قرآن سننا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''(اے ابن مسعود!) مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔''

تو میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کو پڑھ کر سناؤں حالانکہ آپ پر تو وہ اترا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اپنے علاوہ کسی اور سے سننا پسند کرتا ہوں۔''

چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نساء کی تلاوت کی یہاں تک کہ میں اس آیت تک پہنچ گیا: (فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا......)

''چنانچہ اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان سب پر اے پیغمبر! تجھے گواہ بنائیں گے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب تم بس کرو۔''

جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں اہل علم وفضل کی توقیر و تعظیم کا پہلو ہے۔ نیز دوسروں سے قرآن کی تلاوت سننے اور اس پر تدبر کرنے کی بھی ضرورت ہے، جس طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا۔

مخصوص سورتیں اور آیتیں پڑھنا

حضرت ابوسعید رافع بن معلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''کیا میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی عظیم ترین سورت نہ سکھلاؤں؟''

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ جب ہم مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے کہا۔

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں تجھے قرآن کی عظیم ترین سورت سکھلاؤں گا؟''

آپ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) یہ سبع مثانی (بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں) اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) قرآن کریم میں آتا ہے: (الحجر 15:87) ''اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو سات (آیتیں) جو (نماز میں) دہرا کر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا ہے۔ (ترجمہ)'' مذکورہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سبع مثانی سے سورۂ فاتحہ مراد لی ہے، کیونکہ یہ سات آیتیں ہر نماز میں اور ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی، جیسا کہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''اس شخص کی نماز نہیں، جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔

(2) اسے قرآن کی عظیم ترین سورت اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ تمام مقاصد قرآن کی جامع اور مجملا ان تمام مضامین پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کی دیگر سورتوں میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں عقیدۂ توحید اور صرف ایک رب کی عبادت اور اسی سے استعانت کرنے کا، نیز روز جزا، وعدہ وعید اور

www.pklibrary.com

گزشتہ امتوں کے سعادت مندوں اور گمراہوں دونوں کے قصوں سے عبرت پکڑنے کا بیان ہے۔ اسی لیے ابو داؤد اور ترمذی کی ایک روایت میں اسے **اُمّ القرآن** بھی کہا گیا ہے، یعنی قرآن کی جڑ۔

سورہ اخلاص

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (**قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ**) کے بارے میں فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک یہ (سورۂ اخلاص) تہائی قرآن کے برابر ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا:

''کیا تم میں سے کوئی اس بات سے عاجز ہے کہ ایک رات میں تہائی 1/3 قرآن پڑھے؟''

یہ بات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گراں معلوم ہوئی اور انہوں نے کہا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے کون اس کی طاقت رکھتا ہے (کوئی نہیں رکھتا) تو آپ نے فرمایا: ''(**قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ**) (آخر تک) تہائی قرآن ہے۔'' (بخاری)

فائدہ:

سورۂ اخلاص ایک مرتبہ پڑھ لینا اجر و ثواب میں ایک تہائی قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔ اس سورت میں اللہ کی توحید کا بیان اور اس کے کسی ہم سر کے ہونے کی نفی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی توحید کا بیان کتنا پسند ہے اور اسی حساب سے اس کو شرک سے کتنی نفرت ہے۔ اسی لیے اس نے شرک کو ناقابل معافی گناہ قرار دیا ہے۔

تہائی قرآن

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو (**قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ**) بار بار دہراتے ہوئے سنا۔ جب صبح ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کا ذکر کیا۔ وہ اس عمل کو کمتر (معمولی) سمجھتا تھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔'' (بخاری)

جنت میں لے جانے والی

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس سورت (**قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ**) کو پسند کرتا ہوں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی محبت تجھے جنت میں لے جائے گی۔''

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل:

سورۂ اخلاص کی بیان کردہ فضیلت کی توجیہ بعض علماء نے اس طرح کی ہے کہ علوم قرآن کی تین قسمیں ہیں: ایک توحید دوسری تشریع اور تیسری قسم اخلاق، ان میں سے پہلی قسم توحید کا جامع اور مکمل بیان اس سورت میں ہے: (**نُزْهَةُ الْمُتَّقِيْن**) اس کی اور بھی کئی توجیہات بیان کی گئی ہیں۔ امام ابن عبدالبر کے نزدیک اس قسم کی توجیہات سے سکوت بہتر ہے۔

بے مثل

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تجھے نہیں معلوم کہ کچھ آیات اس رات میں ایسی نازل کی گئی ہیں جن کی مثل پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں؟ (وہ) (**قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ**) اور (**قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ**) ہیں۔'' (مسلم)

www.pklibrary.com

فائدہ:

اَلَمْ تَرَ کیا تو نے نہیں دیکھا، یا تجھے معلوم نہیں، بلکہ تعجب ہے۔ "ان کی مثل نہیں دیکھی گئیں" کا مطلب ہے کہ کوئی سورت ان کے علاوہ، ایسی ہو کہ سب کی سب تعویذ ہو، یعنی پناہ طلب کرنے پر مشتمل ہو۔ یہ چیز صرف ان دو سورتوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے مُعَوِّذَتَیْن کہا جاتا ہے۔ پناہ دینے والیں، کیونکہ ان کے ذریعے سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔

پناہ دینے والی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (معوذتین کے نزول سے پہلے اپنے الفاظ میں) جنوں اور لوگوں کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے، یہاں تک کہ معوذتین نازل ہوگئیں۔ جب یہ نازل ہوگئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذریعے سے پناہ مانگنے کو اختیار فرمایا اور ان کے علاوہ دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد ومسائل

1۔ انسانوں کی طرح جنات میں بھی اچھے اور برے دونوں قسم کے جن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی طاقت بھی عطا فرمائی ہے کہ وہ انسانوں کو اگر نقصان پہنچانا چاہیں تو اللہ کی مشیت سے پہنچا سکتے ہیں۔ بنابریں شرارتی جن بعض دفعہ انسانوں کو تنگ کرتے اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔ اسی طرح نظر کا لگنا بھی برحق ہے، جس کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کو بغض وحسد کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے بداثرات دوسرے شخص تک بھی پہنچ جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ نقصان یا کسی حادثے اور تکلیف سے دوچار ہوجاتا ہے۔ اور بعض دفعہ نظر محبت سے بھی ایسا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنات اور نظر بد دونوں سے اپنے الفاظ میں پناہ مانگا کرتے تھے۔ مثلاً: (أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجَانِّ وَعَيْنِ الْإِنْسَانِ) "میں تیرے ذریعے سے پناہ مانگتا ہوں جنوں سے انسانوں کی نظر سے۔" وغیرہ، جب (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) اور (قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ) نازل ہوئیں تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے الفاظ کے بجائے ان سورتوں کے ذریعے سے پناہ طلب کرنا شروع کردی کیونکہ یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے نازل کی گئی تھیں۔

2۔ ان کو معوذتین بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں، اللہ کے حکم سے، اپنے پڑھنے والوں کو جنات اور نظر بد سے بچاتی ہیں۔ معوذتین کے معنی ہیں، پناہ دینے والی دو سورتیں، اس لیے ان مقاصد کے لیے ان سورتوں کا پڑھنا بہت مفید ہے، ان کے ذریعے سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔

وضو کے نشانات

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"میری امت کے لوگوں کو قیامت والے دن اس حالت میں پکارا جائے گا کہ وضو کے نشانات سے ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اپنی یہ روشنی بڑھانے کی طاقت رکھے تو وہ ضرور ایسا کرے۔"

(یعنی اعضائے وضو کو ان کی مقدار سے زیادہ دھونے کی کوشش کرے تاکہ روشنی میں مزید اضافہ ہو۔) (بخاری ومسلم)

www.pklibrary.com

دستک، دستک

دستک

شاہین رشید

نیلم منیر

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"آج کل تو فلموں میں کام کرکے خوب تعریفیں اور کامیابیاں سمیٹ رہی ہیں آپ؟"

"جی...... بس اللہ کا کرم ہے۔ مگر میں اپنا وہ وقت بھی نہیں بھولی ہوں جب اس فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے میں نے کتنی محنت کی تھی...... اللہ نے مجھے میری محنتوں کا صلہ دیا ہے۔"

"بالکل...... اب تو ہمارے ہندوستان سے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ لیکن اچھے تعلقات میں آپ وہاں کام کرنا چاہیں گی؟"

"مجھے جو بھی عزت پیار اور شہرت ملی اپنے پیارے ملک پاکستان سے ملی ہے...... اس لیے ماضی میں بھی اور آج بھی مجھے کبھی بھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ میں انڈین فلموں میں کام کروں۔ مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر بہت زیادہ فخر ہے۔"

"آپ کے خیال میں ڈرامہ زیادہ دیکھا جاتا ہے یا فلم زیادہ دیکھی جاتی ہے؟"

"اس کو آپ کیلکولیٹ نہیں کرسکتے کہ کیا زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ میرے حساب سے دونوں میڈیم الگ الگ ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ فلم دیکھنے والوں نے کبھی ڈرامہ دیکھا ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

"آپ کس میڈیم کو زیادہ پسند کرتی ہیں؟"

"میں......؟ میں ہر میڈیم کو پسند کرتی ہوں۔ مجھے تھیٹر کرنا بھی پسند ہے۔ ٹی وی ڈرامہ کرنا بھی اور فلم بھی...... سو میں ان تینوں میڈیمز میں کام کر بھی رہی ہوں۔"

"فلم کے معیار سے مطمئن ہیں؟"

"جی، جی بہت چینج آیا ہے اور اب کافی اچھی فلمیں بن رہی ہیں۔ مجھے تو فلم کا فیوچر کافی برائیٹ لگتا ہے...... ایسے ہی تو نہیں سینما ہاؤسز پہ "فل" کا بورڈ لگا ہوا ہوتا ہے...... لوگ آتے ہیں تو "ہاؤس فل" ہوتا ہے۔ پاکستانی فلموں کے اچھے دن شروع ہوچکے ہیں۔"

"آپ کی فلم رانگ نمبر 2 کافی ہٹ گئی۔ کچھ کہیں گی اس بارے میں؟"

"ہاں...... کیوں نہیں، مجھے جب فلم کا اسکرپٹ ملا اور اپنے کردار کے بارے میں علم ہوا تو میں نے بڑی توجہ کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا۔ مجھے اس کردار میں کافی جان نظر آئی۔ اداکاری کا مارجن نظر آیا...... اور مجھے لگا کہ اس فلم میں وہ سب کچھ ہے جو لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ سو میں نے کام کرنے کی ہامی بھرلی اور پھر آپ سب نے دیکھا کہ فلم کتنی کامیاب ہوگئی۔"

"انڈر پروڈکشن کتنی فلمیں ہیں؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی...... وقت آنے پر سب پتا چل جاتا ہے۔ بس یہ ضرور کہوں گی کہ میں اسکرین پر آنے کی خاطر بھی غیر معیاری کردار قبول نہیں کروں گی۔"

"آپ فلمیں دیکھتی ہیں؟"

"بالکل دیکھتی ہوں...... نئی بھی اور پرانی بھی اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ اس طرح پرانے ڈرامے بھی دیکھتی ہوں کہ ان سے سیکھنے کی بہت گنجائش ہوتی ہے اور جب تک ہم دوسروں کی چیزیں دیکھیں گے

www.pklibrary.com

نہیں...... ہمیں سیکھنے کا موقع کیسے ملے گا؟"

"فرصت کے اوقات میں کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟"

"فرصت کے اوقات میں لانگ ڈرائیونگ پر بھی نکل جاتی ہوں۔ کبھی کوئی اچھی سی کتاب ہاتھ لگ جائے تو اسے پڑھتی ہوں۔ نئی اور پرانی فلمیں اور ڈرامے دیکھتی ہوں۔ میوزک سے دل بہلاتی ہوں۔ مطلب بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو فرصت کے اوقات میں انجام دیے جاسکتے ہیں۔"

"نیلم منیر 20 مارچ 1992ء میں پیدا ہوئیں، کراچی میں ہی جنم لیا اور کراچی میں ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ اپنے فنی سفر کا آغاز نادیہ خان کے ایک شو سے کیا۔ پھر ڈراموں کا سفر شروع ہوا تو پہلا ڈرامہ "تھوڑا سا آسمان" تھا اور اس کے بعد سے جو سلسلہ چلا تو آج تک چل رہا ہے اور ان شاء اللہ چلتا رہے گا۔"

یمنیٰ زیدی

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آج کل کہاں ہوتی ہیں؟ پاکستان میں یا پاکستان سے باہر؟"

"آج کل ٹیکساس میں ہوں اور جب بھی مجھے کام کے لیے بلایا جاتا ہے تو پاکستان آجاتی ہوں۔"

"مشکل نہیں ہوتی کیا؟"

"نہیں نہیں...... کیوں مشکل ہوگی۔ مجھے تو ویسے بھی ٹریولنگ کا بہت شوق ہے تو میرا شوق بھی پورا ہوجاتا ہے اور کام بھی ہوجاتا ہے۔"

"گڈ...... پھر سال میں کتنی بار آتی جاتی ہیں؟"

"ہنستے ہوئے...... میں چونکہ پاکستان سے دور رہتی ہوں۔ اس لیے زیادہ پروجیکٹ نہیں پکڑتی...... بس ایک یا دو...... اس سے زیادہ نہیں...... تاکہ میں ٹینشن فری کام بھی کرلوں اور ٹریولنگ کو انجوائے بھی کرلوں...... سو بہت مزے کی زندگی گزر رہی ہے...... اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔"

"گھر والے ناراض نہیں ہوتے کہ مسلسل سفر میں رہتی ہو؟"

"میں گھر والوں کی سپورٹ سے ہی تو آج اس مقام پر ہوں...... اگر وہ اجازت نہ دیتے تو گھر کی چار دیواری میں ہوتی، یا پھر کوئی جاب کر رہی ہوتی......"

www.pklibrary.com

"یہ مجھے بے بس رہی ہوتی؟"

ہنستے ہوئے "بالکل بھی زندگی کی جستجو میں سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ گھر والوں نے سپورٹ کیا تو کیا آپ کو ہی سپورٹ کیا یا دیگر بچوں کو بھی؟"

"دیگر بچوں کو سپورٹ اس لیے نہیں کیا کہ شاید ان میں میری طرح اداکاری کے جراثیم نہیں تھے۔ گھر والوں کو مجھ میں اداکاری کے جراثیم نظر آئے تو سپورٹ کیا۔ امی نے، بابا نے سب نے ہی۔ تو بس آ گئی اس فیلڈ میں اور بہت انجوائے کر رہی ہوں اس فیلڈ کو۔"

"تھیٹر بھی کیا ماڈلنگ بھی..... ڈرامہ بھی اب فلم رہ گئی ہے کب بڑی اسکرین پہ نظر آئیں گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی کیونکہ ابھی تک تو فلم میں کام کرنے کی آفر نہیں آئی اور ویسے بھی فلم میں کوئی عام سا رول نہیں کرنا چاہتی۔ ایسا رول کرنا چاہوں گی جو بہت زمانے تک لوگوں کو یاد رہے۔"

"ہم ایوارڈ کے لیے دو سیریلز میں آپ نامزد ہوئی تھیں ایوارڈ ملنے کی امید ہے؟"

"جب انسان کام کرتا ہے تو اس امید کے ساتھ کرتا ہے کہ اسے ایوارڈ ملے گا۔ لوگ تعریف کریں گے تو امید تو بہت ہے کہ کسی ایک میں ایوارڈ ضرور ملے گا۔ ویسے "ہم ایوارڈ" کے لیے نامزد ہونا بھی میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔"

"2012ء سے فنی سفر شروع کیا۔ اب تک کتنے سیریلز کر چکی ہیں آپ؟"

"سب کے نام یاد رکھنا ذرا مشکل کام ہے۔ پہلے سیریل کا نام "خوشی ایک روگ" تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ پہلے ہی سیریل میں پذیرائی ملی۔ پھر "میری دلاری"۔ "یہ دل کیا کرے"۔ "رشتے کچھ ادھورے سے" اور کافی ہیں جو یاد نہیں آ رہے۔"

"اگرچہ کام کے سلسلے میں پاکستان آنا جانا لگا رہتا ہے مگر جب امریکہ میں اکیلی ہوتی ہو مطلب فارغ ہوتی ہو تو کیا مشاغل ہوتے ہیں؟"

"فارغ بیٹھنا تو مجھے پسند ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں وہاں کے ریڈیو پہ پارٹ ٹائم جاب کرتی ہوں..... اور وقت اچھا گزر جاتا ہے۔"

☆

ماہنامہ کرن

اکتوبر 2019 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

مزے دار، سپر اور دلچسپ مضامین کے ساتھ

کرن کتاب

- اداکار "سمیع خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار "فیضان شیخ" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- آوازکی دنیا سے "احمد شیخ" اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ "حفصہ اسلم نیازی" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول،
- "شب ہجر کی سحر" رخ چوہدری کا سلسلے وار ناول،
- "ساگر کنارے" ام طیفور کا مکمل ناول،
- "ہم چلا" عطیہ خالد کا مکمل ناول،
- "شام رنگ سیاہ" انیلا رضا کا ناولٹ،
- "سمجھو ریں اگی" منعم ملک کا ناولٹ،
- "دادا، پوتی اور وہ" ام ایمان قاضی کا ناولٹ،
- عمارہ خان، عندلیب زہرا، نادر فاطمہ اور ماجرہ احمد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

بندھن

نبیلہ ابر راجہ ہمراہ کاشف محمود

شاہین رشید

آفسانہ نگار، ناول نگار اور ڈرامہ نگار، نبیلہ ابر راجہ، اس بار ہمارے مقبول سلسلے "بندھن" کی مہمان ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں نبیلہ؟"

"الحمدللہ......!"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"ہمارا تعلق کیانی برادری سے ہے۔ جنہیں "گکھڑ" بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق ایران سے ہے۔ جہاں سے وہ ہجرت کر کے راولپنڈی آئے۔ میں بھی راولپنڈی میں پیدا ہوئی اور وہیں میری پرورش ہوئی، ابوز مین دار ہیں اور امی گھریلو خاتون۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بہنیں اور پانچ بھائی۔ میرا نمبر چوتھا ہے۔ تعلیمی قابلیت ایم ایس سی ماس کمیونیکیشن۔"

"شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا اور بچے کتنے ہیں؟"

"میری پہلی شادی میرے خاندان میں ہوئی تھی۔ ابا کے کزن کے بیٹے تھے بیرون ملک میں جاب کرتے تھے۔ 2000ء میں ہماری شادی ہوئی اور 2001ء میں ڈیڑھ سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت میری چار ماہ کی بیٹی تھی۔ میرے شوہر مسرور بھی کراچی میں تھے کہ ایک دن اچانک ان کو برین ہیمرج ہوا دس دن وہ اسپتال میں رہے

www.pklibrary.com

اللہ کو پیارے ہو گئے...... اس وقت میں بہت کم عمر تھی۔ بہت ساری باتوں کا پتا ہی نہیں تھا۔ عقل کم تھی سمجھ کم تھی۔ اتنا شعور نہیں تھا...... شاید اسی لیے سنبھلنے میں بہت ٹائم لگ گیا...... تین چار سال مجھے سنبھلنے میں لگ گئے...... اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندے کو ایک حد سے زیادہ نہیں آزماتا اور نہ ہی اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالتا ہے...... اللہ نے آہستہ آہستہ ہمت اور حوصلہ بھی دے دیا اور آہستہ آہستہ یہ زخم بھی بھر گیا۔

جب میری شادی ہوئی تھی تو اس وقت میں نے صرف میٹرک کیا تھا۔ مجھے بچپن سے ہی بہت شوق تھا تعلیم حاصل کرنے کا اور اعلا تعلیم حاصل کرنا میرا خواب تھا۔ مگر شادی ہو گئی۔ اس وقت مجھے اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کا بہت افسوس تھا...... شادی ختم ہوئی اور جب بیٹی ساڑھے تین سال کی ہوئی تو میں نے اسے نرسری میں داخل کرایا اور خود بھی فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا چاہتی تھی اور اپنی زندگی کو بامقصد کرنا چاہتی تھی اس سب میں میرے ابا نے مجھے بہت زیادہ موٹی ویٹ کیا اور ان کی بھی خواہش تھی کہ میں پڑھوں اور کسی قابل بن جاؤں۔ تو میرے ابا نے میرا بہت ساتھ دیا۔"

"تعلیم مکمل کرنے کے بعد کہیں جاب کی؟"

"نہیں ...... تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے کہیں جاب نہیں کی ...... میرا میکہ اور سسرال دونوں ماشاءاللہ سے بہت خوش حال تھے تو مجھے روپے پیسے کی کمی کبھی نہیں ہوئی ...... میرے ہی کی شادی ...... میں کوئی لڑکی جاب نہیں کرتی تھی تو مجھے بھی خیال نہیں آیا اور لکھنے کی صلاحیت تو قدرتی تھی تو اپنی تسکین کے لیے اور اپنے شوق کے لیے لکھتی تھی۔ اور بس ......"

"اور پھر دوسری شادی...... ؟ کتنے سال بعد ہوئی؟ اور ان کا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟"

"میرے شوہر (دوسرے) کا نام "کاشف محمود" ہے۔ وہ 8 ستمبر 1980ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ میرے چار دیور اور ایک نند ہیں، نند شادی کے بعد سعودی عرب چلی گئیں اور میرے دیوروں کی بھی شادیاں ہو چکی ہیں اور ماشاءاللہ سب اپنی لائف میں بہت خوش ہیں۔ میرے سسرال میں سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ میرے ساس سسر مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں...... سسرال کا تعلق انڈیا کے شہر جالندھر سے ہے اور یہ ہجرت کرکے پاکستان آکر آباد ہوئے ...... میاں صاحب نے بی کام کی ڈگری لی ہوئی ہے۔ چھوٹی عمر سے ہی پریکٹیکل لائف میں آ گئے تھے، ڈاکٹر بننا چاہتے تھے مگر چونکہ گھر کے بڑے بیٹے ہیں تو ذمہ داریوں کا بوجھ ان پر زیادہ تھا...... اب ان کا اپنا بزنس ہے اور ماشاءاللہ بہت اچھا چل رہا ہے......

دوسری شادی کے لیے ظاہر ہے کہ گھر والوں نے ہی فورس کیا اور 2013ء میں میری دوسری شادی ہوئی۔"

"آپ کی دوسری شادی...... میاں صاحب کی پہلی...... دھوم دھام سے ہوئی؟"

"شادی سادگی سے ہوئی، کراچی سے بارات

گئی تھی جس میں چالیس سے پینتالیس لوگ تھے جو کہ کاشف کے خاندان کے ہی تھے اور دوسری طرف ہماری فیملی میں چچا، تایا اور خالائیں اور پھوپھیاں شامل تھے۔ سادگی سے نکاح ہوا، رسمیں وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوئی تھیں۔ کیونکہ نہ ہماری فیملی میں اور نہ ہی کاشف کی فیملی میں ان کا رواج ہے۔ ہمارے یہاں سنت کے طریقے سے نکاح ہوتا ہے اور پھر ولیمہ ہوتا ہے۔ ڈھولک، مایوں، مہندی یہ سب کچھ دونوں خاندانوں میں نہیں ہوتا...... رخصت ہو کے جب میں کراچی آئی تو کراچی میں ولیمہ ہوا تھا۔"

"کاشف صاحب سے کوئی ملاقات تھی آپ کی؟"

"نہیں ہم ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہوا تھا...... سوشل میڈیا میں ایک گروپ ''جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت آفیشل'' کے نام سے تھا...... اس میں کاشف اور ان کی خالہ بھی ایڈ تھے۔ کاشف زبیر جو جاسوسی ڈائجسٹ میں لکھتے تھے وہ ان کے ''خالو'' تھے، وہ بھی ایڈ تھے۔ اس گروپ میں میرے کافی فرینڈز تھے، سب پوسٹ کرتے تھے میں بھی کرتی تھی......

میں نے ایک پوسٹ لگائی تھی جس کے نیچے کاشف نے بڑا طنزیہ سا جواب دیا تھا...... تو مجھے بڑا غصہ آیا تھا کہ یہ بندہ ہوتا کون ہے مجھے اس طرح کا جواب دینے والا...... یہ بات ہے 2011ء کی، اس کے بعد سے ہماری بات چیت شروع ہوئی، میسیجز کے ذریعے بات ہوتی تھی، نہ یہ مجھے ٹھیک طرح سے جانتے تھے اور نہ ہی میں انہیں جانتی تھی۔ سوائے اس کہ کاشف زبیر ان کے خالو ہیں اور مریم کاشف ان کی خالہ ہیں اور ان کا تعلق کراچی سے ہے۔

ابھی بات چیت کو ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ انہوں نے مجھے ''پروپوز'' کر دیا تو میں نے ان کو کہا کہ میں شادی شدہ ہوں، بیوہ ہوں اور میری ایک بیٹی بھی ہے اور نہ آپ نے مجھے دیکھا ہے نہ میں نے آپ کو دیکھا ہے اور نہ ہی آپ میرے خاندان کو جانتے ہیں۔ آپ نے کیسے مجھے پروپوز کر دیا۔ تو کہنے لگے کہ آپ کی بات چیت کا انداز، آپ کی تحریر اور آپ کے الفاظ مجھے اچھے لگتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ آپ ہی وہ لڑکی ہیں جو میرا صحیح انتخاب ہیں۔ بس پھر اس کے بعد کی کہانی بہت لمبی ہے، پھر کبھی سناؤں گی...... اور پھر 2013ء میں میری کاشف کے ساتھ شادی ہو گئی۔"

"اس کے بعد مشکلات پیش آئیں! بیٹی آپ کی خوش ہے؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کوئی مشکلات پیش نہیں آئیں۔ میری بیٹی بہت خوش ہے۔ ہماری شادی کے دس ــــ دن کے بعد کاشف خود پنڈی گئے اور میری بیٹی کو لے کر آ گئے اور کاشف کا پیار دیکھ کر میری بیٹی نے کہا کہ ''ماما آپ نے پہلے کیوں نہیں شادی کی...... اللہ کا شکر ہے کہ ہماری بیٹی ہمارے ساتھ ہے اور کاشف نے کبھی بھی چھوٹی منال میں اور ''ایمان'' میں فرق نہیں رکھا اور سگے باپ سے بڑھ کر اسے محبت دیتے ہیں۔ پیار محبت اور شفقت دیتے ہیں۔ ایمان بھی کاشف کو ''بابا'' کہتی ہے...... پتا نہیں میں نے کون سی نیکی کی تھی کہ اللہ نے مجھ پر اپنا خصوصی کرم کیا ہے کہ کاشف جیسے اچھے انسان سے میرا جوڑ بنایا۔ میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔"

"میکے اور سسرال میں کوئی فرق پایا۔ ماحول میں اور دیگر چیزوں میں؟"

"کوئی فرق نہیں، ہم یعنی میکہ بھی بہت مذہبی ہے اور سسرال بھی۔ مجھے ایڈجسٹ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی...... یہ لوگ بھی پنجابی ہیں اور ہم بھی پنجابی ہیں۔ کھانے بھی تقریباً ایک جیسے ہیں اور مجھے سسرال میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی کھانے پکانے میں۔ کھانا میری ساس ہی پکایا کرتی تھیں مگر انہوں نے مجھے بھی فری چھوڑ دیا ہوا تھا۔"

www.pklibrary.com

"جوائنٹ فیملی میں آئیں؟"

"جی میں جوائنٹ فیملی میں آئی، کاشف گھر میں بڑے ہیں مگر ان سے پہلے ان کے چھوٹے بھائی کی شادی ہو چکی تھی تقریباً آٹھ سال پہلے اور ان کے تین بچے بھی تھے اور جب میں آئی تو مجھے بہت پیار محبت ملی۔ بہت عزت ملی۔ ساس سسر بہت بے ضرر اور شریف النفس انسان ہیں اور مجھے اور میری دیورانی کو کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ میں سسرال میں ڈیڑھ سال رہی اور پھر سعودی عرب آ گئی اور اب میں کچھ عرصے سے مستقل پاکستان آ گئی ہوں اور کراچی میں رہائش پذیر ہوں اور میرے میاں صاحب نے کراچی میں ہی اپنا بزنس شروع کر دیا ہے۔"

"میاں صاحب مزاج کے کیسے ہیں؟ گھر کا بجٹ کون بناتا ہے؟"

"میرے میاں معتدل مزاج کے ہیں۔ انہیں غصہ بالکل نہیں آتا، نرم مزاج، درگزر کرنے والے، جبکہ میں غصے کی بہت تیز اور جذباتی قسم کی خاتون ہوں۔ مجھے غصہ آتا ہے تو میں اونچا اونچا بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی ہوں...... اور میرے غصے کو دیکھ کر بھی ان کو غصہ نہیں آتا اور وہ خاموش ہو جاتے ہیں...... ان کی ایک بری عادت بھی ہے کہ بہت کم گو ہیں۔ میں لمبی لمبی باتیں کرتی ہوں اور ان کی طرف سے "ہوں۔ ہاں" کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا...... تب مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ گھر کا بجٹ ہم دونوں مل کر ہی بناتے ہیں۔"

"پاکستان آ کر جوائنٹ فیملی میں رہ رہی ہیں یا علیحدہ؟"

"میں جب سے پاکستان آئی ہوں علیحدہ گھر میں رہتی ہوں، اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ اور گھر کا سارا نظام میں نے ہی سنبھالا ہوا ہے...... ہماری امی کے گھر میں شروع سے ہی بیٹیوں اور بہوؤں پہ گھر کو چلانے کی ذمہ داریاں ڈال دی

جاتی ہیں تو یہ سب کچھ دیکھ کر میں بڑی ہوئی تو مجھے گھر سنبھالنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔"

"کیا کاشف خوش خوراک ہیں؟ اور کیا آپ خود ان کے لیے کھانا پکاتی ہیں؟"

"جی...... ہاں میاں صاحب خوش خوراک ہیں، انہیں مرغن، چٹ پٹے، تازہ اور صاف ستھرے کھانے پسند ہیں اور چونکہ مجھے ان کی پسند کا علم ہے تو میں ان کے کہے بغیر ان کی پسند کے کھانے بنا دیتی ہوں، کبھی فرمائش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ شادی سے پہلے مجھے کھانا پکانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی...... میں باقی سارے کام کر لیتی تھی مگر کھانا بنانا مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی مجھے کھانا کھانے کا کوئی خاص شوق تھا...... لیکن جب میں کراچی آئی تو میاں کی محبت میں کھانا پکانا شروع کیا۔ کیونکہ جن سے آپ وابستہ ہو جاتے ہیں ان کی پسند نا پسند بہت عزیز ہو جاتی ہے...... تو بس اب کاشف کی محبت میں سب کام کر لی ہوں۔"

"کہتے ہیں کہ گھر بنانے کے لیے عورت کو بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ آپ نے قربانیاں دیں؟"

www.pklibrary.com

”اللہ کا شکر ہے کہ میں نے کوئی خاص قسم کی قربانیاں نہیں دیں۔ شکر ہے کہ مجھے سب کچھ اچھا ہی ملا اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے حصے کے بہت سے دکھوں سے گزر کر بہت کچھ سہہ چکی تھی، اس لیے مجھے دوسری شادی کے بعد کچھ نہیں سہنا پڑا۔“

”آپ کی تحریریں آپ کے سسرال والوں کو پسند آتی ہیں؟“

”میرے سسرال میں میری تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے...... میاں صاحب نے میری ایک آدھ تحریر ہی پڑھی ہوگی کہ ان کے پاس ٹائم نہیں ہے...... میری بڑی بیٹی ”ایمان“ میں لکھنے کے جراثیم ہیں اور اسکول و کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہی ہے۔ مضامین لکھتی ہے اور تحریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔“

”فضول خرچ ہیں؟ گھر کو سجانے کا اور صاف ستھرا رکھنے کا شوق ہے؟“

”میں بہت فضول خرچ ہوں اور میرے ہاتھ میں پیسہ بالکل بھی نہیں ٹکتا، شاپنگ کا بہت شوق ہے۔ اچھے کپڑے جوتے اور بیگز کا بہت شوق ہے...... پیسہ نہیں بچا سکتی...... گھر کو سجانے سنوارنے اور صاف ستھرا رکھنے کا مجھے بہت شوق ہے۔ میں گھر کے سارے کام خود کرتی ہوں۔ ہر چیز ترتیب کے ساتھ اپنی جگہ پڑی ہوئی ہو اس کا مجھے بہت خیال رہتا ہے...... اور اس معاملے میں کافی سخت بھی ہوں۔“

”میاں بیوی کا رشتہ نازک بھی بہت ہے اور مضبوط بھی، گھر ٹوٹنے کی کیا وجہ ہوتی ہے؟ خود میاں بیوی یا کوئی تیسرا ہاتھ؟“

”میرا خیال ہے کہ جب گھر ٹوٹتے ہیں اور علیحدگی ہو جاتی ہے اس میں قصور لڑکے اور لڑکی دونوں کا ہوتا ہے۔ کہیں پہ لڑکی کی زیادتی ہوتی ہے تو کہیں پہ لڑکے کی...... لیکن آج کل کے حساب سے دیکھا جائے تو لڑکیوں میں برداشت کم ہوتی ہے اور گھر کے لیے قربانی دینے کا جذبہ اور اپنا من مارنے کا جذبہ کم ہوتا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ جس گھر میں ہم بیاہ کر جائیں وہاں سب کچھ پکا پکایا فوراً ہر چیز ملے۔ مجھے کچھ نہ کرنا پڑے۔ نہ روک ٹوک ہو اور نہ کوئی پابندی...... پھر نمود و نمائش کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے...... ایک تقریب میں جو جوڑا پہنا ہے وہ کسی دوسری تقریب میں نہیں پہننا...... اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا اور میاں کی آمدنی کا بے دریغ استعمال کرنا بھی جھگڑے کا باعث بنتا ہے...... اور اس میں بھی حقیقت ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ بگاڑنے میں تیسرا ہاتھ بھی ہوتا ہے اور یہ تیسرا ہاتھ نند کا بھی ہو سکتا ہے۔ دیور کا بھی ہو سکتا ہے اور کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ سسرال سے بھی اور میکے سے بھی۔ اس لیے میاں بیوی کو اپنی لڑائی اپنے تک ہی محدود رکھنی چاہیے۔ تاکہ کسی تیسرے فریق کو دخل اندازی کی جرات ہی نہ ہو۔

جب میاں بیوی کا جھگڑا تیسرے تک جاتا ہے تو اصل خرابی وہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔“

”لڑائیاں ہوتی ہیں آپ دونوں میں؟ روزمرہ کی روٹین کیا ہے؟“

”لڑائیاں؟ کاشف تو لڑائی کرتے ہی نہیں ہیں۔ مجھے تو حسرت ہی رہی ہے کہ کبھی یہ بندہ بھی مجھ پر غصہ کرکے چیخے چلائے۔ ناراض ہو۔ میں ہی ناراض ہوتی ہوں اور منانے میں بھی یہی پہل کرتے ہیں اور روزمرہ روٹین کچھ یوں ہے کہ صبح چھ بجے اٹھتی ہوں۔ فجر کی نماز اکثر قضا ہو جاتی ہے۔ صبح میری بیٹی نے کالج جانا ہوتا ہے تو اس کے لیے اٹھتی ہوں۔ وہ ناشتہ نہیں کرتی اور جب وہ چلی جاتی ہے تو پھر میں اپنے لیے اور کاشف کے لیے ناشتہ بناتی ہوں۔ ہم مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے آفس چلے جاتے ہیں اور میں گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ جس میں کھانا پکانا بھی شامل ہوتا ہے اور چھوٹی بیٹی کی دیکھ بھال بھی...... بس اس طرح سارا دن گزر جاتا ہے۔ میری تحریروں کے لیے میرے میاں صاحب بھی اور میری بیٹی اور سسرال والے میکے

www.pklibrary.com

والے سب حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

"گویا کاشف آپ کے آئیڈیل ہیں؟"

"جی...... الحمدللہ...... الحمدللہ...... میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے بلکہ میں تو کبھی بھی شکر ادا کر ہی نہ پاؤں کہ اس نے کاشف کی صورت میں ایک نعمت بخشی ہے...... انتہائی محبت کرنے والے اور عزت دینے والے انسان ہیں اور ان کا رویہ میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے جیسے میں بہت ہی کوئی نازک سی چیز ہوں۔ وہ میرے مزاج کو سمجھ چکے ہیں اور اسی انداز میں مجھے ٹریٹ کرتے ہیں...... مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ میرا باپ بھی ہے، میری ماں بھی ہے، میرا دوست بھی ہے میری بہن بھی ہے...... اس بندے میں، میں نے سارے رشتے دیکھے ہیں...... اللہ کا مجھ پر خاص کرم ہے۔ کوئی خصوصی توجہ ہے یا میری کوئی ایسی نیکی ہے کہ جس کے اجر میں مجھے کاشف ملے ہیں۔ میرے لیے اللہ کا انعام ہیں۔ پتا نہیں کس کی دعا مجھے لگی ہے۔ میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں، اللہ میرے گھر کو میرے بچوں کو میرے شوہر کو اور میری پرسکون زندگی کو سلامت رکھے۔ (آمین) اور نظر بد سے بچائے...... اپنے گزرے دور کو یاد بھی نہیں کرنا چاہتی کہ اس دور میں بڑے دکھ اور بڑی تکلیفیں میں نے دیکھیں...... میرا وجود ریزہ ریزہ تھا جس کو کاشف نے سمیٹ کر گلے لگایا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے مجھے نئی زندگی ملی ہو۔ میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں کہ میں اللہ کا شکر ادا کروں اور کاشف کی تعریف کروں۔"

"اور اب شادی شدہ اور جن کی شادیاں نہیں ہوئیں ان کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

"جن کی شادی ہو چکی ہے ان کے لیے یہ پیغام دوں گی کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو درگزر کرنا سیکھیں، اچھی اور خوش گوار زندگی کے لیے اور جن کی شادیاں نہیں ہوئیں ان سے یہی کہوں گی کہ شادی کے بعد مسئلے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے شادی کوئی جادو کی چابی نہیں ہے کہ جس سے آپ اپنی مرضی کا ہر دروازہ کھول سکتے ہیں۔ شادی شدہ لائف میں دکھ سکھ سب کچھ ہو سکتا ہے...... ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شکریہ کے ساتھ نبیلہ ابر راجہ سے اجازت چاہی۔

☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

مسز س۔ ص

میں پچھلے سترہ سال سے آپ کے ادارے کے ساتھ منسلک ہوں بطور قاری۔ یہ کہنے کی تو ضرورت بھی نہیں کہ آپ لوگوں کا معاشرے میں کیا رول ہے اور آپ لوگ کتنی ہی ماں، بہن اور بیٹیوں کو زندگی گزارنے اور جینے کی امید دیتے ہیں۔ تین سال کا بچہ بھی ہے۔ ماشاء اللہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہوں۔ ماں باپ کی لاڈلی بیٹی ہوں تو دوسری طرف سسرال والوں کی سمجھدار بہو، بھابھی اور بچوں کی دل پسند امی بھی ہوں الحمدللہ۔

ساری زندگی سجدے میں گزار دوں تو بھی اللہ کا شکر ادا نہ کر پاؤں۔ جس نے اتنی عزت دی اتنا پیار دیا اور اس سارے قصے میں میرے ماں باپ کی تربیت کے ساتھ ساتھ آپ سب کی تربیت بھی شامل ہے۔

بلاشبہ آپ اور آپ کی بلکہ ہم سب کی ہی —— ہیں جو ہم جیسی گھر بیٹھی لڑکیوں کے دلوں میں اور ذہنوں میں امید کی کرن بن کر آتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہترین اجر دے، آمین۔

اب آتی ہوں اس سلسلے کی طرف جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سلسلے میں شرکت کروں وہ سلسلہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کا ہے۔

عمر 28 سال ہے جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے تو دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس میں کچھ لکھوں۔ امید کرتی ہوں کہ میری باتوں کو سمجھا جائے گا۔ اگر کسی کی انجانے میں دل آزاری کر دوں تو معافی چاہتی ہوں۔

س: "شادی کب ہوئی؟"

ج: "زندگی بدلنے کا یہ خوب صورت دن 31 مارچ 2012ء کا ہے۔"

س: "شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں؟"

ج: "گھر صاف رکھنا، مزے مزے کے کھانے بنانا۔ لوگوں کو بلانا، ان کے گھر جانا۔ ملنا ملانا۔ کافی سوشل ہوں چونکہ اپنے گھر میں بڑی بیٹی اور سسرال میں پہلی بہو ہوں۔ اس لیے یہ مشاغل برقرار ہیں۔

وہی ملنا ملانا۔ آنا جانا گھر پہ توجہ اور میرا ساتھ دیتی ہیں ان سب میں، میری ساس مسز خالدہ، جو کہ میری ساس ہی نہیں ماں بھی ہیں۔ دوست بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت دے آج کل وہ کچھ علیل ہیں دل کے عارضے کو لے کر۔"

س: "اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا گھر والوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟"

ج: "اس رشتے میں میری بھی مرضی شامل تھی اور گھر والوں کی مرضی بھی شامل تھی۔ اللہ کا بہت کرم ہے مجھ پر۔ کوئی رتی برابر پریشانی نہیں آئی الحمدللہ۔"

س: "ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور؟"

ج: "تصور بس یہ تھا کہ دل کو تو اچھا لگتا ہی تھا لیکن اگر نظر کو بھی اچھا لگ جائے تو کیا ہی کہنے۔ مطلب خوش شکل ساتھی کی خواہش تھی۔ اور ساتھ میں یہ کہ بندہ بندوں کی طرح چال چلن سے زندگی گزار دے تو یہ بندی شکر گزار رہے گی ساری زندگی کا نفیڈنٹ، بولڈ، با ادب، باتمیز اور بھی ہوئی طبیعت کا حامل بندہ اللہ تعالیٰ نے میری زندگی میں شامل کر دیا۔ اللہ کا خاص کرم ہے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر بھی کہ ایسا داماد ملا ہے، جس کو دعاؤں میں مانگنا چاہیے، جس کے لیے وظیفے کرنے چاہئیں جس کے لیے دل چاہے کہ ایسا بندہ آرڈر پر بنایا جائے۔

www.pklibrary.com

الحمدللہ۔"

س "منگنی کتنا عرصہ رہی، شادی سے پہلے کوئی فون؟"

ج "منگنی نہیں ہوئی۔ ڈائریکٹ شادی ہوئی۔ بس بات پکی ہوئی۔ کوئی سال پہلے اور چھ ماہ پہلے شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی۔ 31 مارچ 2012ء کو رخصتی اور ایک دن پہلے جمعہ کو نکاح 30 مارچ کو۔

فون وغیرہ کوئی نہیں ہوا لیکن نمبر ایک دوسرے کے پاس تھے۔ ڈیٹ فکس ہونے کے بعد ایک میسج آتا تھا کہ کتنے دن رہ گئے اور میرا جواب ایک اسمائلی ہوتا تھا۔ بہت خوب صورت دن تھے وہ۔ الحمدللہ آج بھی ہیں۔ ملاقات نہیں ہوئی کبھی۔"

س "شادی سے پہلے آپ کے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟ وہ ان خیالات پر پورا اترے؟"

ج "جی بالکل پورا اترے۔ میری سسرال میں ساس سسر کے علاوہ تین شادی شدہ نندیں اور ایک غیر شادی شدہ جیٹھ شامل ہیں۔ یہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے ہیں۔ اس لاڈلے بیٹے کی لاڈلی بیوی بننا تو آسان تھا اور ہے بھی لیکن لاڈلی بہو، بھابھی اور مامی بننا بے حد مشکل تھا مگر ناممکن نہیں۔ میں نے تو نہیں کہا نند تو خود کو کہلوایا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ زبان بند، کان اور آنکھیں کھلی رکھ کر سسرال میں نبھایا ہے۔"

س "شادی کے لیے آپ کو تعلیم کی قربانی دینی پڑی؟"

ج "نہیں جی میں گریجویشن کر کے گئی تھی۔ مونٹیسوری کورس کیا۔ ایک مشہور نجی اسکول میں پڑھایا بھی۔ ہاں مزید پڑھنے کی خواہش ہے۔"

س "شادی کی رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟"

ج "جی نہیں سب کچھ خیریت سے طے پایا گیا تھا۔ الحمدللہ۔"

س "شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟"

ج "سوال پوچھا۔ پانی پینا ہے؟ قہقہہ...... سخت پیاس لگ رہی تھی میری شکل سے پتا چل گیا ہوگا۔"

س "شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟"

ج "ظاہری بات ہے تبدیلیاں تو آتی ہیں۔ پوری زندگی الگ ماحول، الگ گھر، الگ مزاج کے لوگوں میں گزارنی پڑتی ہے۔ میں ان لوگوں میں ان ہی کی طرح مکس ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے کچھ مہینے خاموش رہ کر سب نوٹ کیا کہ کب، کیا، کیسے، کہاں اور کیوں؟ اس کے بعد میں ان میں اپنے آپ کو ڈھالتی گئی لیکن دل مار کر نہ خود کو تکلیف دے کر۔ اس ساری تبدیلیوں میں میرے ابو کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مجھے کوئی بھی مسئلہ آیا تو میں نے اپنے میکے فون کر کے یا جا کر ڈھنڈورا نہیں پیٹا بلکہ چپکے سے خاموشی سے جا کر ابو سے مشاورت کر لی۔ کچھ سمجھ لیا اور بہت کچھ اللہ پر چھوڑ دیا۔ اور نتیجہ بھی دیکھ لیا۔ پہلے صبر کا اور پھر شکر کا الحمدللہ۔ ایک مزے کی بات بتاؤں؟ میرے بہت سے مسئلے میری امی کو بھی نہیں پتا۔ میرے ابو کو پتا ہیں۔"

س "سسرال اور میکے کے ماحول میں فرق؟"

ج "ایک لڑکی اگر بیاہ کر اپنی خالہ، پھپھی کے گھر بھی جاتی ہے تو اسے ایک الگ ماحول ملتا ہے۔ میں تو پھر غیروں میں بیاہ کر گئی تھی۔ ان کے ہاں رسموں رواجوں کا بہت زیادہ چلن ہے۔ یہ لوگ پنجابی ہیں۔ میں اردو سپیکنگ۔ مجھے پنجابی بولنی نہیں آتی لیکن سمجھ لیتی ہوں۔ یہاں بیٹیوں کو بہت سر چڑھایا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو لے کر بیٹیاں فوراً اپنے میکے فون کھڑکا دیتی ہیں یا گھر آ کر دیر دیر تک ڈسکشن ماں باپ سے چلتی رہتی ہے اور بھائیوں پہ زور دیا جاتا ہے کہ حل کرو۔ بھلا بندے بھی مسئلے حل کرتے ہیں؟ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ سے

www.paklibrary.com

مانگو ہر شے۔ ہر حل۔ میں ان کو سمجھاتی نہیں کیوں کہ ہر کوئی عقل سے بھرا ہوا دماغ لے کر اکڑے قدموں سے زمین پر چلنے کا عادی ہے۔ بات بس ایک ہی ہے ایک چپ سو سکھ۔ الحمدللہ۔"

س "سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی؟"

ج "ان سب کی تنقید کرنے سے پہلے ہی میں نے تنقید شروع کر دی۔ یہ لوگ کھانے کے ساتھ سلاد نہیں کھاتے اور میں سلاد کے ساتھ کھانا کھاتی ہوں۔ اب میری ساس باقاعدگی سے سلاد کی چیزیں منگواتی ہیں اور نوکری میرے آگے رکھ دیتی ہیں کہ لو بیٹا اپنی پسند کا سلاد بنالو۔ کیونکہ شادی کے تیسرے دن دوپہر کا کھانا گھر کھایا تو دنیا کی ہر نعمت دسترخوان پہ موجود تھی، روٹی، سالن، چاول، دہی، کولڈ ڈرنک۔

میں نے آرام سے سب دیکھا اور کچن میں جا کر ایک چھوٹی پیاز، ٹماٹر اور لیموں کا سلاد بنا لیا اور لے آئی۔ سکون سے کھانا ختم کیا۔ یہ لوگ سب چپ شرمندہ لیکن میں نے کچھ نہیں جتایا۔ بلکہ اپنی ساس کو بعد میں آرام سے کہہ دیا کہ امی معذرت کے ساتھ میں سلاد کے بنا کھانا نہیں کھا سکتی لیکن اگر آپ کہتی ہیں تو آئندہ آپ سے پوچھے بنا ایسا نہیں کروں گی۔

لیکن وہی اللہ کا کرم مجھ پر، میری ساس نے پیار کیا اور کہا آج سے یہ ہر چیز آپ کی اور آپ ہماری چوتھی بیٹی۔ الحمدللہ۔"

س "شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟"

ج "شادی کی اگلی صبح میرے بیڈ روم میں کارپٹ ہے تو اس پر رات سے گلاب کے پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ صبح نو بجے میں اور میرے شوہر اٹھے ہوئے تھے سب سوئے ہوئے تھے۔

میں نے اپنے شوہر سے جھاڑو منگوا کر پورا کمرہ صاف کیا کہ پھولوں کے نشان کارپٹ پر پڑ جاتے تھے آمدورفت کے ساتھ ساتھ۔ میری ساس نے یہ سب دیکھا۔ وہ جاگی ہوئی تھیں۔ میرے شوہر نے کہا کہ میں امی کو جھاڑو دینے کا کہہ دیتا ہوں۔ تم رہنے دو۔

میں نے کہا کہ مجھے بھی آتی ہے اگر میں صحیح سے نہ دے سکوں تو آپ ان کو بلوا کر چیک کرلینا۔ کوئی غلطی ہو تو وہ بتا دیں گی مجھے۔

اور جب کمرہ صاف ہوا میری نندیں مجھ سے ملنے آئیں تو میں صاف ستھرے کپڑے میں نہا دھو کر تیار فریش سی بیٹھی سب کا انتظار کر رہی تھی۔ سب حیران کہ کمرہ کس نے صاف کیا اور میں اپنے دل میں شکر ادا کر رہی تھی۔"

س "کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے ذائقے اور انداز مختلف تھے؟"

ج "زمین آسمان کا فرق تھا اور ابھی بھی ہے افسوس۔ میرے گھر میں کھانا بہت شوق، لگن سے بنایا جاتا ہے۔ کھانے کے ساتھ اس کے سارے لوازمات بھی موجود ہوں۔ کون سے ٹائپ کا گوشت کس سالن میں پڑتا ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے۔ یہاں سبزیوں کو گھوٹ کر پیسٹ کی صورت میں پکایا جاتا ہے میرے میکے میں ہر سبزی الگ رنگ، رونق، خوشبو، ذائقہ ہر چیز ہونی چاہیے۔ ان کے ہاں کوفتے، شامی کباب، کٹلس وغیرہ کچھ نہیں بنتا۔ میں نے آکر یہ سب بنایا الحمدللہ سب نے پسند کیا۔ واضح فرق تھا ان لوگوں کے پکائے کھانے میں اور میرے پکائے ہوئے کھانے میں اور ورائٹی بھی میں نے ان سب کو متعارف کروائی۔ ناشتے میں ورائٹی، کھانوں میں ورائٹی۔ میری ساس نے اپنے بچوں کو ہر چیز کھانے کی عادت نہیں ڈالی۔ یہ نہیں کھانا، وہ نہیں کھانا دو، چار مخصوص چیزیں بن کر روز روز آنے لگیں تو میرا تو دل اوب سا گیا کہ یہ سب کیا ہے۔ بہرحال حلیم، نہاری، پائے کے ساتھ ساتھ شام کی چائے کے ساتھ وہ وہ قسم کی ورائٹی ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائی کہ یہ لوگ اب بھی حیران ہوتے ہیں۔

اصل میں ہم لوگ دلی والوں میں سے ہیں جن کا کچھ مشہور ہو نہ ہو ہاتھ کا ذائقہ بہت مشہور ہوتا ہے۔

www.pklibrary.com

الحمد للہ۔"

س: "سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو کہ آپ کا حق تھا؟"

ج: "سچ کہوں تو بالکل دیا۔ جہاں نہیں دیا وہاں آگے ہو کر عزت سے میں نے لے لیا۔ میں نے چھوٹی چھوٹی باتوں اور مسئلوں کو چھوٹا ہی رہنے دیا۔ بڑا نہیں ہونے دیا۔ اور ایک ضروری چیز جو میں نے کی کہ امیدیں وابستہ نہیں کیں کسی سے بھی اپنے شوہر سمیت۔ اللہ سے امید لگائی اور اللہ بھلا کہاں ناامید کرتا ہے۔ بس ایک قدم ہمارے آگے بڑھانے کا منتظر ہوتا ہے۔

بہت پریشانیاں آئی تھیں لیکن اللہ کی مدد سے گزر بھی گئیں اور بڑی شان سے گزر گئیں۔ میرا کوئی نقصان کیے بنا۔

جہاں میری عقل ناقص اور ہمت ساتھ چھوڑ دیتی تھی اور آج بھی ہے میں نے فوراً مصلیٰ بچھا لیا کہ بس اب جس کے آگے مسئلے رکھے وہی سمیٹے گا اور سمیٹے ہیں۔ الحمد للہ۔"

س: "بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی؟"

ج: "میرے بیٹے کی پیدائش میرے لیے نہایت خوش گوار پل تھا۔ شوہر اور میکے والوں کی سپورٹ تو تھی ہی لیکن سسرال والوں نے خوب ساتھ دیا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد میری سب سے بڑی نند میرے پاس آ کر رہی تھیں۔ انہوں نے سنبھالا لیکن اپنے بچے کو میں نے ہی سنبھالا۔ میرے بیٹے کو فوراً یرقان ہو گیا سسرال میں کسی نے نہیں کہا کہ اسے فوراً دھوپ لگواؤ۔ میں نے کہا مجھے پیلا لگ رہا ہے۔ یوں ہی تمہیں لگ رہا ہے۔"

میں چلہ کرانے اپنے میکے نہیں گئی تھی۔ میرے ابو امی نے فون کیا۔ حال پوچھا۔ میں نے بتایا تو انہوں نے مجھے ڈانٹا کہ بچے کو یرقان ہو گیا ہے اور وہ ڈسکس ہو رہا ہے؟ فوراً ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔ پیدائش کے چوتھے پانچویں دن جو ٹیکہ لگتا ہے وہ لگوانے گئے تو بچے کو داخل کر دیا اسپتال والوں نے کہا کہ بچے کو شدید یرقان ہے لائف سیونگ انجکشن لگے میرے بیٹے کو۔

میرا دل کرتا تھا کہ میں پوری دنیا کو آگ لگا دوں جب اپنے چار دن کے بچے کو ڈرپس اور سوئیوں میں نیلی روشنی میں لپٹا دیکھتی تھی تو۔ نارمل پیدائش تھی۔ بچے کو خود سنبھالا۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر میری ساس اور نندوں کے ساتھ ساتھ میرے شوہر بھی پریشان ہوئے لیکن میں ایک لفظ نہیں بولی۔ صرف ایک خاموش لیکن کاٹ دار نظر سب پر ضرور ڈالی تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔

لوگوں نے دیکھا میرا بچہ گھنٹوں میں صحت یاب ہو کر گھر واپس آیا تھا الحمد للہ۔

میرا پہلا بچہ تھا مجھے تو نہیں پتا تھا کہ کیسے اور کیا کیا کرتے ہیں؟ ہم تین بہنیں ہیں میری سب سے چھوٹی بہن مجھ سے آٹھ سال چھوٹی ہے۔ میرے گھر میں کوئی بچہ نہ بچے کی باتیں۔

یہاں ماشاء اللہ میرے ساس سسر کے نواسے نواسیاں ہیں تین نندوں سے۔ یہ پہلا پوتا ہے میرا بیٹا۔

بچے کے گھر آنے کے بعد میں نے کمر کس لی اور پوری توجہ دی بیٹے کو۔ کسی سے کوئی کام نہ کہا نہ اپنا نہ اپنے میاں کا۔ میرا بیٹا جون کی پیدائش ہے سخت گرمی۔ میری روٹین تھی کہ میں شوہر کو گھر آنے کے بعد پہلے سے بنا کر رکھا ہوا ٹھنڈا شربت دیتی تھی۔

بچے کی پیدائش کے بعد یہ لیکن نہ ہو سکا مجھ سے۔ ساس نندیں سب موجود، حد سے زیادہ مہمان داری۔ جو باپ بنا ہے اس کے لیے کوئی شربت نہیں؟"

پانچویں دن میں اٹھی اور اٹھ کر شربت بنا کر اپنے شوہر کو دیا تو وہ نظریں ان کی آج تک نہیں بھولی شکر گزاری والی۔ الحمد للہ، اللہ نے ہمت دی۔ کوئی معذور تو نہیں تھی کہ اتنا بھی نہ کر سکوں۔ میری

ساس نندیں چپ۔ میرے طور طریقوں کو اپنے گھر آزماتی ہیں۔ لیکن جھوٹے منہ تعریف نہیں کرتی ہیں، بخل سے کام لیتی ہیں۔ تو لیتی رہیں مجھے کوئی غم نہیں۔

میں ان میں سے نہیں ہوں جو سسرال والوں پر جلیں، کڑھیں اپنا دل سڑا دیں۔ انگور، انگور، انگور اور ہر چیز اللہ پر چھوڑی بھروسا، توکل سب اللہ پر۔ الحمدللہ۔

س ”جوائنٹ فیملی سسٹم کو ترجیح دیتی ہیں یا؟“

ج ”ہرگز ہرگز نہیں جوائنٹ فیملی۔ لڑائی جھگڑے، کدورتیں سب کی سب اس نظام میں پنپتی ہیں۔

دور رہ کر خدمت بھی کی جاتی ہے اور عزت بھی کی جا سکتی ہے۔ میں شادی کے ایک سال بعد الگ ہوئی تھی سسرال والوں کی مرضی سے۔ تین ماہ بعد بیٹا پیدا ہوا۔ بڑی نند نے آ کر میرا گھر سنبھالا تو روز کے روز جو خون کے گھونٹ پیے میں نے لیکن بس کچھ دن تک۔ اس کے جانے کے بعد نئے سرے سے گھر صاف کیا۔ کچن سیٹ کیا۔ روٹین سیٹ کی۔ میں اپنے گھر کی ہوں۔ میں اپنے معاملات دیکھتی ہوں۔ سنبھالتی ہوں۔ کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ نہ اپنے معاملات میں دخل اندازی کرنے دیتی ہوں۔ کچھ ایسی بھی باتیں ہیں جو انتہا پر جا کر ہیں لیکن میرے خیال میں میرے پاس اتنی نیکیاں نہیں ہیں جو میں غیبت چغلی کر کے اپنے سسرال والوں کو دوں۔

میں جو مرضی کروں، کہوں اپنے میاں کے آگے لیکن میرے اپنے میکے میں کسی کی مجال نہیں کہ میری سسرال یا میاں کی برائی کر سکے۔ اور یہاں سسرال میں کسی کا زور نہیں کہ میرے میکے کی برائی کر سکے۔ میں یہاں خدا رسول کو گواہ بنا کر بیاہ کر آئی ہوں۔ خرید کر نہیں لائے یہ لوگ مجھے کہ جو مرضی کرتے اور کہتے رہیں۔ میں اپنی تمام پڑھنے والی …وں سے کہنا چاہوں گی کہ اللہ نے مرد کو عورت کا …ہے۔ لیکن کہیں یہ نہیں کہا کہ بدلے میں عورت جل جائے، کڑھ جائے دل مارے اور خود مر جائے۔ جہاں انسان انسان کو نہ سمجھے۔ وہاں اپنی قربانی بھی نہیں دینی چاہیے کہ وہ ارزاں جاتی ہے۔ اللہ سے لو لگائیں۔ بھروسہ رکھیں۔ اکثر میں نے دیکھا ہے کہ عورتیں روتی ہیں کہ شوہر خرچا نہیں دیتے۔ بھلا مرد بھی خرچا دیتے ہیں؟ اللہ ہے جو دیتا ہے۔

ایک جوتی کی ضرورت ہے یا روٹی کی۔ اگر بندہ (شوہر) انسان نہیں بن رہا تو بچھالو مصلیٰ اور مانگو اس ہستی سے جس کے آگے سب محتاج ہیں۔ سسرال والے بھی رشتہ دار بھی اور شوہر بھی۔

بچے کی پیدائش پر ماں نے بچے کا نام نہیں رکھا تو جل جل کر اپنا خون جلا لیا صحت خراب کر لی۔ کیوں بھئی؟ اتنی سستی ہے صحت ہم ماؤں کی؟ ایک انسان کو بچے کو پیدا کرنا آسان ہے؟ یہ بات اگر ہم مائیں سمجھ لیں تو کوئی بات دل کو نہ چیرے۔ شوہر نے شادی کے فوراً بعد گجرے نہیں لا کر دیے تو ایسی ایسی ذات کے منفی خیالات ذہن میں آئیں گے کہ عملی زندگی میں اودھم مچا دیں گے۔

Comeon Ladies Grow up

اپنے آپ کو اتنا قیمتی اور روشن کر لو کہ دنیا آپ کی چمک کو چھو نہ پائے۔ بس دور دور سے دیکھتی ہے۔

کوئی آپ کی پیٹھ پیچھے برائی کرتا ہے تو سو بسم اللہ۔ کرو برائیاں اس کی تمام اچھائیاں آپ کو مل جائیں گی سبحان اللہ۔

کافی لمبا سلسلہ ہو گیا ہے۔ ایک اہم بات کہنا چاہوں گی کہ یہ تمام میرے اپنے ذاتی خیالات اور عملیات ہیں۔ ان سب سے کسی کا متفق یا غیر متفق ہونا ضروری نہیں۔

کسی کی جانے انجانے میں دل آزاری ہوئی ہو تو میں معذرت چاہوں گی کہ میں بھی اسی نہ رہنے والی دنیا کا ایک حصہ ہوں۔ معافی مانگنا سیکھیں اور معاف کر دینا سیکھیں۔ اپنی دعاؤں میں اللہ کی رضا سے یاد رکھیں۔

☆

www.pklibrary.com

وجیہہ غوری اوکاڑہ سے لکھتی ہیں

اس بار رسالہ تاخیر سے موصول ہوا، اس لیے ابھی مکمل تبصرہ نہیں کر سکی۔ بس نگہت سیما کا ناول "اک دیا رہنے دیا" بہت اچھا لگا۔ بہت خوب لکھ رہی ہیں اور "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" یہ سلسلہ بھی بہت اچھا چل رہا ہے۔ شعاع کی کہانیاں بہت سبق آموز ہوتی ہیں، ہر دفعہ کچھ نیا سیکھنے کو ملتا ہے۔ سب ہی رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ آپی میں بھی —— شعاع کے ذریعے اپنی سوچ دوسروں تک پہنچانا چاہتی ہوں، ہو سکتا ہے میری لکھی ہوئی کوئی بھی بات کسی کے لیے مشعل راہ بن جائے اور میری موت کے بعد نیکی کا در کھلا رہے۔

☆ پیاری وجیہہ! بہت شکریہ۔ آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ آئندہ خط لکھیں تو تفصیل سے ساری کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے لکھیے گا۔ کہانی ضرور لکھیں اجازت کی ضرورت نہیں۔

آپ کی کہانی اگر قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

اچھی بات، اچھی سوچ دوسروں تک پہنچانے میں ہم ہر ممکن تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

پری وش مری بلوچ ضلع کوہلو بلوچستان سے لکھتی ہیں

عید اور گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے اگست کے شعاع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شاہین آپا نے پہلی دفعہ ہمارے مزاج کے مطابق انٹرویوز لیے۔ "شام کی حویلی" اور "شہر تمنا" کی مثال دو خوب صورت اور انجانی پر کشش جگنوؤں جیسی ہے۔ "اک دیا رہنے دیا" ابھی پڑھی نہیں۔

معلوم نہیں کون سا سوز تھا جس کی راحت کے لیے سعید عمیر نے صوفی شاعری کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سوز گہرا ہوتا چلا گیا۔ قلم نے جذبات پھونکنے شروع کر دیے۔ (سعید جی! شان دار تحریر تھی) بلوچ صوفی شاعر مست توکلی (جو کہ "مری" قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا مزار کوہلو میں ہے) کا شعر ڈائجسٹ میں غلطیوں کی وجہ سے بے معنی سا لگا۔ فیصل آباد سے متعلق خوب صورت معلومات دینے کے لیے رائٹر کا شکریہ۔ پاکستان کے شہروں میں مجھے فیصل آباد بہت پسند ہے۔

پہلے حیا بخاری اور پھر اتنی جلدی آسیہ رزاقی بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ اقبال کا یہ دعائیہ شعر آسیہ رزاقی کی نذر۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میں نے زندگی میں پہلا مکمل ناول آسیہ جی کا "واپسی" پڑھا تھا۔ وہ تحریر، اس کے کردار اور کرداروں کے نام میں کبھی نہیں بھولوں گی۔

دعا کریں کہ مہر اور دل وش میرے ساتھ خط لکھنے پر راضی ہو جائیں۔ پچھلے مہینوں میں نے ان کے ساتھ قطع تعلق کر کے اکیلے خط بھیجے تھے کیونکہ پوسٹ کرنے کی مصیبت میں اکیلی جھیلتی تھی اور یہ میرے ساتھ مل کر (صرف) لکھتی تھیں لیکن اب میں کہتی ہوں کہ مل کر لکھتے ہیں کیونکہ میں بھی کہ ......

رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت
نہ شخصی بزرگی نہ شخصی حکومت

مگر یہ دونوں کہتی ہیں کہ نہیں تم اپنا بھیج دو، ہم اپنا خود دونوں مل کر بھیجیں گے (ابھی ناراض جو ہیں)۔

ویسے آپس کی بات ہے، کب سے کہہ رہی ہیں خط لکھ کر اپنی رائے بھیجیں گے۔ مگر ان سے کچھ نہیں ہوتا۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپی آپ اکثر لکھتی رہی ہیں، بہنوں کے خطوط کے جواب میں کہ ہم ایک ہی لفافے میں شعاع اور خواتین کے خط وغیرہ بھیج سکتے ہیں لیکن میں نے جب شعاع خواتین کے لیے ایک لفافہ استعمال کیا تو ایک غائب رہا۔

ایک اور سوال کہ شاہین آپا جب "دستک" والے انٹرویوز کرتی ہیں تو کیا کرتی ہیں یعنی فون پہ یا ان کے گھر جا کر؟

اس دفعہ میرے سوال نامے کی عزت کا خیال رکھیں ورنہ میں خود کراچی چلی آؤں گی۔

☆ پیاری پری وشہ! بچپن میں اندھے لنگڑے کی کہانی پڑھی تھی۔ یقیناً آپ نے بھی پڑھی ہوگی۔ ایک گاؤں میں اندھا اور لنگڑا رہتے تھے۔ گاؤں میں آگ لگ جاتی ہے...... سب بھاگ جاتے ہیں، اب لنگڑا اور اندھا کیسے بھاگیں۔ اندھا لنگڑے سے کہتا ہے، تم میرے کاندھے پر بیٹھ کر راستہ بتاؤ، میں دیکھ نہیں سکتا لیکن چل تو سکتا ہوں۔ چنانچہ لنگڑا اندھے کے کاندھے پر بیٹھ کر راستہ بتاتا گیا اور اس طرح دونوں گاؤں سے نکل گئے اور آگ سے محفوظ رہے۔

تو پیاری بہن! زندگی بھی اندھے لنگڑے کی کہانی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے ان کی صلاحیتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ اچھا ہوا، آپ کو خود ہی احساس ہو گیا۔ اب مہر وشہ اور دل وشہ کو بھی ہمارا جواب پڑھا دیں، قطع تعلق اچھی بات نہیں۔

خواتین اور شعاع کے لیے آپ ایک لفافہ میں بھیج سکتی ہیں۔ یہ سہولت ڈاک خرچ میں اضافہ کی وجہ سے دی گئی، آپ کا خط شائع نہ ہونے کی وجہ ایک لفافہ میں بھیجنا نہیں ہے۔ صفحات کی کمی یا تاخیر سے موصول ہونا بھی وجہ ہو سکتی ہے۔

دستک کے سلسلے میں انٹرویوز اکثر فون پر ہی کیے جاتے ہیں۔ آپ کے سوالات کے جوابات تو ہم نے دے دیے لیکن آپ پھر بھی کراچی ضرور آئیں۔

ہماری بہت چھوٹی اور پیاری سی قاری دعا ءالخیر چک نمبر 485 سمندری ضلع فیصل آباد سے ہماری بزم میں شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے

میرا نام دعا ءالخیر ہے۔ میں نورتھ کلاس میں ہوں۔ میں ہر کلاس میں فرسٹ آتی ہوں، 4 دسمبر 2019ء کو میں نو سال کی ہو جاؤں گی۔

میں نے خط پہلی بار نہیں لکھا ہے، ون کلاس میں، میں اپنی امی کو چھوٹے چھوٹے خط لکھتی تھی کہ امی آپ ہمیں ٹائم نہیں دیتیں، ہر وقت کام کرتی ہیں یا تھانے، عدالتوں کے چکر لگاتی ہیں مگر جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی مجھے میری امی کی مجبوریاں سمجھ میں آتی گئیں۔ میں چار سال کی تھی تو میرے ابو فوت ہو گئے تھے۔ میری بہن تین سال کی تھی اور بھائی دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ امی چھبیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں کیونکہ امی کی شادی راجن پور سے اس جگہ پر ہوئی تھی جب میں چھ ماہ کی تھی۔ میرے ابو کا ایکسیڈنٹ ہوا اور ان کی یادداشت ختم ہو گئی تھی۔

ان کے دماغ پر چوٹ لگی تھی۔ میرے چچا نے ہماری زمین پر قبضہ کر کے امی اور مجھے نکال دیا تھا۔ امی نے راجن پور جاب کر کے گزارہ کیا، ابو کا علاج کروایا۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور ادھر میرا چچا ہر چیز پر عیش کر رہا تھا جب میں چار سال کی ہوئی۔ نشاط الایمان تین سال کی اور شیث دو سال تھا۔ تب ابو کچھ ٹھیک ہوئے تو ابو نے کہا کہ "میں فیصل آباد جا رہا ہوں، اپنے بھائی سے اپنا حق لینے کے لیے۔" ابو ہمیں راجن پور چھوڑ کر فیصل آباد آ گئے مگر ابو سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا۔ کچھ دن بعد ہمیں پتا چلا کہ ابو بیمار ہیں، امی روزے کے ساتھ جولائی میں ہم تینوں کو لے کر روانہ ہو گئیں۔ ہمارے ساتھ ہمارا کوئی ماموں بھی نہ آیا۔

اس دن اٹھائیسواں روزہ تھا۔ ہم سحری کے وقت روانہ ہوئے۔ ظہر کے وقت پہنچے، اتنا لمبا سفر کیا۔ تمام راستے خوش تھے کہ ابو کے پاس جا رہے ہیں، ہمیں یہاں آ کر پتا چلا کہ ابو کو ایک دم کچھ ہوا، ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔ ہم ابو کا انتظار کر رہے تھے، میری چھوٹی بہن ابو سے بہت محبت کرتی تھی۔ آتے ہی اس نے ابو کو ڈھونڈنا شروع کیا، ہر جگہ، واش روم میں، چھت پر کہ ابو کہاں ہیں۔

روزہ افطار ہوا اور ادھر سے میرے ابو کی ڈیڈ باڈی گھر پہنچ گئی۔ اس وقت...... اس وقت تو ہمیں باپ کا دکھ تھا مگر اب میں سوچتی ہوں کہ امی پر کیا گزری ہوگی۔ ہم خالی ہاتھ تھے نہ ماموں پہنچ سکے، نہ نانی اماں۔ سفر بہت لمبا ہے اور ہم لمبا سفر کر کے بھی خالی رہ گئے۔ آج تک پتا نہ چلا کہ میرے ابو اچانک کیسے چلے گئے؟ کس کو قاتل

سمجھیں۔ میری چھوٹی بہن تڑپ تڑپ کر روتی ہے۔ اب تک کہ ابو کے پاس جانا ہے۔

پھر ہمارے ساتھ وہ کچھ ہوا جو ڈراموں میں ہوتا ہے۔ امی کو کوئی دلاسا دینے والا نہ تھا۔ امی نے عدت گزار کر سر پر کفن باندھ لیا۔ گاؤں میں کسی نے امی کا ساتھ نہ دیا۔ کیس لڑنے کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ امی گھر کا کام کر کے ہم تینوں کو رکشے پہ بٹھاتیں اور ہم سارا دن عدالت میں گزارتے۔ گرمی ہوتی، کبھی سردی ہوتی، ہم بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے۔ امی کا ایکسیڈنٹ ہوا، میرا بھائی بھی ساتھ تھا۔ امی بے ہوش ہو گئیں، بھائی کو چوٹیں لگیں اس وقت بھائی دو سال کا تھا، امی کو اللہ تعالیٰ نے نئی زندگی دی مگر امی نے ہمت نہ ہاری۔

آج میں نے آپ کو خط لکھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنے بچپن سے امی کو آپ کے ڈائجسٹ پڑھتے دیکھا ہے، امی نے کہا ہے کہ وہ جب تھری کلاس میں تھیں، آٹھ سال کی عمر سے آپ کے رسالے پڑھ رہی ہیں۔ امی کو ان رسالوں سے اتنی محبت ہے کہ ایک ٹین فٹ کی پیٹی میں 1996ء سے لے کر اب تک کے رسالے سنبھال کر رکھے ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ میرے ساتھی بھی یہی اور میرے دوست بھی یہی۔ کہتی ہیں کہ تم لوگوں کو چھوڑ کے امی 23 سال سے پڑھ رہی ہیں مگر آج تک آپ کو خط نہیں لکھا۔

ہم نے جب بھی دیکھا امی کو مصروف دیکھا۔ گھر کے کام عدالتوں کے چکر یہاں تک کہ امی نے ہمیشہ ہمیں کپڑے خود سلائی کر کے پہنائے ہیں، ایسے کپڑے جو کسی کے سلائی نہیں ہوتے، وہ ہمارے ہوتے ہیں۔

اسکول سے آتے ہی لیٹر لکھنے بیٹھ گئی۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا، بازو میں درد بھی ہے۔ امی نے دو دن بعد عدالت جانا ہے۔ شہر تو لے جائیں گی اس لیے لکھنا ہے جلدی۔ ابھی امی سامنے چاول رکھ گئی ہیں کہ پہلے کھانا کھا لو۔ بار بار امی میرے سر پہ ہاتھ رکھ کے روتی ہیں۔ کہہ رہی ہیں۔ "شاباش بیٹا!" بہت خوش ہیں امی، بار بار کمرے میں آ کر دیکھتی ہیں، پوچھتی ہیں، "کچھ چاہیے تو نہیں" جیسے میں پیپر کی تیاری کر رہی ہوں۔ آج تو خدمت ہو رہی ہے۔ اب تو روزانہ آپ کو خط لکھوں گی۔ خط کے شروع میں لائن چھوڑنا بھول گئی تو امی نے کہا۔ "دعا ہو الخیر! لائن تو چھوڑی نہیں" پھر امی نے آنٹی احمل سے بات کروائی، چار سال بعد ان سے بات ہوئی۔ اتنی میٹھی آواز، کہنے لگیں کہ دعا کو رعایت ہے۔ "لائن چھوڑنے کی" مگر امی نے کہا کہ "نہیں، اصول اصول ہے۔ لائن چھوڑو۔ رعایتی نمبر نہیں چاہئیں" تب لائن چھوڑ کر لکھا ہے میں نے خط۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھا ہے کیونکہ میں نے جب بھی امی سے پوچھا کہ آپ نے کپڑے سینا کہاں سے سیکھا؟ جواب ملا۔ رسالوں سے۔ امی آپ نے کیس لڑنا کہاں سے سیکھا؟ جواب ملا۔ رسالوں سے۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے آج تک ان کو خط نہیں لکھا۔ امی کہتی ہیں کہ الفاظ نہیں ہیں تعریف کے۔ امی ہمیں بھی آپ کی کہانیاں سناتی ہیں اکثر سمیرا حمید آنٹی اور سائرہ رضا کے کرداروں کی۔ میں نے تو کبھی نہیں پڑھی، ابھی چھوٹی ہوں اور پڑھائی بھی کرنی ہوتی ہے مگر امی نے پہلی بار کہانی "بھولے میاں" نکال کر دی، وہ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ (ہمارے گھر میں بھی ایک بھولے میاں ہیں)۔

پہلے ہم عدالتوں میں امی کے ساتھ جاتے تھے، اب چار سال سے اسکول جانے لگی ہوں۔ امی ہمیں اسکول روانہ کر کے کام کر کے جاتی ہیں، اکیلی۔ آپ دعا کریں کہ اللہ میری امی کو کامیاب کرے اور ہمیں ہمارا حق مل جائے۔ آپ کا شکریہ آپ کی وجہ سے ہمیں بہترین ماں ملی، بہترین استاد ملی بہترین دوست ملی۔ میں امی سے پوچھا کرتی تھی کہ آپ کی کوئی دوست نہیں؟ امی نے کہا، کیوں نہیں، احمل، عمیرہ احمد، اقبال بانو، سائرہ رضا، سمیرا حمید، نعیمہ ناز اور بھی بہت نام لیتی تھیں۔ پہلے مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کوٹ مٹھن میں ہیں وہ سب کیسے کیونکہ یہاں تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا نہ امی کو کسی کے گھر جاتے ہوئے دیکھا۔

اب سمجھ میں آیا کہ امی کن کو دوست کہتی ہیں۔ واقعی ٹھیک کہتی ہیں۔

اسکول سے آ کر بیٹھی تھی، چھ گھنٹے ہو گئے لکھتے لکھتے۔ بازو میں بہت درد ہے، ہاں امی اب رات کا کھانا بنانے لگی ہیں۔ امی نے کہا ہے کہ آپ کی اردو لکھائی چاہے جتنی بھی گندی ہے لکھو۔ آدھا تو کاٹ دیں گے وہ لیٹر۔ آپ میرا خط ذرا کاٹنا آنٹی۔ میرے بازو پہ چوٹ لگی ہے، لکھتے وقت درد

www.pklibrary.com

ہوتا ہے رونا بھی آتا ہے پلیز نہ کاٹنا۔ امی نے کہا کہ میں کسی معاملے میں آپ کی سفارش نہیں کروں گی۔ آپ کو جو بھی ملے گا، آپ کے میرٹ پر ملے گا۔ مانگ کر کچھ لینا بھیک ہوتی ہے اور ہم بھیک نہیں مانگیں گے۔ 9 ستمبر کو میرے بھائی شیث کی سالگرہ ہے۔ ہمارا صرف ایک ہی بھائی ہے۔ دعا کرنا اللہ اس کی عمر دراز کرے، آمین۔ رات نو بجے تک لکھتی رہی، اب امی ناشتا بنا رہی ہیں۔ صبح کے چھ بجے میں نہا کر لکھنے بیٹھ گئی۔ آج اتوار ہے۔ میں آنٹی اجل سے بات کر کے بہت خوش ہوں، ان کی آواز مجھے تھکنے نہیں دے رہی۔ امی جب بھی شہر جاتی ہیں، ہمارے لیے لازمی کہانیوں کی بکس لے کر آتی ہیں۔ میرے ساتھ تصویر میں میری چھوٹی بہن ربیع الایمان ہے۔ ہم اسکول میں بھی پنسل سے لکھتے ہیں۔ پین سے نہیں لکھتے تو پین کی عادت نہیں ہے اس لیے نہیں لکھا جا رہا اچھا سا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو روزانہ لیٹر لکھوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ پوسٹ کے لیے شہر جانا پڑتا ہے۔ 100 روپے رکشہ والا لیتا ہے۔ ہمارا تو کوئی کمانے والا بھی نہیں ہے، امی کے سارے زیور بک گئے ہیں۔ دعا کریں ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔ ہم شہر جانا چاہتے ہیں مگر چچا دشمن بن گئے۔ نکلنے نہیں دیتے۔ شہر جا کر امی جاب کر کے ہی کچھ کما لیں گی۔ شہر آنے جانے کا مسئلہ اور کرایہ بھی نہیں لگے گا۔ امی نے کہا میں خود پوست کر دوں گی۔ میں نے دو سو روپے جمع کر رکھے ہیں۔ میں نے کہا جب گفٹ دیتے ہیں تو اپنے پیسوں کا دیتے ہیں۔ اس لیے آنٹی کو خط اپنے پیسوں سے بھیجوں گی۔

آنٹی میرا ایک اپنا شعر ہے، وہ میرا ذاتی شعر ہے۔

کسی اور شخص سے جو مل جاتی یتیموں کو شفقت
تو دنیا میں لفظ یتیم نہ ہوتا

اس خط میں، میں اپنی تصویر اور رزلٹ کارڈ ڈال رہی ہوں تاکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں فرسٹ نہیں آئی۔ جھوٹ بولا ہے۔ اچھا آپ یہ ضرور لکھنا کہ میں سر جاوید کے اسکول میں پڑھتی ہوں۔ سر جاوید بہت اچھے ہیں، ہم بہن بھائیوں سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ میری امی بہت اچھی شاعرہ ہیں، شادی سے پہلے اخبار میں امی کی نظمیں، غزلیں شائع ہوتی تھیں۔

پتا نہیں آپ کو میری لکھائی سمجھ میں بھی آئے گی یا نہیں۔ اصل میں، میں انگلش میڈیم میں ہوں نا، تو ہم لوگ اردو کم لکھتے ہیں۔ انگلش میں میری لکھائی بہت اچھی ہے۔ پتا ہے اجل آنٹی! ابھی کیا ہوا؟! امی آپ سے بات کر کے بہت خوش تھیں۔ امی کہتی ہیں کہ خوشی مجھے راس نہیں آتی، سچ کہتی ہیں۔ امی ہمارا سامان شہر سے لاتی ہیں، آج کوئی جا رہا تھا تو امی نے اسے ہمارے سامان کے پیسے دے دیے۔ کاپیاں رجسٹر وغیرہ، سامان ہزار روپے کا ہوگا مگر اس نے آ کر بتایا کہ میں نے سامان خریدا تھا مگر راستے آپ کا سامان گر گیا۔ ہمارا تو نقصان ہو گیا، امی کو بہت دکھ ہے۔ تھوڑی دیر کی خوشی بھی راس نہیں آئی امی کو۔ امی نے آج تک کسی سے کچھ نہیں منگوایا تھا، خود لاتی ہیں۔ آج ہی پیسے دیے اور یہ ہو گیا۔

☆ پیاری دعا! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ چوتھی کلاس کی طالبہ کی اتنی اچھی لکھائی اور خط بھی بہت اچھا لکھا آپ نے۔ اتنی سی عمر میں آپ اتنی تکلیفوں سے گزری ہیں، پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو ہدایت دے۔ گڑیا آپ مایوس اور پریشان نہ ہوں۔ یہ پریشانیاں وقتی ہیں۔ ان شاء اللہ آپ کی ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ بس پڑھنے میں دل لگائیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت پیاری صورت، بہت اچھا ذہن اور بہت حساس دل دیا ہے۔

پیاری گڑیا! ابھی آپ بہت چھوٹی ہیں، فی الحال آپ رسالوں اور کہانیوں کے چکر میں نہ پڑیں، بس اپنی پڑھائی پر توجہ دیں، جب میٹرک کر لیں تب کہانیاں پڑھیں۔

دعا! یہ آپ کا پہلا خط تھا، ہم نے اسے ایڈٹ نہیں کیا لیکن ہم ہمیشہ اتنا طویل خط شائع نہیں کر سکتے کیونکہ ہر ماہ ہمیں بڑی تعداد میں خط موصول ہوتے ہیں۔ انہیں بھی شامل کرنا ہوتا ہے آپ ہمیں خط ضرور لکھیں، ہم آپ کا خط بہت خوشی سے پڑھیں گے لیکن خط ایڈیٹ کر کے ہی شائع کر سکتے ہیں۔

آپ کی امی کا خط بھی ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل کریں گے۔

ریحانہ چوہدری مدو کے اندھیر سے شریک محفل ہیں، لکھا ہیں

یکم جون سے جب اسکول سے چھٹیاں ہوئیں تو یوں لگتا تھا کہ جیسے ہر دن ایک افسانہ لکھوں گی۔ مگر ہائے افسوس

www.paklibrary.com

کچھ گرمی کی شدت، کچھ عیدین کے تہوار اور کچھ چھٹیوں کی وجہ سے آنا جانا۔ وقت ہی نہ ملا۔ آج پہلا پیریڈ فری تھا تو کالے بادل اچانک چھا گئے تو مس نویدہ نے اسٹاف روم سے باہر بلوایا کہ اب میں اور میرا ابر آ گئیں تو موسم دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اب خط لکھ رہی ہوں۔ ”پہلی شعاع“ میں ہی آپ نے جس جانگداز حقیقت پہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے یقیناً کشمیر وقت اس صدی کی بدترین صورت حال سے گزر رہا ہے اور پوری دنیا خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔

پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح ایمان افروز ہیں۔ حرا مالی اور رشا جاوید کے وستک میں جوابات پسند آئے۔ صبیحہ ہاشمی سے ملاقات بہت دلچسپ تھی۔ آسیہ رزاقی کی موت کا بہت دکھ ہے مگر ان کے الفاظ انہیں ہمیشہ اردو ادب میں زندہ جاوید رکھیں گے۔

نعیمہ ناز کہانی کو اپنے مخصوص انداز میں لے کر آگے بڑھ رہی ہیں مگر نائلہ کا کردار بہت ہی برا ہے۔ گھن آتی ہے اس کے بارے میں پڑھ کر۔ ”یار دل دار“ ہمیشہ کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔ موڈ کو فریش کرنے والا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اپنے ہی خاندان میں رباب پہنچ گئی ورنہ اس کا انتقامی قدم تو غلط ہی تھا۔ ”شام کی حویلی میں“ رخسانہ نگار عدنان بہت چابک دستی سے پلاٹ پہ کنٹرول کیے ہوئے ہیں۔

☆ پیاری ریحانہ! بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری مجبوریوں کا احساس کیا۔ نائلہ کا کردار پڑھ کر گھن نہ کھائیں۔ زیادتی تو بہرحال اس کے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ والدین کو تھوڑا بہت لڑکی کے جوڑ کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ بے جوڑ شادیوں میں زندگی روتے دھوتے ہی گزرتی ہے۔ پیسہ، دولت نہ سہی، پرستائش کے حساب سے ہی اس کا شوہر بچھا ہوتا۔

کشمیر پہ پوری دنیا تو خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے لیکن ایمان داری سے سوچیں ہماری حکومت نے اب تک کیا کیا ہے۔ ہم تو اقوام متحدہ میں اپنا مقدمہ بھی پیش نہ کر سکے۔ یہ ہماری خارجہ پالیسی ہے کہ پوری دنیا میں اہم سولہ ممالک کو بھی اپنے حق میں قائل نہ کر سکے۔

سکینہ علی نے ٹنڈو الہ یار سندھ سے لکھا ہے
اس ماہ شعاع کا شمارہ اچھا تھا۔ سب سے پہلے ”پہلی شعاع“ پڑھی۔ کشمیریوں کا دکھ سب سے بڑا ہے، جنت جیسی وادی میں خون خرابے ہو رہے ہیں۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ ح سیمن کے جوابات پڑھ کر دکھ ہوا۔ نعیمہ ناز کا ناول ”شہر تمنا“ اچھا جا رہا ہے۔ ایک شکایت ہے آپ سے کہ پلیز صفحے بڑھائیں، افشین انجم ”یار دل دار“ اس قسط میں فلزا کی شادی کیوں کر دی۔ پلیز اس کو واپس لائیں۔ عنبرین اعجاز کا افسانہ ”اے ہمدم دیرینہ“ کچھ خاص نہیں تھا۔ نزہت جبیں ضیاء کا افسانہ ”عورت نامہ“ اچھا تھا۔ عورت کا کام ہے گھر کو سنبھالنا۔ مکمل ناول مدیحہ سعید کا ”اسیر عشق“ اچھا تھا۔ فرح بخاری کا ناول ”اب کے ہم بچھڑے“ اچھا تھا۔ انعم کو اپنی محبت کہاں ملی۔ حنا بشریٰ کا افسانہ ”شکست فاش“ اچھا تھا۔ ”دل میں رکھ لینا“ سدرۃ المنتہیٰ کا ناول اچھا تھا۔ رخسانہ نگار عدنان کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے، خط آپ کے میں سب بہنیں اچھا لکھتی ہیں۔ آپ سب قاری بہنوں کے خطوں کے جوابات بہت پیارے اور میٹھے انداز سے دیتی ہیں، اللہ آپ کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے، آمین۔ تاریخ کے جھروکوں سے اچھا سلسلہ ہے۔ خوب صورت بننے میں پلیز گرتے بالوں کے بارے میں بتائیں کہ کیسے روک سکتے ہیں۔ میری بیٹیاں اقصیٰ عروج، عریبہ علیشبہ اور میری پیاری بھتیجی زنیرہ نایاب آپ سب کو سلام دے رہی ہیں۔ سارہ کا بھی قبول کیجیے، میری کزن ہے۔

پیاری سکینہ! آپ نے ہماری محفل میں شرکت فرمائی بہت شکریہ۔ بہت اچھا خط لکھا ہے آپ نے۔ تبصرہ بھی بہت خوب ہے۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔
اپنی پیاری بیٹیوں اقصیٰ، عروج، اریبہ اور علشبہ کو ہماری طرف سے دعا اور سلام، اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ زنیرہ نایاب اور سارہ کے لیے بھی خوش بختی کی دعائیں۔

زینب نور نے جہانیاں سے لکھا ہے
رسالہ ہاتھ میں آتے ہی اپنا خط ڈھونڈا اور پھر مل بھی گیا۔ (تھینکس گاڈ...... ورنہ پتا نہیں میرا کیا ہوتا) اب یہ بتا دیں کہ سلسلہ ”شعاع کے ساتھ ساتھ“ میں حصہ لینے کے لیے مجھے دوبارہ سے لکھنا پڑے۔

حمد، نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں ہر بار کی طرح پرفیکٹ۔ رخسانہ نگار عدنان اور نعیمہ ناز کی تعریف لفظوں کی محتاج نہیں۔

فرح بخاری کی "جب کے ہم بچھڑے تو" زبردست۔ "ایک دیا رہے دیا" اف میرے اللہ..... کیا خوب تحریر ہے۔ "یار دل دار" زبردست۔ اس کے آخری جملے نے خوب ہنسایا۔ مجھے لگتا ہے یہ نیلم طلزا کی شادی میں ضرور کوئی پنگا ڈالے گی۔ آخر "یار دل دار" میں یار کے لیے کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ حنا بشریٰ کا "شکست فاش" بھی بہت اچھا تھا۔ کبریٰ اختر فرام بہاول پور۔ آپ بھی جہانیاں سے نکل گزریں کہ ہمیں بھی یاد کرلیا جاتا۔ ویسے میری زندگی کی سب سے بڑی دو خواہشیں ہیں ایک تو یہ کہ کپڑے کی مارکیٹ میں جاؤں اور اپنی پسند کا صرف ایک جوڑا خریدوں۔ آج تک میں اپنا سوٹ لینے بازار نہیں گئی اور دوسری یہ کہ قارئین بہنیں اپنے خطوط میں میرا ذکر کریں (ہاہاہا..... یقین کریں پوری جھلی ہوں میں)

پیاری زینب! آپ کے گھر والوں نے آپ کے ساتھ جو زیادتی کی اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے، انہیں بتا دیں کہ ہم ان سب سے بہت خفا ہیں۔ جنہوں نے سروے شائع نہ ہونے پر ہماری معصوم سی، پیاری سی زینب کا مذاق بنایا۔ خیر آپ ان کی بالکل پروا نہ کریں کوئی کچھ بھی کہے، کہتا رہے، ہمیں آپ بہت عزیز ہیں۔

شعاع کے ساتھ ساتھ آپ دوبارہ بھجوا دیں۔ سوٹ کے لیے آپ کے ابو سے درخواست کریں گے کہ آپ کو بازار لے جا کر آپ کی خواہش پوری کر دیں۔ لڑکیاں تو آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں۔ کل جب آپ کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر بسائیں گی تو یہ خوش گوار یادیں ان کا اثاثہ ہوں گی۔

دوسری خواہش قارئین پوری کر سکتے ہیں۔ قارئین توجہ دیں۔

کوثر خالد سودا نے جڑانوالہ فیصل آباد سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع کے صرف سلسلے پڑھ سکی۔ ساس بہت بیمار ہیں۔ بہو بیٹا ادھر ہی آگئے ہیں، فوزیہ ثمر کی امی کے لیے ترجمہ تفسیر سمیت قرآن پڑھ رہی ہوں۔ اللہ قبول فرمائے، آمین۔ ثمینہ اکرم کو غنوئی کی شادی مبارک ہو۔ باقی بسم اللہ پور سے ملائکہ کوثر سے ریحانہ مدو کے تک سب کو سلام، دعا اور صحت و کامیابی مبارک ہو۔ سوگواروں کو تسلی۔ طاہرہ عندلیب زہرا سے بات کرا دیں، کدھر گم گئی ہے۔ میرے پاس فون نمبر نہیں ہے۔

☆ پیاری کوثر! آپ نے خط نہیں لکھا تو ہماری قارئین اور ہم نے بھی آپ کی کمی محسوس کی۔ آپ کے خط میں جو اپنائیت اور محبت جھلکتی ہے، دل میں گھر کر لیتی ہے۔

آپ کی ساس کی بیماری کا جان کر بہت تشویش ہوئی۔ وہ تو طویل عرصہ سے بستر پر ہیں۔ اب حرید بیماری..... اللہ تعالیٰ آپ کے لیے اور ان کے لیے آسانیاں کرے، آمین۔

خدیجہ اکرم نے بہار کالونی کراچی سے لکھا ہے

اگست میں میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پچھلے سات مہینے سے بستر پر تھے، اچانک برین ہیمبرج ہوا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ سے اور قاری بہنوں سے دعا کی درخواست کرتی ہوں۔

اب آتے ہیں رسالے کی طرف، آپی آسیہ رزاقی کے انتقال کا جان کر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ "دستک" میں حرا مانی اور ثناء جاوید سے ملاقات اچھی رہی۔ صبیحہ ہاشمی کی نرم گفتگو پڑھی، بہت ہی لطف آیا۔ اللہ سے دعا کی کہ وہ ہمیں بھی ایسی نرمی عطا فرما دے تو زندگی ہی سنور جائے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں رح بہن کی زندگی میں مشکلات دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے لیے آسانیاں فرمائے۔ "خط آپ کے" پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے، ایسے لگتا ہے جیسے کسی بہت ہی اپنوں سے مل رہے ہوں۔ سب کے ہی خط پڑھتی ہوں لیکن اس دفعہ بہن اقراء طارق کے خط نے بہت متاثر کیا۔ "شہر تمنا" بھی اچھا جا رہا ہے، دیکھیں جمال کا جھوٹ کہاں تک ساتھ دیتا ہے، عائشہ کے ساتھ بھی اچھا ہو جائے۔ "اے صدم دیرینہ" بس گزارے لائق تھی، ایسے کرداروں کی کمی نہیں

بقیہ صفحہ نمبر 240 پر

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ”آفیشل پیج“ کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اورکہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کریں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ — ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن — عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

www.pklibrary.com

نعیمہ ناز

عالیہ بیگم اپنی بیٹی حمنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دینی چاہیے۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیزے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خود سر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر بہت ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مرمٹا ہے۔

چنبیلی کا تعلق بازار حسن سے ہے۔ طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا ہے جو چنبیلی کے حسن پر مرمٹا ہے۔

شاہ میر رسول بخش کا سب سے چہیتا شاگرد تھا، جو ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔

www.pklibrary.com

احمد، فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران انکل اسے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ ملی۔ انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جا گرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

سرمد سو رہا ہوتا ہے تو جمال کا فون آتا ہے۔ اپنی بدقسمتی پر کڑھتی نائلہ کو جمال کی کال ایک نعمت لگتی ہے۔ جمال اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے پھر سبز باغ دکھاتا ہے۔ اچانک نائلہ کی نظر اٹھتی ہے تو سامنے کھڑا سرمد اسے عجیب نظروں سے دیکھتا نظر آتا ہے۔

طلال چنبیلی کے شادی پر اصرار کرنے پر ہامی بھر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد مہک جان سے بات کرے گا۔ مہک جان سے بات کر کے وہ اس کی شرائط مان کر چنبیلی سے نکاح کر کے لے جاتا ہے۔

احمد کے انتقال کے بعد عائشہ اور اس کی امی بہت سارے مسائل کا شکار ہوتی ہیں لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے کسی سے قرض ادھار نہیں لیتیں۔

ایک سلائی کے سوٹ کے لیے لیس اور دھاگہ خریدنے کے لیے عائشہ کو بازار جانا پڑتا ہے۔ شام زیادہ ہو جاتی ہے وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے مانی بصد اصرار اسے لفٹ دیتا ہے۔ مانی کی امی اور بہن ماریہ گاڑی میں مانی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھتی ہیں لیکن پہچان نہیں پاتیں۔ مانی پوچھ گچھ پر ماریہ کے سامنے عائشہ کا نام لے دیتا ہے۔

جمال دوپہر میں فون کر کے نائلہ کو ہوٹل لے جانے کی بات کرتا ہے۔ دروازہ بجنے پر وہ باپ کو دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی ہے۔ سید صاحب اس کا فون اٹھاتے ہیں۔ سید صاحب کے جانے کے بعد نائلہ جمال سے ملنے چلی جاتی ہے۔ جہاں وہ ایک دوسرے سے التفات کا اظہار کرتے ہیں۔ جمال اسے اپنے نو تعمیر شدہ بنگلے میں لے جاتا ہے۔ اور اسے کہتا ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے۔

چنبیلی طلال کے ساتھ شادی ہو جانے پر بہت خوش ہے۔ طلال اسے بتاتا ہے کہ ہر چیز جو اسے پسند آ جائے وہ قید کر لیتا ہے اور اس قید سے رہائی اس کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔

سید صاحب اپنے بیٹے فرحان سے اس کی شادی کی بات کرتے ہیں تو وہ پھر ٹال دیتا ہے حمنہ کے نکاح والے دن مانی، عائشہ کا انتظار کرتا ہے۔ ماریہ جو اس کی بہن ہے اس سے پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی امی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔

عائشہ کی خالہ کا فون آتا ہے وہ عائشہ کی امی سے کہتی ہیں کہ جوان بچی کے ساتھ اکیلی کیسے رہو گی میرے پاس آ جاؤ، عائشہ کی امی انکار کر دیتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کب تک بہن کو انکار کروں گی اگر مجھے کچھ ہو گیا تو عائشہ کا کیا ہوگا۔ وہ عائشہ کے رشتے کی بات کرتی ہیں۔

جمکا جان بڑی بی کو ڈانٹتی ہے کہ تم اس انتظار میں رو رو کے کیوں مر رہی ہوں وہ نہیں آئے گا۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ تارا جمکا جان کو کبیر صاحب کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔

نائلہ جمال کے گھر سے آنے کے بعد بھی اسی تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔ سرمد آتا ہے تو اسے بخار ہوتا ہے۔ وہ نائلہ سے چائے بنانے کو کہتا ہے نائلہ منع کر دیتی ہے اور گلی کے نکڑ سے اسے چائے لانے کا کہتی ہے۔ واپس آ کر سرمد، نائلہ سے پوچھتا ہے کہ وہ آج دن میں کہاں گئی تھی۔

چنبیلی طلال کو ماں بننے کے متعلق بتاتی ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں ہمارے یہاں خاندانی بیوی سے بچہ پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ ہم چھ بھائی ہیں۔ اور چھٹا بھائی لاڈلا چھیتا یہ شادی کے چھٹے مہینے پیدا ہوا تھا۔

ماریہ، عائشہ کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے رشتے کے لیے شام میں کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ مانی اتفاقاً وہاں سے گزرتے ہوئے سن لیتا ہے۔

نویں قسط

ابرار کو ایک دو ہدایات دے کر انہوں نے فون بند کیا اور کھڑے ہو گئے، سیدھے باہر آئے۔ موبائل ان کے ہاتھ میں تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے وہ ایک جگہ کال کر چکے تھے اب دوسری جگہ کر رہے تھے، ان کا پورا وجود

www.pklibrary.com

جیسے آندھیوں کی زد میں تھا۔ اپنے اندرونی ہیجان پر قابو پاتے ہوئے وہ اب تیسری کال کر رہے تھے کہ ان کی بیوی کی کال آنے لگی۔

''ہیلو۔ آپ کہاں ہیں؟'' ان کی گھبرائی ہوئی آواز ظفر صاحب کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''میں آ رہا ہوں، راستے میں ہوں۔ شانزے گھر پہنچ گئی۔''

''جی، بہت ڈری ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے اس نے حفاظت کی۔ جان بچ گئی شانزے کی۔'' ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''یہ فائرنگ کسی کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ ڈرانے کے لیے کی گئی تھی۔'' ظفر صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ میں بس پہنچنے ہی والا ہوں۔'' انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''یہ دھمکی تھی میرے لیے، میری فیملی کے لیے، زبانی نہیں عملی دھمکی۔''

وہ سوچتے ہوئے سیدھے ہو بیٹھے۔ ان کی آنکھوں کی سرخی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

وسیع و عریض ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی وہ ہاتھوں پر کریم کا مساج کرتے ہوئے اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ کئی مہینوں بعد اب وہ اپنی پہلے والی روٹین پر آئی تھی۔ باقاعدگی سے مساج، فیشل، مینی کیور، پیڈی کیور ڈائٹ پلان، نیا ہیر اسٹائل وہ ہر طرح سے اپنا اسی طرح خیال رکھ رہی تھی جیسے پہلے رکھا کرتی تھی۔

''سامیں، اب تمہیں مجھ سے کوئی شکوہ کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اپنے چمکتے ہوئے چہرے کو آئینے میں دیکھتے وہ مسکرائی۔ اس کا نکھار اپنے جوبن پر تھا اور مسکراہٹ اس کی زندگی کی طرح، خوب صورت اور بھرپور لپ اسٹک لگی ہوئی تھی مگر جانے کیوں اسے مدھم لگ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ پنکھڑیوں کو آراستہ کیا اور پرفیوم کا اسپرے کر کے باہر آ گئی۔

لاؤنج میں آیا اس کے بیٹے کو لیے بیٹھی تھی۔

''یہ سویا نہیں اب تک؟'' ایک محبت بھری نظر اس نے اپنے بیٹے پر ڈالی۔

''ابھی تو بابا کھیل رہے ہیں۔''

''اسے، اس کے کمرے میں لے جاؤ اور تھوڑی دیر بعد سلا دینا۔''

آیا کو ہدایت دے کر وہ پھر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ موبائل اٹھا کر طلال کو کال کرنے لگی، بیل جا رہی تھی مگر کوئی رسپانس نہیں، دوسری بار بھی یہی ہوا۔ تیسری بار فون ہی آف ملا، جھنجلا کے اس نے اپنا ہی موبائل آف کر دیا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنا موبائل لے کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی اور طلال کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ کتنی اچھی جوڑی ہے ہم دونوں کی مسکان کو خود ہی اپنے آپ پر رشک آیا۔ اسی اثناء میں طلال کی لینڈ کروزر کی آواز آئی۔ گیٹ کھلنے اور گاڑی اندر آنے کی آواز اور پھر طلال کے اندر آتے قدموں کی مخصوص دھمک، مسکان کا رواں رواں سماعت بنا ہوا تھا۔

طلال کمرے میں داخل ہوا تو مسکان چونک پڑی۔ طلال کے ڈگمگاتے قدم بہکی ہوئی آواز اور تمتماتا ہوا چہرہ اس کی حالت کی صاف چغلی کھا رہے تھے۔ وہ عادی رند تھا۔ بلانوش تھا۔ مسکان جانتی تھی مگر اپنا یہ شوق وہ اپنے گھر پر ہی پورا کرتا تھا یا پھر دوستوں کے ساتھ محفلیں جمتی تھیں مگر وہاں سے پھر وہ علی الصبح ہی لوٹا کرتا تھا۔

بہکے بہکے قدموں کے ساتھ چل کر وہ بالآخر بیڈ پر پہنچ کر ڈھیر ہو گیا۔ جوتے اتارنے کا بھی تکلف نہیں کیا یا پھر ہوش و حواس ہی اتنے غائب تھے۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' مسکان کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

''اپنی محبوبہ کے پاس سے۔'' طلال نے اوندھے پڑے پڑے ہی جواب دیا۔

www.paklibrary.com

"اف۔" مسکان کی تو جان ہی جل کر رہ گئی۔ نشے میں بھی جلانے ستانے سے باز نہیں آتا، اس نے طلال کو گھورا۔

"تمہاری محبوبہ گھر میں بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

"کون؟" وہ چونک کر سیدھا ہوا پھر اس کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"تو؟ تو تو بیوی ہے پاگل، محبوبہ تو وہ ہے۔ وہ جو ادھر فلیٹ میں رہتی ہے۔ میری جان، جان تمنا۔" طلال بہکے ہوئے لہجے میں لہک رہا تھا۔ مسکان کے جسم سے روح جیسے پرواز کرنے کو تھی۔ اک سناٹے کے عالم میں وہ طلال کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

بیٹی کی کچلی ہوئی لاش دیکھ کر اس پر سکتہ طاری تھا۔ سکتہ ٹوٹا تو اس کے بین شروع ہو گئے۔

"مار ڈالا، ظالموں نے میری بیٹی کو مار ڈالا۔ ٹھیک کہتا تھا جان محمد اس نے کہا تھا کہ تم سب کو خطرہ ہے۔ میں نے سچ کہا تو تم سب ایک ایک کر کے مارے جاؤ گے۔ اس کے سچ پر اس کی بیٹی کی بلی چڑھا دی، ارے کون انصاف کرے ہم غریبوں کے ساتھ، کون ہمارا ساتھ دے گا۔ کون بچائے گا میرے شوہر کو پھانسی کے پھندے سے، میرے بچوں کو قبر میں سلا دے گا یہ درندہ، کوئی ہے روکنے والا، کوئی ہے پوچھنے والا۔" ہاجرہ بری طرح رو رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ چلا چلا کر قاتلوں کے نام لے رہی تھی۔ آس پاس بیٹھے اس کے بچے اور دوسری رشتہ دار عورتیں اسے خاموش کرانے کی، روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔ بیٹی کا کچلا ہوا خون آلود لاشہ دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی وہ بول رہی تھی۔ بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔ جو اس کے منہ میں آ رہا تھا اس نے بول دیا۔

شاہ زین کیس کے سب سے اہم گواہ کی بیٹی کی ایکسیڈنٹ میں موت ایک اہم خبر تھی۔ میڈیا والوں کی ایک بڑی تعداد اس وقت اس کے گھر پر جمع تھی اور سب کچھ لائیو جا رہا تھا۔

☆☆☆

"تمہارے ہاتھ میں صفائی بہت ہے۔" ماریہ نے اس کا سیا ہوا سوٹ دیکھ کر بے اختیار تعریف کی۔

"شکریہ۔" شاہ میر کچھ جھجک سا گیا، اس کی سلائی کی تعریف صفائی اور نفاست کو بہت لوگ سراہتے تھے مگر یہ نئی تھی۔

"تم کم گو زیادہ ہو یا شرمیلے؟" ماریہ نے بغور اسے دیکھا۔

"جی؟" شاہ میر کو اس سوال کی توقع نہیں تھی شاید، وہ حیرت سے ماریہ کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم اپنے چاچا کو بھی بہت تنگ کرتے ہو، خصوصاً کھانے پینے کے معاملے میں۔" ماریہ کے تابڑ توڑ سوالات جاری تھے۔

"آپ سے کس نے کہا؟" شاہ میر کے چہرے پر حیرانی کے بجائے سنجیدگی آ گئی۔

"چاچا نے شکایت کی تھی۔" ماریہ نے مزے سے کہا۔

"مجھ سے شکایتیں کرتے کرتے اب دوسروں سے بھی کرنے لگے۔" شاہ میر بڑبڑا کر مشین پر جھک گیا۔

"لنچ ٹائم میں تو اس مشین کا پیچھا چھوڑ دیا کرو، تمہارے علاوہ سارا اسٹاف باہر ہے، پیٹ پوجا میں مصروف تمہیں بھوک نہیں لگتی؟"

"جب بھوک لگتی ہے کھا لیتا ہوں۔ کوئی وقت مقرر نہیں ہے میرا۔" شاہ میر کا لہجہ دھیما اور عاجزانہ ہو گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بی بی، آپ میرا پورا انٹرویو لینے پر کیوں لگی ہوئی ہیں اب بس کریں۔

ماریہ کو شاید اس کے لہجے میں چھپے اس کے الفاظ نظر آ گئے تھے۔ اسی لیے وہ مسکرا کر وہاں سے ہٹ گئی۔

☆☆☆

صبح کب کی ہو چکی تھی۔ اجالا پھیلتے پھیلتے سب کو اپنے گھیرے میں لے رہا تھا۔ گھر، درخت، راستے، بازار، سورج

www.pklibrary.com

کا سنہری تھال، بھر بھر روشنی اور دھوپ لٹانے کے بعد اب باسی ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ تب نائلہ کی صبح ہوئی تھی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی گیلے بالوں میں ڈرائیر لگا رہی تھی۔ کسی بھی قسم کے میک اپ سے مبرا، بے حد خوبصورت نقوش سے سجا اس کا چہرہ ہیرے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس ہیرے کی طرح جس کا سیٹ اسے جمال نے رونمائی میں دیا تھا۔ ہیروں کی چمک خیرہ کن تھی اور جمال کی محبت اور والہانہ پن حیران کن، ہم سفر رات گلاب، ایسی رات، ایسے ساتھ اور ایسی زندگی کے خواب ہی دیکھے تھے۔ سب پورے ہو گئے۔ خواہشات جب تک ادھوری رہتی ہیں ایک بے چینی ایک تڑپ رہتی ہے، ان کے پورے ہونے کی اور جب یہ پوری ہو جاتی ہیں تو بھی سکون ٹھہراؤ اور اطمینان کی کیفیت کے بجائے۔ اضطراب طاری ہو جاتا ہے۔

اب کے ڈھونڈا کریں اب کے چاہا کریں
اب تو تو بھی مل ہی گیا، اب کیا کریں

بالوں میں برش پھیرتے پھیرتے خود کو آئینے میں دیکھتے دیکھتے اس بیڈ روم میں موجود قیمتی فرنیچر اور خوب صورت آرائشی اشیاء تکتے تکتے وہ اس بے تحاشا خوشی کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو آرزوؤں کی تکمیل ہونے کی صورت میں وہ سوچا کرتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوشی تو وہ ہوتی ہے جو بے ساختہ ہوتی ہے زبردستی سوچ سوچ کر جو محسوس کی جائے، وہ کیا ہوتی ہے؟ سب کچھ مل جانے پر بھی اندر ایک خلا سا باقی کیوں رہ جاتا ہے۔ خواب پورے ہونے پر بھی پُر مسرت کا حصول ایک خواب کیوں لگتا ہے؟

اپنے خیالات میں گم اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کب جمال اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟" اس کی ریشمی زلفوں سے کھیلتا ہوا وہ پوچھ رہا تھا اس وقت تو وہ جو کچھ سوچ رہی تھی۔ خود ہی سمجھ نہیں پا رہی تھی تو جمال کو کیا بتاتی، مگر اس وقت جمال کے پوچھنے پر ایک سوال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں لپکا تھا۔

"جمال میں اس طرح کھلے عام تو باہر نہیں جا سکتی، کہیں کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو۔"

"اس کا حل بھی سوچ رکھا ہے میں نے۔" جمال مسکرایا۔

"کیا؟"

"نہ ہم یہاں رہیں گے نہ دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہوگا۔"

"پھر کہاں رہیں گے؟"

"اسلام آباد، میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔"

☆☆☆

سفید رنگ کا کڑکڑاتا شلوار قمیص، اس پر سیاہ واسکٹ، بال اپنے مخصوص انداز میں پیچھے کی طرف سیٹ کیے ہوئے۔ باڈی لینگویج سے بہت پُر اعتماد، آنکھوں کی گہرائیوں میں کہیں اضطراب ہلکورے لے رہا تھا۔ مگر وہاں تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اپنے حواریوں کو دائیں بائیں اور پیچھے کھڑا کر کے وہ خود درمیان میں کھڑا تھا اس کے آگے اخبارات اور ٹی وی چینلز کے مائک سجے ہوئے تھے۔ اس پریس کانفرنس کا اہتمام امداد بروہی نے کیا تھا۔

"آپ سب کو معلوم ہے کہ میرے بیٹے کا مقدمہ، اس وقت عدالت میں ہے۔ اس مقدمے کے دوسرے فریق ظفر صدیقی صاحب کی بیٹی پر فائرنگ کی گئی، خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہیں۔ میرے لیے بھی یہ خوشی کی بات ہے۔ بہن بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں، ہماری اپنی اسلامی مشرقی اور معاشرتی روایات ہیں۔ جس کے مطابق ہم آپس کے لڑائی جھگڑوں میں گھر کی خواتین کو نہیں گھسیٹتے، مردانہ وار لڑنے کے قائل ہیں اور عدالت میں لڑ رہے ہیں عدالت سے باہر اس معاملے کو میں ہرگز نہیں لاؤں گا۔ چاہے میرا بیٹا پھانسی کے تختے پر ہی کیوں نہ کھڑا ہو

www.pklibrary.com

میں ایسی گھٹیا حرکت کرنا تو درکنار اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس واقعے کی ایف آئی آر میرے خلاف کٹوائی گئی۔ میڈیا میں میرے خلاف بے بنیاد الزام تراشیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ جو سراسر یکطرفہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا موقف بھی آپ لوگ دکھائیں۔" امداد بروہی خاموش ہوا تو صحافیوں اور رپورٹرز کی طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"کہا جاتا ہے کہ شاہ زیب صدیقی پر فائرنگ آپ کے ایما پر ہوئی تاکہ ان کو پریشرائز کر کے یا ڈرا دھمکا کر صلح پر مجبور کیا جا سکے۔ اس خبر میں کتنی صداقت ہے؟"

"دیکھیے میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میں ایسی گھٹیا اور ذلیل حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور ویسے ایسا کام کون بے وقوف کرے گا جس کا براہ راست شک اس پر کیا جائے۔ یہ بات بھی سوچنے کی ہے ظفر صاحب ایک ایسے محکمے میں ہیں جہاں دوستوں سے زیادہ انسان دشمن بناتا ہے۔ کتنے ہی کرمنلز کے خلاف انہوں نے کارروائیاں کی ہیں۔ ان میں سے کئی آزاد ہیں۔ کون جانے یہ کس نے اپنی دشمنی نبھائی ہے؟ آج سے چار سال پہلے بھی ظفر صاحب پر فائرنگ ہوئی تھی۔ کیا وہ بھی میں نے کروائی تھی؟

حال ہی میں اس کیس کے اہم گواہ جان محمد کی بیٹی ایک ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوئی۔ کہا جا رہا ہے کہ جان محمد کو عدالت میں سچ بولنے کی سزا ملی ہے۔

خدا کو مانیں آپ لوگ، میں ایک شریف کاروباری شخص ہوں اور سیاست دان، میں کسی انڈر گراؤنڈ مافیا کا ڈان تو نہیں جو آج کسی پر فائرنگ کروا دوں، کل کسی کو مروا دوں، اب تو اس کیس سے متعلق کسی شخص کو اگر چھینک بھی آئے گی تو اس کا الزام بھی مجھ پر ہی ڈالا جائے گا۔" امداد بروہی کے لہجے میں سوچی سمجھی تلخی آ گئی۔

"مقتول شاہ زین کے ورثا جو خون بہا لینے پر راضی نہیں اگر عدالت نے آپ کے بیٹے کو سزائے موت سنائی تو آپ کیا کریں گے؟"

"ہم سپریم کورٹ میں جائیں گے۔ میں آخر تک، آخری لمحے تک لڑوں گا مگر عدالت کے اندر، قانون اور اخلاق کے دائرے میں رہ کر۔"

"جان محمد کی بیوی نے اپنی بیٹی کی موت کا الزام آپ پر لگایا ہے کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب تو وہ محترمہ خود ہی دے سکتی ہیں یا وہ ٹرک ڈرائیور جو اس معصوم بچی کو کچل کر ابھی تک مفرور ہے۔ آپ لوگ پولیس سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے کہ وہ اس مفرور ڈرائیور کو پکڑے۔ تاکہ سچائی سب کے سامنے آ سکے۔"

سب کا شکریہ ادا کر کے امداد بروہی نے پریس کانفرنس ختم کر دی۔

☆☆☆

بڑھی ہوئی شیو، میلے کچیلے کپڑے، اپنے بے تحاشا دکھتے ہوئے بدن کے ساتھ وہ اس گندی، غلیظ، دری پر پڑا ہوا تھا۔ جس میں بڑی تعداد میں کھٹمل چل رہے تھے۔ اس پر تعینات اہلکار بڑے فنکار تھے۔ مار پیٹ کے تشدد کے ایسے ایسے طریقے جانتے تھے کہ تکلیف درد اور اذیت جسم میں اپنی جگہ بنا لیتے مگر اس تشدد کا ایک بھی ظاہری نشان جسم پر نظر نہیں آتا۔ ایسی ہی مار پیٹ جھیل کر وہ ایک بار پھر اپنی کال کوٹھری میں پڑا کراہ رہا تھا۔ جب سے عدالت میں اس نے گولی خود نہ چلانے کا بیان دیا تھا۔ اس پر تشدد آئے دن کا معمول بن گیا تھا۔ امداد بروہی کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ ان ہاتھوں میں لمبائی دولت کی بھی تھی، ان ہاتھوں کی پہنچ ہر جگہ تھی۔ عدالت میں بھی اور تھانے میں بھی اور حیثیت کی بھی جان محمد کو سچ بولنے کا مزہ چکھایا جا رہا تھا۔

"آہ" کروٹ بدلنے میں اس کے منہ سے تو دردناک کراہ نکل گئی۔ "تو کس خوش فہمی میں تھی حاجرہ! اوہ دل ہی

www.pklibrary.com

دل میں بڑی بے بسی کے ساتھ اپنی بیوی سے مخاطب تھا۔ سچ بولنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا تو نے سمجھ رکھا تھا۔ ہم جیسے کمزور اور بے حیثیت لوگ سچ بولنے کی کوشش کریں تو بڑا برا انجام ہوتا ہے ہمارا، ایسا خوف ناک نتیجہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ بندہ جیتے جی مر جاتا ہے۔ میں کیوں تیری باتوں میں آ گیا۔ کیوں سچ بول دیا میں نے عدالت میں، میری بیٹی کو میرے سچ کی قیمت چکانی پڑ گئی۔ جان محمد کی نظروں میں بیٹی کا آخری بار دیکھا چہرہ گھوم رہا تھا۔ زرد چہرہ، سفید کفن میں لپٹا ہوا نماز جنازہ اور تدفین کے موقع پر اسے دو گھنٹے کے لیے سخت پہرے داری میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ آخری دیدار اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ بہن بیٹی کی عزت، حرمت، جان، کیسی قیمتی اور محترم ہوتی ہیں۔ اسے اب سمجھ میں آ رہا تھا وہ سب کچھ جو آج سے پہلے کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"اللہ، میرے اللہ، مجھے معاف کر دے۔ میرے گناہوں کی سزا میرے بیوی بچوں کو نہ دے۔ معاف کر دے۔" اپنی بیٹی کا چہرہ تصور میں لیے وہ زور زور سے رو رہا تھا۔ باآواز بلند اللہ سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

سپاہی کے بوٹوں کی مخصوص دھمک اس کی کوٹھری کے قریب آ رہی تھی اور وہاں آ کر وہ دھمک رک گئی۔

"کھانا لے لے۔" اس نے سلاخوں کے نیچے سے وہی کھانا سرکایا جو پچھلے کئی دنوں سے ایک جیسا ہی چلا آ رہا تھا۔ کہیں کہیں سے جلی کہیں سے کچی روٹیاں، جنہیں کھاتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ آٹے میں ریت یا مٹی ملا کر پکائی گئی ہیں۔ ایک کٹوری میں پتلی پانی سی دال جس میں دال کے دانوں سے زیادہ کنکر بھرے ہوتے۔ شدید بھوک میں وہ اس کھانے کو بھی زہر مار کر لیتا مگر اس وقت تو اسے اپنے بدن میں اتنی ہمت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ اٹھ کر وہ روٹی اور دال اپنے قریب کھسکا لیتا۔

☆☆☆

کتنے ارمانوں سے یہ گھر لیا تھا اس نے، کرائے پر تھا تو کیا ہوا۔ اپنے گھر کی طرح ایک ایک در و دیوار ایک ایک اینٹ کا خیال رکھا۔ کونا کونا سنوارا، سجایا، وہ تو پوری گرہستن بن گئی تھی۔ شوہر بھی تو اپنی ساری لاپروائی اور لاابالی پن چھوڑ کر کتنا ذمہ دار ہو گیا تھا۔

ایک چھوٹی سی دکان، گلی کے قریب ہی کرائے پر لے کر اس نے چائے خانہ کھول لیا تھا۔ گزارے لائق آمدنی ہو ہی جاتی تھی۔ کچھ اخراجات خصوصاً بچوں کے اخراجات تو نانی نے اپنے ذمے لیے ہوئے تھے۔ جب بھی چکر لگاتیں ڈھیروں مٹھائی، پھل، گوشت اور دوسری کئی اشیاء اپنے ساتھ لے آتیں، ترنم کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اس کے شوہر کا نکما پن ختم ہو گیا تھا۔ وہ ایک اچھا شوہر اور سب سے بڑھ کر اچھا باپ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جانے اس کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی یا یہ خوشیاں اسے راس نہ آئیں۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی زندگی برباد ہو گئی تھی۔ اماں اپنے ساتھ دو ملازم لائی تھیں وہی گھر کا سارا سامان ڈھو کر باہر کھڑی سوزوکی میں رکھ رہے تھے۔ ترنم کو تو اپنا ہی ہوش نہ تھا۔ دونوں بچے الگ سہمے ہوئے تھے۔

"اب کیا ہوگا۔" روتے روتے اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"خود کو سنبھال ترنم! ورنہ بچوں کو کون سنبھالے گا۔" ان کے جہاندیدہ اور تجربہ کار چہرے پر تفکرات کی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ پریشانی نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ غم تو انہیں بھی تھا۔ مگر ترنم کا غم ان کے غم سے بڑا تھا۔ اس کے سر کا سائیں چلا گیا تھا۔ اس کے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ بچے یتیم ہو گئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے باپ سے محروم ہو گئے تھے۔ ترنم کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں کے سوتے ابل پڑے۔ کیسے اچانک سے چل دیا تھا وہ بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ سنے، جھٹ پٹ آنکھیں موند کے وہ چٹ پٹ ہو گیا۔ بہانہ بنا ہارٹ اٹیک کا۔

ایسی کیا بات تو نے دل پہ لے لی جو دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔ روتے روتے ترنم سوچ رہی تھی۔

www.pklibrary.com

سارا سامان لوڈ ہو چکا تھا۔ بچے الگ کھڑی ٹیکسی میں بٹھا دیے گئے تھے۔ ماں نے ترنم کا ہاتھ پکڑا۔

"چل اٹھ، اب کوئی نہیں اس گھر میں تیرا۔" ان کے لہجے میں اداسی تھی۔

"ماں۔" ترنم بلبلا کے ایک بار پھر رو دی۔ آخری بار اس نے حسرت کی ایک نظر اس گھر پر ڈالی اور ماں کے سہارے باہر نکل آئی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے بیٹھتے بھی اس کے آنسو تھمتے نہیں تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی ٹیکسی چل پڑی۔ شیشے کے دروازے کے پار جاتی ہوئی ٹیکسی اور اس کے مسافروں کو خلیل نے بھی دیکھا اور ایک آہ بھری۔

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھی"

☆☆☆

اون کا گولہ اور ادھ بنا سوئٹر، تھیلی کے اندر تھا۔ ان کے ہاتھ میں سوئٹر بننے کی سلائیاں تھیں۔ جن کی مدد سے وہ بڑی مہارت سے پھندے گرا رہی تھیں۔ اٹھا رہی تھیں۔ سامنے ہی شریفہ خاتون بیٹھی بتھوے کا ساگ بنا رہی تھی۔ شریفہ خاتون، امی کی کچن ہیلپر تھی۔ کھانا بنانے میں اسسٹنٹ کا کردار ادا کرتی تھی۔

"شریفہ، ساگ ٹھیک سے بنانا، پچھلی بار پتوں کے ساتھ ساتھ پھول بھی توڑ کر ڈال دیے۔ ساری ہنڈیا کڑوی ہو گئی۔" گو کہ دادی نے اسی لیے اپنے سامنے بٹھایا ہوا تھا کہ شریفہ خاتون کی کارکردگی پر نظر رکھ سکیں مگر پھر بھی تنبیہ کرنا بھی ضروری سمجھا۔ وہ محترمہ لاتوں کی تو نہیں مگر باتوں کی بھوت ضرور تھیں۔ بول بول کر اور سمجھا سمجھا کر کام کروانا پڑتا تھا مگر اس سے قطع نظر شریفہ میں وہ خوبیاں تھیں جو عموماً کمیاب ہی ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ محنت سے نہیں گھبراتی تھی اور ایماندار بھی تھی یعنی نہ کام چور تھی نہ ہاتھ کی لیک۔ اس کی یہ دو خوبیاں ہزار خامیوں پر بھاری تھیں۔ اس وقت بھی وہ دادی کی ہدایت پر بڑی تابعداری سے سر ہلا رہی تھی۔

"کس کا سوئٹر بنا رہی ہیں دادی؟" سب کی دیکھا دیکھی وہ بھی انہیں دادی ہی کہتی تھی۔ جس پر دادی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"فروا کے دولہا کے لیے بنا رہی ہوں، پہلے فروا کا بنایا تھا اب ان کے دولہا میاں کی باری ہے۔ خیر سے شادی ہو جائے گی ان کی بیاہ کر دور چلی جائیں گی۔ نئے نویلے دولہا دلہن کو اپنے ہاتھ سے بنا تحفہ دینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔"

"آپ تو بچوں کے لیے بھی بنا بنا کر دیتی رہتی ہیں۔" شریفہ خاتون پچھلے تین سال سے ان کے معمولات دیکھ رہی تھی۔ سبزی کے ساتھ ساتھ باتیں بھی بنانے لگی۔

"شوق ہے ہمارا۔ اس شغل میں وقت بھی کٹ جاتا ہے۔ اب خالی بیٹھا کیا کرے۔ اس کوٹھی کے اناج اس کوٹھی دھرے، تو بھئی ہمیں تو اس طرح کے کاموں میں مزہ نہیں آتا۔ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ بیکار باش کچھ کیا کر، کچھ نہیں تو کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر۔" سلائیوں کے ساتھ ساتھ دادی کی زبان بھی چل پڑی۔

"دادی، بازار میں ایک سے ایک ڈیزائن کے سوئٹر ملتے ہیں اب تو نئے نئے فیشن کے، بے کار میں آنکھیں کیوں پھوڑتی ہیں آپ۔" شریفہ خاتون چنتے ہوئے ساگ کی گڈی بنا کر اسے چھری سے کترنے لگی۔ ساتھ ساتھ دادی کو مشورہ بھی دے ڈالا۔ وہ مسکرا دیں۔

"ہاں ملتے ہیں۔ ہر فیشن اور ہر ڈیزائن کے سوئٹر بازار میں موجود ہیں مگر ہمارا تو بس وہی مزاج ہے کہ بلخ نہ بخارے، جو مزا چھجو رے چوبارے تو بھئی ہمیں تو محنت کر کے تحفہ دینے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اچھا لگتا ہے لینے والوں کو بھی یہ تحفہ بھی اچھا ہی لگتا ہوگا۔"

"کیوں نہیں لگتا ہوگا جی، کوئی اتنی محبت اور محنت کے ساتھ تحفہ دے تو اچھا ہی لگتا ہے۔ عزت افزائی اور قدر دانی محسوس ہوتی ہوگی لینے والوں کو۔" دبلی پتلی سانولی سی شریفہ خاتون اپنی دھن میں بولے چلی گئی اور دادی

ناک کی پھننگ پر چشمہ لگا کر اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ شریفہ خاتون، تم نے بڑے اچھے لفظوں میں بڑی اچھی بات کہی۔" دادی کے لہجے میں ستائش تھی۔ شریفہ خاتون شرما سی گئی۔

"آپ ہی لوگوں سے سیکھا ہے اس طرح بولنا۔"

"تم سے پہلے اور بھی کام کرنے گئی ہیں۔ کسی نے کچھ نہیں سیکھا۔ برسات میں اسی زمین میں سبزہ اگتا ہے جو زرخیز ہوتی ہے۔" دادی کی دوبارہ تعریف پر وہ پھر شرما گئی۔

"آپ بہت اچھی ہیں دادی، میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہیں۔ میری ساس کی طرح تو نہیں کہ ہر وقت انگارے چبائے رہتی ہے۔ جب بھی منہ کھولتی ہے آگ ہی نکلتی ہے منہ سے۔" شریفہ خاتون نے گڈی کے ساتھ ساتھ منہ بھی بنایا۔ "وہ کیا کہتی ہیں آپ کہ بندہ گڑ نہ دے۔ گڑ کی سی بات کہہ دے۔"

شریفہ خاتون سر جھکائے بولے چلی جا رہی تھی اور دادی اپنی انگلی دانتوں میں دبائے دنگ رہ گئی تھیں۔ ایسے بولنا تو ان کے پوتے پوتیوں نے بھی نہیں سیکھا تھا۔

☆☆☆

"ہیلو" کہہ کر موبائل کان سے لگایا تھا۔ دوسری طرف سے بات سن کر ان کا چہرہ یکایک زرد ہو گیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھیں مگر انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی ٹانگیں بے جان ہو گئی ہیں۔ وہ اٹھیں گی تو ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیں گی۔ ہاتھ یکایک ہی ٹھنڈے ہو کر کپکپانے لگے۔ بمشکل انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل برابر میں موجود چھوٹی میز پر رکھا اور ملازمہ کو آواز دی۔

"جی۔" وہ کچن میں تھی ایک آواز پر فوراً آ گئی۔

"ایک گلاس پانی لانا۔" گلے سے آواز بھی بمشکل نکلی تھی۔

ملازمہ پانی کا گلاس لائی تو وہ اسی حالت میں بیٹھی تھیں جس میں چھوڑ کر گئی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے صغریٰ نے تشویش سے انہیں دیکھا۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"ہاں ہاں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بمشکل اپنے کانپتے ہاتھ کو قابو کر کے پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

"بے چاری، جوان بیٹے کی موت نے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا کتنی جوان سی دکھتی تھیں پہلے لگتا ہی نہیں تھا کہ ان کے جوان جوان بچے ہیں۔" سکینہ نے ترحم سے انہیں دیکھا۔

"ڈاکٹر کو فون کر دوں یا بڑے صاحب کو؟" صغریٰ نے پانی کا گلاس ان کے ہاتھ سے لیا جو وہ آدھا پی کر اس کی طرف بڑھا رہی تھیں۔

"نہیں میں اب ٹھیک ہوں۔ چکر سا آ گیا تھا۔ شانزے کہاں ہے؟"

وہ تین گھونٹ پانی پی کر انہوں نے خود پر تھوڑا سا قابو پا لیا تھا۔

"شانزے بی بی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"اچھا، ہاں میں بھی تو نماز ہی پڑھنے جا رہی تھی۔" معاً انہیں یاد آیا وہ وضو کرنے جا رہی تھیں جب ان کا موبائل بجا تھا۔ اور دوسری طرف سے کہنے والے نے فقط ایک جملہ کہا تھا مگر وہ ایسا تھا کہ اسے سن کر ہی وہ چکرا گئیں۔ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھیں۔

☆☆☆

حالانکہ کھانا پکانے کے لیے کک موجود تھا مگر وہ پھر بھی کچن میں گھس جاتی۔ خالہ منع ہی کرتی رہ جاتیں مگر وہ

www.Pklibrary.com

اپنی من مانی کر ہی لیتی۔ آج بھی وہ ایسے ہی کچن میں گھس گئی، اور خالہ حسب توقع اسے منع کرنے لگیں۔

"پلیز مجھے کچھ تو کرنے دیں۔ پاگل ہو جاؤں گی میں یوں فارغ رہ رہ کر۔" عائشہ نے ان کے آگے سچ مچ ہاتھ جوڑ دیے تو وہ ہنس پڑیں۔

"اچھا چلو، کوئی ایسی چیز بناؤ جو آپا شوق سے کھاتی تھیں۔" خالہ نے فرمائش داغ دی۔

"امی کی پسندیدہ ڈش؟" عائشہ پہلے تو سوچ میں پڑ گئی پھر اس کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"ہمارے گھر میں جو بھی کچھ پکتا تھا وہ میری یا امی کی پسند کے حساب سے نہیں بلکہ ہمارے بجٹ کے حساب سے پکتا تھا اور بجٹ کے حساب میں فقط دو تین دالیں اور اتنی ہی اقسام کی سبزیاں تھیں جو ادل بدل کے پکتی تھیں۔" عائشہ بتاتے بتاتے افسردہ سی ہو گئی۔

"آئی ایم سوری بیٹا، میں نے تو بس یونہی کہہ دیا تھا۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" خالہ یکدم شرمندہ سی ہو گئیں۔

"ارے نہیں، میں تو بس یونہی۔" عائشہ ان کے شرمندہ ہونے پر اور سوری بولنے پر بوکھلا سی گئی۔ پھر جیسے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔

"دراصل امی کا ذکر آتے ہی میں ایسے ہی جذباتی سی ہو جاتی ہوں، ویسے" عائشہ نے نظر اٹھا کر خالہ کو دیکھا۔

"امی کو ماش کی دال بہت پسند تھی مگر اس ملک خداداد میں ایک بار وہ بھی اتنی مہنگی ہو گئی کہ ہم اسے کھانے کے بجائے کبھی کبھی یاد کر لیا کرتے تھے۔ قیمہ بھرے کریلے بھی بہت اچھے لگتے تھے انہیں۔ احمد بھائی کی بھی فیورٹ ڈش تھی۔ پھر بھائی کی ڈیتھ کے بعد ہمارے گھر یہ ڈش کبھی نہیں بنی۔" عائشہ اپنی رو میں بولتی چلی گئی پھر اچانک اسے احساس ہوا تو مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے خالہ سے کہنے لگی۔

"آج میں ان کی فیورٹ چٹنی بنا کر کھلاتی ہوں آپ کو۔ اس چٹنی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مرچیں کم ہوتی ہیں اور کسی بھی اضافی ڈش کے بغیر فقط اس چٹنی کو ہی سالن کی جگہ کھایا جا سکتا ہے۔"

"ارے واہ، چلو پھر بناؤ جلدی سے۔" خالہ بھی مسکرا دیں۔

"پھر میں کک کو منع کر دوں؟"

"کیا؟"

"سالن بنانے سے۔" خالہ بدستور مسکرا رہی تھیں اور عائشہ ہنس پڑی۔

☆☆☆

خشخشی داڑھی، دبلا پتلا سراپا۔ سفید شلوار قمیص سر پر سفید ہی ٹوپی، کامل صاحب تھے تو سید صاحب کے دوست اور پڑوسی مگر دیکھنے میں ان کے بھائی ہی لگتے تھے۔ تقریباً روز کا ہی ملنا تھا۔ مگر آج کل تو کامل صاحب ان کی دلجوئی کے لیے تقریباً روز ہی ان کے گھر عصر کے بعد آتے اور مغرب کی نماز ان کے ساتھ پڑھنے جاتے۔

"بس صاحب، پالنے والا، غم بھی دیتا ہے تو اس کے پیچھے خوشی بھی لگا دیتا ہے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ غم ہلکا ہوتا جاتا ہے اور پیچھے آنے والی خوشی ابھر کر سامنے آ کے اپنا رنگ جماتی ہے۔" کامل صاحب خوشی، غم، موت اور زندگی کا فلسفہ اپنے الفاظ میں بولتے رہتے اور سید صاحب کبھی غور سے اور کبھی عدم توجہی سے انہیں سنتے رہتے۔

جوان اولاد کا غم بھلانا آسان نہیں ہوتا۔ جن کاندھوں پر انہیں بٹھا کر سیر کرائی ہو، ان ہاتھوں سے اولاد کا لاشہ اٹھانا، اپنے کندھوں پر اٹھا کر ان کی آخری آرام گاہ لے جانا، آخری بار اس چہرے کا دیدار کرنا جو روز دیکھنے کے عادی ہوں۔ ان سب کی اذیت اور تکلیف تو وہی محسوس کرتا ہے۔ جو اس آگ سے گزرا ہو۔ کہتے ہیں کہ جس جگہ آگ جلتی ہے وہیں زمین گرم ہوتی ہے۔ ان کی تکلیف اور اذیت اس لیے بھی دوچند ہو گئی تھی کہ وہ تو اپنی

www.pklibrary.com

بیٹی کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکے۔ بس ایک تابوت مل گیا تھا سرکار کی طرف سے۔ لانے کے لیے جمال نے ہی ساری بھاگ دوڑ کی تھی۔ باقی سب کی تو ہمتیں جواب دے گئی تھیں۔ رہ رہ کر ان کے اندر ٹیس سی اٹھتی تھی۔ ہائے یہ جوان اولاد کا غم۔

''بہت کوشش کر لی کامل بھائی! مگر ابھی تک دل بے چین رہتا ہے اللہ سے کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے۔ جو اس کی مرضی، ہم اس پر راضی مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں۔ اندر ہی اندر ایک......'' وہ بولتے بولتے رک گئے پھر بے بسی سے مسکرائے۔

''میں خود بھی نہیں جانتا۔ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ کیوں کر رہا ہوں۔''

''ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ غم ابھی تازہ ہے۔ اس لیے ایسا محسوس کر رہے ہیں آپ، صبر بھی اک دم نہیں آتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہی آتا ہے۔''

کامل صاحب نے انہیں تسلی دیتے ہوئے لگے ہاتھوں مشورہ بھی دے ڈالا۔

''میری مانیں تو جتنی جلد ممکن ہو سکے۔ گھر میں بہو لے آئیں۔ گھر کی ویرانی بھی ختم ہو جائے گی۔ آپ لوگوں کی پریشانی بھی۔ کسی کی بیٹی کو اپنی بیٹی کا پیار دیں گے تو اپنی بیٹی کا غم بھلانا آسان ہو جائے گا۔''

''کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔ میں تو پہلے ہی اسی کوشش میں تھا کہ عارف کا گھر آباد ہو جائے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔''

''ارے صاحب ہمارا کیا ہے ہم تو چراغ سحری ہیں۔ آج ہیں کل ہوں نہ ہوں امید پر دنیا قائم ہے۔ کون جانے کس کا بلاوا پہلے ہے۔ کس کا بعد میں آج کل تو یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہم جیسے بڈھے بیٹھے رہ جاتے ہیں اور جوان ہماری آنکھوں کے سامنے سے نکل جاتے ہیں۔ بوڑھے کاندھوں پر جوانوں کے لاشے قبرستان جا رہے ہیں۔ ارے صاحب سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اللہ برے وقت سے۔ بری گھڑی سے ہم سب کو بچائے۔''

کامل صاحب بولتے بولتے جذباتی ہو گئے تھے۔

☆☆☆

میک اپ کے بغیر سادہ سا چہرہ، عجیب سا لگ رہا تھا مگر صرف خود اسے، جہاں وہ آئی تھی۔ انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ اپنے تام جھام اور لوازمات کے ساتھ آئی ہے یا یونہی اپنے اصل روپ کے ساتھ۔

یہ ایک درمیانے درجے کا ریسٹورنٹ تھا نہ بہت مہنگا اور عالیشان اور نہ ہی کوئی سستا ڈھابہ۔ اس نے خود ہی جگہ منتخب کر کے چاچا کو بلایا تھا۔ چاچا وقت پر پہنچ گئے تھے۔ وہ آئی تو اندر گھستے ہی چاچا کونے والی میز سنبھالے نظر آ گئے اسے۔ کالی چادر میں چہرہ چھپائے وہ سیدھی انہی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے غور سے چاچا کو دیکھا۔

''تم تو بڈھے ہوئے جا رہے ہو چاچا۔'' اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں اس نے تبصرہ کیا تو چاچا ہنس پڑے۔

''اب کیا جوانی آئے گی۔ دوبارہ؟ ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ بڈھے ہی ہوتا ہے۔ پھر قبر میں چلے جاتا ہے۔''

''ابھی جلدی نہ کرو قبر میں جانے کی، میری امانت ہے تمہارے پاس، اسے کسی ٹھکانے سے کر دینا پہلے، پھر لیٹنا قبر میں۔'' چاچا کو نصیحت کے بعد اس نے ویٹر کو دو چائے کا آرڈر بھی کر دیا۔

''کوشش تو یہی کرتا ہوں۔ سمجھاتا رہتا ہوں۔ پر کبھی کبھی وہ بھی تیری طرح ہی لگتا ہے الٹی کھوپڑی کا۔''

''میں اپنی تعریفیں سننے نہیں آئی تمہارے پاس، یہ بتاؤ'' چند لمحے چپ رہنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''کیسا ہے وہ؟''

www.pklibrary.com

"ٹھیک ہے۔ اپنے کام میں ماہر ہے۔ اور بس کام میں ہی خود کو لگائے رکھتا ہے۔"
"کچھ پوچھتا تو ہوگا۔"
"سوالوں کا راستہ شروع میں ہی بند کر دیا تھا۔ اب کیا پوچھے گا بس یہ ہے کہ اپنے من کی باتیں کر لیتا ہے۔ سارے دکھ سکھ کہہ دیتا ہے مجھ سے۔ یہ اچھی بات ہے کہ اندر ہی اندر سلگتا نہیں رہتا۔ لیکن میرے علاوہ کسی اور پہ اپنے دو الفاظ بھی خرچ کرنا حرام سمجھتا ہے۔" چاچا اس طرح بولے کہ وہ ہنس پڑی۔
"تم سے تو بولتا ہے نا، خیر ہے۔" ہنسی پر قابو پا کر وہ بولی۔
"نہیں یہ عادت ٹھیک نہیں، میں نہیں رہا تو کیا گونگا بن کر زندگی گزارے گا۔" چاچا نے نفی میں سر ہلایا۔
وہ خاموش ہوگئی۔ اتنی دیر تک چپ بیٹھی رہی کہ چاچا کو لگا اب بھی بولے گی ہی نہیں۔
"اللہ خیر کرے گا۔ اس کی قدرت اور مصلحت کون سمجھ سکتا ہے۔ کب کس کا دل بدل دے اور کس کی زندگی کیا بنا، لوجائے یہ۔" چاچا نے بولتے بولتے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔
"ارے، آپ وہی ہیں نا شاہ میر کے چاچا، السلام علیکم۔"
پرجوش سی، جانی پہچانی آواز سن کر چاچا چونک پڑے۔ گردن اٹھا کر دیکھا تو فوراً پہچان گئے۔ یہ وہی تھی۔ بلکہ یہ دونوں وہی تھیں۔ اس دن آفس میں جن سے وہ تھوڑی سی باتیں کر کے آئے تھے۔
"ہاں میں وہی ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا۔
"بیٹھو۔" انہوں نے رسماً دعوت دی۔
"نہیں نہیں، ہماری دو سہیلیاں اور بھی آئی ہیں ہم لوگ وہاں بیٹھے ہیں۔" ماریہ نے تھوڑی دور ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ "دراصل میں دانیہ سے کہہ رہی تھی کہ آپ وہی ہیں شاہ میر کے چاچا، مگر یہ مان نہیں رہی تھی۔ اس لیے اسے پکڑ کر لائی ہوں تصدیق کے لیے۔ چلیں آپ چائے پئیں۔ ہم چلتے ہیں۔" ماریہ جیسے اچانک آئی تھی ویسے ہی چل دی۔ چاچا اسے جاتا دیکھتے رہ گئے۔
"میں بھی چلتی ہوں،" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، میں یہیں بیٹھا ہوں۔" چاچا کسی سوچ میں گم تھے۔
☆☆☆
ہاف فرائی انڈا، فرائی پین سے پلیٹ میں نکالا، ٹوسٹر میں توس سک گئے تھے۔ نکال کر ٹرے میں رکھے۔ نمک، کالی مرچ، سلیقے سے ایک طرف رکھی۔ ساری چیزیں وہ ڈائننگ ٹیبل پر لائی جہاں پہلے سے ہی موسمی کا تازہ جوس وہ رکھ چکی تھی۔ جمال کے لیے چائے دم پر تھی۔
"آئی ایم سوری یار، تمہیں کام کرنا پڑ رہا ہے۔ دراصل اکیلے پن کی وجہ سے مستقل کوئی ملازم نہیں رکھا کہ میں گھر پر ہی کم ہوتا تھا۔ بزنس کی وجہ سے آئے دن باہر ہی رہتا تھا۔ گھر تو گھر والی سے ہی بنتا ہے اب تم آگئی ہو تو ملازم بھی آجائیں گے۔" جمال کا لہجہ معذرت اور محبت سے بھرپور تھا۔
"کوئی بات نہیں، میں تو عادی ہوں کام کرنے کی، اور یہ تو اتنا خوب صورت کچن ہے کہ کام کرنے جا بھی نہیں چاہتا۔ ورنہ پہلے تو میں اتنے پھٹیچر کچن میں بھی کام کرتی رہی ہوں۔" نائلہ ابلا ہوا انڈا چھیل کر ٹکڑے کر کے اس پر نمک کالی مرچ چھڑک رہی تھی۔
"پرانی عادتیں پرانی زندگی کے ساتھ ہی دفن کر دو، اب تم میرے گھر پر ہو میرے پاس، یہاں صرف حکم چلانے کی زحمت کرو اور بس۔"
جمال کی انہی باتوں اور اداؤں پر وہ مرتی تھی۔ کیسی انمول چاہت تھی اور کیسی خوبصورت زندگی تھی۔ نائلہ کو

www.pklibrary.com

خود پر رشک آرہا تھا۔ جمال اس سے کہہ رہا تھا کہ یہ خوب صورت ہاتھ کام کرنے کے لیے نہیں ہیں، یہ دلکش چہرہ اور سحر انگیز سراپا کچن کی نذر ہونے کے لیے نہیں ہے۔ نائلہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اوپر اوپر اور اوپر......

☆☆☆

کھانے کی میز کے گرد سب خاموشی سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پہلے کبھی ذائقے اور مزے کے لیے کھاتے تھے۔ اب فقط جینے کے لیے تھوڑا بہت پیٹ بھر لیتے تھے۔ ظفر صاحب کھانے کے دوران گاہے گاہے اپنی شریک حیات کو دیکھ رہے تھے۔ جنہوں نے بہت جتن کر کے خود کو پر سکون رکھنے کی کوشش کی تھی مگر ان کا چہرہ اس سمندر کی مانند ہو گیا تھا جو بظاہر پر سکون ہوتا ہے مگر اندر ہی اندر اس میں اضطراب کی لہریں مچل رہی تھیں۔ ان کی زیرک اور عقابی نگاہوں سے سمندر کے اندر کا طوفان پوشیدہ نہیں رہ سکا۔

پچھلے مہینوں سے ان کے گھٹنوں میں تکلیف تھی۔ جس کی دوائی وہ باقاعدگی سے لے رہی تھیں۔ رات میں معمول کے مطابق دوائی کھا کر پانی پی رہی تھیں جب شوہر نے آہستہ سے ان سے سوال کیا تھا۔

"آج کیا ہوا تھا؟"

وہ چونک گئیں۔ کچھ دیر خاموش رہیں پھر ان کے لب کپکپانے لگے۔

"چھوڑ دیں، سب کچھ چھوڑ دیں۔ اللہ پر چھوڑ دیں سب کچھ۔ عدالتوں سے انصاف ملتے اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ پہلے والا غم پرانا ہو جاتا ہے اور ایک نیا غم مل جاتا ہے۔" وہ یک دم ہی ہذیانی ہو گئیں۔

"مقدمہ واپس لے لیں۔ ہم نہیں لڑ سکتے۔ اتنی طاقت ہم میں نہیں ہے کہ اس طاقت کا مقابلہ کریں۔" ان کی ہذیانی کیفیت آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ وہ رو رہی تھیں اور بری طرح رو رہی تھیں۔

"میں نے آپ کا موبائل چیک کیا تھا۔ نامعلوم نمبر سے ایک کال بھی شام کی۔ کیا کہا تھا اس شخص نے جس نے فون کیا تھا۔" ایک جوار بھاٹا تو ظفر صاحب کے اندر بھی اٹھ رہا تھا مگر انہوں نے خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔ اتنا تو وہ پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے جو ان کی اہلیہ کے چہرے پر رقم تھی۔

اہلیہ نے ایک نظر شوہر کو دیکھا، ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"کیا دھمکی دی ہے؟" ظفر صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

"میں مزید یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک کا زخم زندہ در گور کر گیا ہے مزید یہ زخم نہیں کھا سکتی۔ اس نے بھی یہی کہا تھا۔" ان کے کانوں میں وہ سرد آواز اور سفاک لہجہ گونج رہا تھا۔

"بیٹے کو کھویا اب کیا بیٹی کو بھی کھونے کا ارادہ ہے؟"

☆☆☆

نیلا کرتا، سفید شلوار اور چہرے پہ ہلکی سی داڑھی، لمبا اور دبلا پتلا سراپا۔ اسے دیکھتے ہی سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ آتا ہی اس وقت تھا پلے ٹائم میں۔ ہاتھ میں پکڑی ساری چاکلیٹس آن کی آن میں تقسیم ہو گئیں۔

"آئس کریم نہیں لائے۔" پانچ سالہ علی کی آنکھوں میں ہی نہیں چہرے پر بھی بہت معصومیت تھی۔

"اگلی بار ضرور لاؤں گا۔" شاہ میر نے علی کو گود میں اٹھا لیا۔

"پکا وعدہ؟" علی نے یقین دہانی چاہی۔

"پکا وعدہ۔" شاہ میر نے سر ہلایا۔

"آپ میری برتھ ڈے میں نہیں آئے۔" ننھے نبیل نے شکوہ کیا۔

"اوہ اوہ......" شاہ میر نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھا۔

"سوری یار، میں بالکل ہی بھول گیا کہ۔" شاہ میر کا لہجہ متاسف تھا۔

www.pklibrary.com
Monthly Shuaa October 2019

"اچھا ایسا کرتے ہیں کہ اگلی بار کیک لے کر آؤں گا پھر ہم دوبارہ تمہاری برتھ ڈے کا کیک کاٹیں گے ٹھیک ہے۔"

"دوبارہ برتھ ڈے ہوگی؟" نبیل کی آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگانے لگیں۔

"دوبارہ برتھ ڈے اور گفٹ۔" شاہ میر نے اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیر دیں۔

تھوڑی دیر بچوں سے باتیں کر کے وہ انتظامیہ کے آفس چلا گیا۔ اب کی بار اس کی دی ہوئی رقم پہلے سے زیادہ تھی۔

"ترقی ہوگئی ہے شاہ صاحب۔" گھنی داڑھی والے ضمیر بھائی نے رسید بناتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی!" ہمیشہ کی طرح مختصر جواب دے کر اس نے رسید لے کر جیب میں رکھی اور وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

الماری سے زیورات کے ڈبے نکال کر انہوں نے بیڈ پر رکھے اور انہیں کھولنے لگیں۔

"اس وقت کیا کر رہی ہیں آپ؟" شوہر نامدار جو سونے کے لیے لیٹ کر آنکھیں بند کر چکے تھے۔ کھڑپڑ کی آوازیں سن کر چونک پڑے۔

"زیورات دیکھ رہی تھی۔ کبھی سوچتی ہوں کہ تڑوا کر نئے ڈیزائن کے بنوا دوں فروا کو، پھر یہ خیال آتا ہے کہ پہلے وقتوں کے بنے ٹھوس اور پائیدار زیور ہیں اب تو ایسی چیز ملنا بھی محال ہے۔" عالیہ بیگم ایک بھاری جڑاؤ کنگن ہاتھ میں لیے اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"فروا سے پوچھ لو۔ اسے کیا پسند ہے۔" شوہر صاحب نے مشورہ دیا۔

"اس نے تو سب میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اسے یہ پرانے ڈیزائن پسند ہیں۔ اینٹیک پر جان دیتی ہے وہ۔"

"رہنے دیں پھر، ایسے ہی دے دیں۔"

"سارے تو نہیں دوں گی۔ ایک سیٹ اس میں سے لوں گی۔ یہ کافی بھاری ہیں اور ایک چین لاکٹ کا سیٹ اور چوڑیاں، کنگن فروا کی پسند سے لے لیں گے۔ باقی زیورات میں ماورا، مانی اور ماریہ کا حصہ بھی تو ہے۔" ایک ایک زیور کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سب کے حصے لگا رہی تھیں۔

"ارے ہاں، یاد آیا۔ وہ کیا ہوا مانی کے معاملے کا، دوبارہ گئی تھیں آپ وہاں؟"

"نہیں، میرا تو کوئی ارادہ نہیں تھا وہاں جانے کا، اور پھر ماریہ نے بتایا ہے کہ ان خاتون کا اچانک ہارٹ اٹیک کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی بیٹی کو خالہ اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ قدرت نے یہ معاملہ خود ہی ختم کر دیا اور ویسے آپ کو اس وقت کیا خیال آ گیا۔ جس راہ جانا نہیں اس کے کوس کیا گننے۔" عالیہ بیگم نے بڑا تفصیلی جواب دیا تھا انہیں۔

"بچے بڑے ہو جائیں تو ان کی خوشی اور مرضی بھی دیکھنی پڑتی ہے۔" وہ کچھ سنجیدہ ہو چلے تھے۔

"کیا آپ سے کچھ کہا ہے مانی نے؟" زیورات ایک طرف کر کے وہ پوری طرح شوہر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ کچھ کہتا ہی نہیں۔ آپ نے غور نہیں کیا، کتنا سنجیدہ اور خاموش رہنے لگا ہے۔ ورنہ پہلے کتنا چہکتا رہتا تھا۔ اب تو اس کا کھانے پینے کا شوق بھی ماند پڑ گیا ہے۔ بہنوں سے تکرار اور لڑنا جھگڑنا بھی چھوڑ دیا۔" بولتے بولتے وہ افسردگی سے مسکرائے۔

عالیہ بیگم کچھ دیر شوہر کی طرف دیکھتی رہیں پھر بولیں تو ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تو کیا ان سب باتوں کی وجہ وہ لڑکی ہے؟ آپ بھی بس بیٹھے بیٹھے ایران توران کی ملاتے رہتے ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاہ زین اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اس کے ناگہانی قتل پر وہ بہت اپ سیٹ ہوا

www.pklibrary.com

ہے۔ پھر اب ماشاء اللہ جاب کرنے لگا ہے عملی زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ ٹین ایج کی شوخیاں، مستیاں اور شرارتیں اس عمر کے ساتھ ہی کم ہوجاتی ہیں یا ختم ہوجاتی ہیں۔ رہی بات کھانے پینے میں کمی کی تو خود کو فٹ رکھنا اچھی بات ہے۔ موٹاپا کوئی صحت کی علامت تو نہیں بلکہ بیماریوں کا گھر ہے۔"
عالیہ بیگم نے ان کے ہر سوال کا شافی جواب دے کر ان کا منہ بند کردیا تھا۔

☆☆☆

"میرے پاس ایک ٹپ ہے آپ کے لیے۔"
"کہیے۔"
"جس ٹرک ڈرائیور نے جان محمد کی بیٹی کی جان لی۔ اس کی موبائل ریکارڈنگ اکبر کے ساتھ میرے پاس ہے۔ اکبر کو تو جانتے ہی ہیں آپ۔"
"اچھی طرح جانتا ہوں۔ ویسے اس ریکارڈنگ میں کیا ہے؟"
"اس ڈرائیور اور اکبر کی بات چیت، ایک منٹ ٹھہریں۔ میں سنواتا ہوں آپ کو۔"
چند لمحوں بعد ایک اجنبی مردانہ آواز آئی۔ جس کا لہجہ غیر مقامی اور آواز کھردری تھی۔
"کام ہوگیا ہے۔ لڑکی مرگئی ہے۔"
"گڈ، اب تم کہاں ہو؟ (یہ آواز انہوں نے پہچان لی، امداد بروہی کے خاص کارندے اکبر کی تھی)
"ام روپوش ہے۔ اماری باقی پے منٹ؟"
"دو گھنٹے میں مل جائے گی۔ جگہ بتاؤ۔"
"وہی پہلے والی۔"
اس کے ساتھ ہی کال ختم ہونے کی مخصوص آواز آئی اور اب لائن پر طلال تھا۔
"اب کہیے کیا حکم ہے؟"
"یہ ریکارڈنگ مل سکتی ہے مجھے؟" ظفر صاحب کے لہجے میں اضطراب تھا۔
"اسی خدمت کے لیے تو رابطہ کیا ہے آپ سے۔"
"اس کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟" وہ ایک تجربہ کار پولیس آفیسر تھے اچھی طرح جانتے تھے کہ طلال جیسے لوگ مفت میں کسی کو اپنا بخار بھی نہیں دیتے۔
"میرا معاوضہ ہے ولی شاہ کا جیل میں سڑنا پھر پھانسی کے تختے پر چڑھنا۔" طلال کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھر گئی۔
"دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے۔"

☆☆☆

نماز پڑھ کر اس نے دیر تک خدا کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رکھے۔ دعا مانگ کر فارغ ہوئی تو رگ و پے میں ایک سکون اور اطمینان کا احساس تھا۔ جائے نماز تہہ کر کے جگہ پر رکھی اور لاؤنج میں آگئی جہاں خالہ ملازم کی مدد سے قیمتی پینٹنگ دیوار پر آویزاں کررہی تھیں۔
وہ صوفے پر بیٹھ کر انہیں دیکھتی رہی۔ پینٹنگ لگ گئی۔ ملازم باہر چلا گیا اور خالہ ہاتھ جھاڑ کر اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئیں۔
"کیا ہو رہا ہے بھئی؟"
"آپ سے ایک بات کہنی تھی؟" عائشہ جھجکتے ہوئے خالہ سے مخاطب ہوئی۔

www.pklibrary.com

''ہوں!'' وہ شاید تھک گئی تھیں۔ آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی ہوئی تھی انہوں نے۔
''مجھے اپنے پرانے محلے جانا ہے۔ پڑوس والی خالہ کے گھر۔''
''خیریت؟'' خالہ چونکیں۔
''جی ایک کام ہے۔'' عائشہ نے گول مول جواب دیا۔
''کب جاؤ گی؟'' خالہ نے زیادہ جرح کیے بغیر سوال کیا۔
''آج یا کل؟''
''آج یا کل؟'' خالہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور کچھ سوچتے ہوئے بولنے لگیں۔
''میں تمہیں کہیں بھی ڈرائیور کے ہمراہ اکیلے تو نہیں بھیج سکتی۔ نیا ڈرائیور ہے۔ کچھ نہیں معلوم کیسا ہے کیسا نہیں۔ مجھے خود جانا پڑے گا تمہارے ساتھ۔'' خالہ نے لمبی تمہید باندھی۔
''جی۔''
''تو بیٹا آج تو میں بہت تھک گئی ہوں اور کل مجھے بہت ضروری کام سے مارکیٹ جانا ہے تو پرسوں ان شاء اللہ تعالیٰ لے چلوں گی جہاں تم کہو ٹھیک ہے؟''
''جی ٹھیک ہے۔'' عائشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ویسے بھی جہاں اتنے دن گزر گئے وہاں دو دن اور سہی۔ اور یہ دو دن بھی گزر ہی جائیں گے۔'' دیوار پر آویزاں قیمتی وال کلاک کی ٹک ٹک کرتی سوئیوں پر عائشہ نے نظریں جمائیں۔ ابھی سے پرسوں کے لیے انتظار شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ لابی میں داخل ہوا۔ جہاں لفٹ تھی۔ یہ لفٹ عام لوگوں کے لیے نہیں تھی بلکہ مختار تالپور کے خاص مہمانوں اور ملاقاتیوں کے لیے مخصوص تھی۔ اپنے ساتھیوں اور گارڈز کے ہمراہ وہ لفٹ میں سوار ہو گیا۔ اور پانچ نمبر کا بٹن دبا دیا۔ بے آواز اور تیز رفتار لفٹ سرعت کے ساتھ پانچویں منزل پر پہنچ گئی۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو سامنے ہی حنیف کھڑا تھا۔ مختار تالپور کا خاص کارندہ، امداد بروہی کو اس نے ادب سے سلام کیا اور اپنے ہمراہ لے گیا۔ وہ ایک وسیع و عریض اور شاندار آفس تھا۔ اسی میں ایک طرف نشست گاہ بھی تھی جہاں قیمتی صوفے رکھے تھے۔
''بھلی کری آیا سائیں۔'' یہاں مختار تالپور نے اسے گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا تھا۔
نشست گاہ کے صوفوں پر ہی وہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے رسمی باتیں ختم ہوئیں تو وہ اصل مدعے پر آ گیا۔
''ہمارے کام کا کیا ہوا۔''
''تین بندے آپ کے کام پر لگائے ہوئے ہیں سائیں۔'' مختار تالپور نے بڑے کروفر سے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے جواب دیا۔
''پچل شاہ، سید حسنات زیدی اور چوہدری اکرم الٰہی، تینوں کے ساتھ الگ الگ میٹنگ کی ہے میں نے اور تینوں نے بھرپور یقین دلایا ہے کہ آپ کا کام ہو جائے گا۔''
مختار تالپور نے جن شخصیات کے نام لیے تھے وہ ملک کی اہم سیاسی شخصیات تھیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق پولیس کے ہائی کمان افسران میں سے تھا اور باقی دو وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں وزیر تھے۔ مختار تالپور نے اس معاملے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ظفر صاحب کو ہینڈل کرنے کے لیے بالکل درست آدمیوں کا انتخاب کیا تھا۔ امداد بروہی کو کچھ اطمینان ہوا تھا۔ کیس عدالت میں چل رہا تھا مگر وہی روایتی سست رفتاری سے جو پاکستان میں عدالتوں کا خاصا ہے۔ اور یہ بھی اب عجیب نہیں رہا کہ دادا کا مقدمہ پوتے لڑتے ہیں فیصلہ پھر بھی نہیں آتا۔''

امداد بروہی عدالتی نظام میں موجود کمیوں اور خامیوں کو پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرنے کے جتن کر رہا تھا۔

اپنے بیٹے کے وکیل کو جو رقم وہ اب تک ادا کر چکا تھا وہ تو ہندسوں پر مشتمل تھی۔ وکیل بہت شاطر اور پروفیشنل تھا۔ کیس جیتنے کے سارے حربے اور ہتھکنڈے اچھی طرح جانتا بھی تھا اور انہیں استعمال بھی کر رہا تھا۔ کسی کو دھمکی، کسی کو لالچ، کسی سے درخواست، کسی کو بلیک میل وہ ہر طرح سے ہر گواہ پر محنت کر رہا تھا۔

"تو سائیں کیا پروگریس ہے اب تک کی؟" مختار تالپور اس سے دریافت کر رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہے۔" امداد بروہی کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ "یہ صحافی اور عوام بڑا شور مچا رہے ہیں۔"

"مچانے دو، ان کا کام شور ہی مچانا ہے۔ بولتے رہیں گے۔ شور مچاتے رہیں گے۔ ان کے شور مچانے سے کچھ ہوتا تو آج ہم تم حکومتی ایوانوں کے بجائے جیل میں ہوتے۔ حکمرانی کے بجائے قید خانے کے مزے لے رہے ہوتے۔" مختار تالپور حقارت سے مسکراتے ہوئے بول رہا تھا۔

"اتنا خلاف بولنے سے مقدمے پر اثر پڑ سکتا ہے۔ حالانکہ ہمارا وکیل اچھا ہے مگر۔"

مختار تالپور نے قہقہہ لگاتے ہوئے ایک پتے کی بات بتائی تھی۔

"کسی کے کچھ بولنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وکیل اچھا نہ کر سکو تو پریشان مت ہو۔ جج اچھا کر لینا۔"

☆☆☆

چھٹی کے دن صبح ہی اٹھ کر بیٹھ جاتا الٹا سیدھا ناشتا کرتا اور اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتا ماریہ سے صبر نہ ہوا۔ مانی کے کمرے میں جا گھسی۔

"کس مہم پر ہو آج کل؟ رات کے دو دو بجے تک تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی ہے۔ چھٹی کے دن بھی سارا دن لیپ ٹاپ لے کر بیٹھے رہتے ہو خیریت تو ہے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بڑی فرصت سے بیٹھی تھی۔

"پانچ منٹ ٹھہرو، ابھی بتاتا ہوں۔" مانی کی انگلیاں کی بورڈ پر برق رفتاری سے کام کر رہی تھیں۔ پانچ منٹ کے بجائے اسے دس منٹ ہو گئے تھے جب وہ فارغ ہوا اور ماریہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا جو بڑے صبر اور سکون کے ساتھ بیٹھی اس کی منتظر تھی۔

"شاہ زین کے لیے سوشل میڈیا پر مہم چلائی ہوئی تھی میں نے اور میرے دوستوں نے۔" مانی بغیر کسی تمہید کے شروع ہو گیا۔

"کیسی مہم؟"

"اس کے قاتل کو سزا دلانے کی مہم۔ جس سسٹم میں ہم سروائیو کر رہے ہیں وہاں کسی بااثر آدمی پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس طبقے کے لوگوں کو اپنے کیے کی سزا ملتی ہے اگر کسی طرح یہ عدالت کے کٹہرے اور قانون کے دائرے میں آ بھی جائیں تو ان کے بچنے کے بہت سے راستے نکل آتے ہیں۔ قاعدے قانون وجود میں لائے جاتے ہیں۔ شاہ زین کے کیس میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ طاقتور کے لیے ہمارا قانون مکڑی کا وہ جالا ہے جسے طاقتور با آسانی توڑ دیتا ہے اور کمزور کے لیے وہ جال جو اسے مضبوطی سے جکڑ لیتا ہے۔"

"تو تمہارے پلانز کیا ہیں؟" ماریہ نے اس کی مزید تقریر سے بچنے کے لیے جلدی سے سوال کیا۔

"پلانز؟" مانی نے ایک گہری سانس لی۔

"فقط ایک پلان ہے۔ قاتل کی سزا کا مطالبہ ہم دوستوں نے مل کر ایک گروپ بنایا ہے۔ اب تک ہمیں تقریباً پانچ ہزار لوگ جوائن کر چکے ہیں اور پتا ہے ماریہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پیارے اسی طرح تاریک راہوں میں مارے گئے۔ کوئی کسی کی لینڈ کروزر کے ٹائروں تلے کچلا گیا۔ کوئی ان امیرزادوں کی شوقیہ ہوائی فائرنگ کا نشانہ بنا۔ تمہیں یاد ہے آسیہ مرڈر کیس، وہ جس بنگلے میں کام کرتی تھی۔ وہاں مالک کے بیٹے نے

www.pklibrary.com

اپنے دوستوں کے بل کر پیٹرول چھڑک کر جلا ڈالا تھا۔ مانی اس کی طرف دیکھے بغیر بول رہا تھا۔

"ہاں مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔" ماریہ نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ "اخبارات میں خبریں پڑھی تھیں۔ اس کیس کے متعلق۔"

☆☆☆

مانی چپ چاپ کچھ سوچ رہا تھا۔ ماریہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"بھائی تم آسیہ مرڈر کیس کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔"

"ہاں، وہ تھوڑی لمبی بات ہے۔ بتاؤں گا تمہیں۔" مانی نے ایک گہری سانس لی۔

"یہ احتجاج وغیرہ کیسا ہوگا؟ کسی مصیبت میں نہ پھنسا لینا خود کو۔" ماریہ اک دم فکر مند ہوئی۔

"ہم جو کچھ کریں گے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کریں گے تم پریشان مت ہو۔" مانی نے اسے تسلی دی۔

"پھر بھی...... پتا نہیں کیوں اس طرح کی باتوں سے ڈر لگتا ہے۔" ماریہ نے جھرجھری لی۔

"ڈرنا تو انہیں چاہیے جو غلط کام کرتے ہیں۔ گناہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سزا دلانے کے لیے احتجاج کرنے میں ہم کیوں ڈریں۔"

"ہمارے ہاں اصل گناہ گاروں اور ذمہ داروں کو سزا ملنے کا رواج ذرا کم ہی ہے۔ اسی لیے تو ڈر لگتا ہے۔" ماریہ نے جواب دیا پھر مانی کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولی۔

"چھوڑو بھائی نہ کرو یہ سب، طوفانوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے چراغوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔"

"میری اچھی بہن، اگر شاہ زین کی جگہ میں ہوتا تو کیا تب بھی تم ایسے ہی سوچتیں؟"

"اللہ نہ کرے۔" ماریہ ایک دم تڑپ سی گئی، دہل کر اس نے اپنے بھائی کو دیکھا جو اسے کتنا پیارا اور کتنا عزیز تھا۔ تمام تر لڑائی جھگڑوں کے باوجود بھی شاید وہ جھگڑے محبت ہی کی علامت تھے۔

"اپنی تکلیف تو سب کو ہی بہت محسوس ہوتی ہے جب تک دوسرے کے درد کو اپنا درد نہیں سمجھیں گے۔ تب تک بات نہیں بنے گی۔ سب کچھ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ جیسے چل رہا ہے تبدیلی لانے کے لیے ہمیں پہلے خود کو تبدیل کرنا ہوگا۔"

"چند سو یا چند ہزار افراد سے کیا انقلاب آئے گا؟" ماریہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مانی کیا کرنا چاہ رہا ہے۔

"براہ راست اور فوری، کوئی انقلاب نہیں آتا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں مل کر ہی ایک اتنی بڑی لہر بناتی ہیں جو سونامی کہلاتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم معاشرے میں ہونے والے کسی بھی ظلم، ناانصافی اور جرم کے خلاف فقط چند روز شور مچا کر خاموش نہ ہو جائیں بلکہ مستقل اور مسلسل احتجاج جو کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچائے جو قانون اور اخلاقیات کے دائرے میں ہو۔" مانی مفصل بول کر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماریہ سمجھ رہی تھی بھی اس نے محبت سے گھور کر اپنے بھائی کو دیکھا۔

"اور آپ کا خیال ہے کہ امی ابو پھولوں کے ہار پہنا کر آپ کو اس کار خیر کے لیے رخصت کریں گے؟"

"مان جائیں گے وہ بھی۔" مانی نے ایک گہری سانس لی۔

"جب میری بات سمجھ جائیں گے تو مان بھی جائیں گے۔" اس کے لہجے میں یقین کے ساتھ ساتھ ایک مان بھی تھا۔

"خوابوں، خیالوں کی اور خوش فہمیوں کی دنیا سے باہر نکل آؤ۔"

"چلو نکل آیا۔" مانی نے جھٹ اس کی بات مان لی تھی۔ "اب یہ بتاؤ وہاں کب چلنا ہے؟"

"آج چلتے ہیں۔" ماریہ نے اس کی بات سمجھ کر جھٹ پٹ آفر کی۔

"ٹھیک ہے۔" مانی مسکرایا۔

www.pklibrary.com

☆☆☆

انتظار کے سارے دن کٹھن تھے مگر یہ دو دن تو جیسے دو صدیاں بن گئے تھے۔ بڑی مشکل اور بے تابی کے ساتھ کٹے تھے مگر کٹ ہی گئے۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر خالہ کے ہمراہ بیٹھی وہ اپنے خیالات میں گم تھی۔

"اللہ کرے ماریہ وہاں مل جائے۔" بے اختیار عائشہ کے دل سے دعا نکلی۔

اللہ اللہ کر کے اسے مانوس علاقہ اور وہ مانوس در و دیوار، شناسا لوگ نظر آئے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے برابر والی خالہ کا دروازہ بجایا تھا۔ خالہ کی بہو نے دروازہ کھولا۔ عائشہ نے سلام کیا۔

"ارے عائشہ، کیسی ہو؟ آؤ نا، اندر آؤ۔ آپ بھی آیئے نا۔" بھابھی کی نظر پیچھے کھڑی خالہ پر پڑی۔

دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ علیک سلیک کے بعد شروع ہو گئیں۔

"پرسوں آجاتیں تو خالہ سے بھی مل لیتیں، بس نصیب کی بات ہے تمہارے نصیب میں نہیں تھا ان سے ملنا۔"

"کیا ہوا خالہ کو، خیریت تو ہے نا۔" عائشہ کا دل اک دم دھک سے رہ گیا۔

"ارے ہاں خیریت ہی ہے۔" بہو صاحبہ زور سے ہنسیں۔ "دراصل پرسوں وہ عمرے پر گئی ہیں۔ تم آجاتیں تو تم بھی مل لیتیں پھر وہ تمہاری سہیلی بھی آئی تھی۔ کیا نام تھا؟" وہ سوچنے لگیں۔

"ماریہ" عائشہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں، شاید وہی تھی اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی۔ ایک بار پہلے بھی دونوں بہن بھائی آئے تھے۔"

"دراصل میرا موبائل کھو گیا ہے تو سارے کانٹیکٹ مس ہو گئے ہیں۔ ماریہ نے کوئی کانٹیکٹ نمبر دیا ہے۔ میرے لیے؟" عائشہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم اماں کو دیا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔" انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"خالہ کب واپس آئیں گی؟" عائشہ کو اداسی اور مایوسی کی دھند نے پھر اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"دو ہفتے میں۔"

"اچھا آپ یہ میرا نمبر اپنے پاس سیو کر لیں۔ ماریہ آئے تو اسے دے دیجیے گا۔" عائشہ نے اپنے بیگ سے موبائل نکالا۔ خالہ نے پچھلے ہفتے ہی نیا دلایا تھا۔

"اچھا اچھا، ایک منٹ ٹھہرو، میں اپنا موبائل لاتی ہوں۔" ایک منٹ کے بجائے وہ تقریباً دس منٹ بعد واپس آئیں تو ہاتھ میں موجود ٹرے میں دو گلاس کولڈ ڈرنکس کے رکھے تھے اور ساتھ ہی موبائل بھی۔ کولڈ ڈرنک ان کے ہاتھوں میں تھما کر وہ آرام سے بیٹھ گئیں۔ "ہاں اب بتاؤ اپنا نمبر۔" وہ اپنا موبائل آن کرنے لگیں۔

"بلاوجہ زحمت کی آپ نے۔" عائشہ ان کی تواضع پر شرمندہ ہو رہی تھی۔

"فضول باتیں مت کرو، جلدی سے نمبر بولو۔"

آتے ہوئے وہ جتنی پُرامید تھی۔ واپسی کا سفر اتنا ہی مایوس اور پژمردہ تھا۔ خالہ پتا نہیں کیا کیا بول رہی تھیں۔ وہ غائب دماغی سے ہوں ہاں کرتی رہی۔ بالآخر یہ مختصر سفر بھی تمام ہو ہی گیا اور خالہ کے بنگلے کے کار پورچ میں گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ عائشہ چونک پڑی اپنے خیالات سے باہر آئی تو خود کو گھر کے کار پورچ میں پایا۔ خالہ ڈرائیور کو نہ جانے کیا ہدایات دے رہی تھیں۔ عائشہ دروازہ کھول کر اندر چلی آئی اور لاؤنج میں کوئی بیٹھا تھا جو اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔

"ہیلو۔" وہ مسکرایا۔

اور عائشہ دنیا جہاں کی حیرت اپنی آنکھوں میں سمیٹے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

www.pklibrary.com

صادقہ آصف

دوست چڑیا

چڑیا کا چہچہانا سویرا ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے، پرندوں کی چہکار معمول کی وہ آوازیں تھیں، جو سمیرا اور کاشف کی بے رونق زندگی میں خود بخود شامل ہو کر زندگی کا حصہ بن گئیں۔ روزانہ سمیرا ابواجی سے ناشتہ بنوانے کے لیے کچن میں داخل ہوتی اور چائے کا پانی چولہے پر چڑھاتے ہوئے سامنے والے درخت پر نگاہ ڈالنا نہیں بھولتی جہاں گھاس پھونس سے بنے اس گھونسلے میں زندگی مسکرانے لگی تھی۔

چند دنوں بعد ہی اس کی دوست چڑیا نے ایک ساتھ کئی انڈے دے دیے۔ وہ روزانہ گھونسلے میں جھانکتی آخر ایک دن چٹ چٹ کی آواز کے ساتھ وہ انڈے چٹخنے لگے اور ایک کے بعد ایک بچے نکل پڑے۔ یہ دیکھ کر جہاں چڑیا مسرور دکھائی دی، وہیں سمیرا بھی خوش ہوا تھی

"بی بی جی۔ چڑیا کے بچے نکل آئے ہیں۔" بوا جی نے پراٹھا بیلتے ہوئے بیگم صاحبہ کا خوش گوار موڈ دیکھ کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

سمیرا نے رات کے کھانے پر جب بڑی معصومیت سے یہ بات اپنے شوہر کو بتائی۔ کاشف نے ایک لمحہ حیرت سے بیوی کو دیکھا، پھر نوکروں کے سامنے مذاق اڑانے والے انداز میں اتنا ہنسے کہ سمیرا کی آنکھوں میں پانی آ گیا اور وہ کھانا چھوڑ کر محفل سے اٹھ گئی۔ اس کے بعد — سمیرا نے اپنی دوست چڑیا کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ بس وہ چپکے چپکے اس کی گھر گرہستی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی، دوست چڑیا کے بچوں کی چوں چوں سے جیسے اطراف میں رونق لگی رہتی۔

تاہم آج کا دن، کل سے کچھ مختلف ثابت ہوا، جہاں سمیرا کاشف کا دل بے قرار تھا، وہیں دوست چڑیا بھی کچھ بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ سمیرا نے پروں کی پھڑپھڑاہٹ پر بے اختیار کھڑکی سے باہر جھانکا، اسے وہ سامنے والے نیم کے درخت پر بنے گھونسلے کے ارد گرد بڑی بے قراری سے منڈلاتی دکھائی دی۔ سمیرا کا منتشر ذہن چڑیا کی غیر معمولی حرکات پر چونکنے پر مجبور ہوا، اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر چاروں جانب نگاہیں گھمائیں اور دوست چڑیا کی بے چینی کی وجہ بھانپ گئی۔

درخت کی سامنے والی سبز ڈالی پر چڑیا کا ایک نوزائیدہ بچہ اٹکا ہوا دکھائی دیا۔ شاید وہ تیز ہوا کی زد میں آ کر گھونسلے سے نیچے گر گیا تھا مگر پتوں کی وجہ سے ڈالی پر اٹک گیا۔

چڑیا اپنی اولاد کے لیے پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ سمیرا کے بس میں ہوتا تو وہ اس بچے کو ہاتھوں سے اٹھا کر گھونسلے میں رکھ دیتی مگر درخت بہت اونچا تھا، اس کی پہنچ سے دور۔

"ماما...... پلیز......" بیٹی کی ڈری سہمی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"شکر ہے، زمین پر نہیں گرا ورنہ تو اسی وقت ختم ہو جاتا۔ بے چارہ ابھی تک گھونسلے میں ہی رہا ہے زمانے کی تکلیفوں کی اسے کیا خبر؟" سمیرا نے بے دھیانی میں بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے خود کلامی کی، وہ بیٹی کی جانب ذرا بھی متوجہ نہ ہوئی۔

"ماما۔ آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں، مجھے شارق پسند ہے، وہ دوسرے لڑکوں سے بہت مختلف ہے، ویسے بھی

میں نے دانش بھائی کو کبھی بھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔"
نباہ نے اپنا مقدمہ ماں کے سامنے رکھا۔
"یہاں بات تمہاری نظر کی نہیں ہے نباہ۔"
سمیرا نے دوست چڑیا کی بے قراری پر ایک بار پھر باہر جھانکا، جو ڈالی پر گرے بچے کے ارد گرد منڈلا رہی تھی اور بچی کو جھاڑا۔
"ماما۔ میں نہیں جانتی بس آپ۔ پاپا کو بتا دیں، مجھے ان کی پسند سے شادی نہیں کرنی۔" وہ چیخ کر بولی۔
"ہونہہ۔ لاڈو رانی نے۔ اتنا ہی آسان سمجھا ہے، ان کا بس چلتا تو بیٹی کا نکاح آج شام کو ہی بھتیجے کے ساتھ پڑھوا دیتے، وہ تو ساری عمر بھائی کی ٹیلی پر یوں فدا رہے کہ ہم لوگ نہ کبھی انہیں دکھائی دیے اور نہ ہی ہماری آوازیں انہیں سنائی دیتی ہیں۔" سمیرا بھنویں اچکا کر بیٹی کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

www.pklibrary.com

''مجھ سے یہ منافقت نہیں ہو سکتی ماما، دل میں کسی اور کو جگہ دے کر شادی کہیں اور کرلوں۔'' نباہ کی برداشت جواب دے گئی، اس نے کاندھوں سے پکڑ کر ماں کو جھنجوڑ ڈالا۔

''اب میں کیا کروں، ؟ انہیں کیسے بتاؤں کہ بیٹی نے باپ کی خواہشات کو پس پشت ڈال کر اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرلیا ہے اور تو اور گھر میں کسی سے مشورہ کیے بغیر شام کو بھائی صاحب کی فیملی کو کھانے پر بھی بلوالیا کہ آکر شادی کی تاریخ طے کرلی جائے۔'' سمیرا نے بیٹی کو غصے سے گھورتے ہوئے سر تھام کر سوچا۔

''کاش ماما نے ہمارے ایس ایم ایس نہ دیکھے ہوتے تو کچھ دنوں تک بات مزید دبی رہتی، پہلے میں خود بات کرکے انہیں مناتی، اپنا معاملہ سیٹ کرتی پھر شارق سے ملواتی، تو ان کو اتنا شاک نہیں لگتا اب، یوں اچانک۔ بھانڈا پھوٹنے پر ماما کا منہ پھول گیا ہے۔'' نباہ نے خیالوں میں کھوئی ہوئی سمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''میں کروں بھی تو کیا، کاشف کی تو ایک ہی رٹ ہے کہ دانش سے نباہ کی شادی کروں گا تاکہ ہمارا خاندان مزید مضبوط ہوجائے، ادھر بیٹی دانش کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔'' سمیرا وقتی طور پر دوست چڑیا کو بھول کر ایک بار پھر بیٹی کو گھورنے لگی، جس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک رنگ جارہا تھا۔

☆☆☆

رات کو شوہر سے ایک طویل بحث کے بعد اس کی نیند اڑ چکی تھی، وہ نباہ کی شادی کا فیصلہ یوں اچانک کرنے پر بہت نالاں تھی، مگر ساجد بھائی نے فون کرکے بھائی کے کانوں میں جانے کیا سحر پھونکا کہ وہ نہ صرف نباہ کی شادی کی تاریخ دینے پر راضی ہوگئے بلکہ بھائی صاحب کی فیملی کو شام کی دعوت بھی دے ڈالی۔ سمیرا کا احتجاج بے سود ثابت ہوا۔ کاشف نے ہمیشہ کی طرح اس کی ایک نہ سنی اور فیصلہ سنادیا اور وہ رات بھر آنسوؤں سے تکیہ بھگوتی رہی۔

سمیرا کی صبح آنکھ کھلی تو سر بھاری بھاری سا لگا، کاشف ناشتہ کیے بنا آفس جاچکے تھے، یہ ان کا ناراضی دکھانے کا ایک انداز تھا۔ سمیرا کو چائے کی طلب نے بے قرار کرڈالا، بوا جی بھی ابھی تک نہیں آئی تھیں، سوچا نباہ سے چائے بنوا کر پی جائے۔

ویسے تو وہ بیٹی کو پڑھائی کی وجہ سے کچن میں کم ہی جانے دیتی تھی مگر اس وقت کچھ سوچ کر اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ سر کو ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دروازے پر ہلکے سے دستک دی اور ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوگئی۔

''نباہ بیٹا! پلیز ایک کپ چائے بنادو۔'' اس کی پکار پر کوئی جواب نہ آیا۔

''کہاں غائب ہوگئی یہ لڑکی صبح صبح؟'' کمرے کے وسط میں کھڑے ہوکر چاروں اور نگاہ گھمائی، کتابیں بستر پر کھلی بے ترتیب پڑی تھیں مگر نباہ کہیں دکھائی نہ دی۔ سمیرا نے کان لگا کر سنا تو گیلری سے سرگوشیوں کی آوازیں آئی۔

''اسی سردی میں نباہ اتنی رازداری سے گیلری میں کھڑے ہوکر کس سے ہنس ہنس باتیں کررہی ہے؟'' سمیرا کے کان کھڑے ہوگئے۔

چھٹی حس نے انجانا سا سگنل دیا اور وہ دبے پاؤں شیشے کی شفاف دیوار میں لگے دروازے کو کھول کر گیلری میں داخل ہوئی۔

''اچھا شارق! میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں، لگتا ہے کوئی آرہا ہے۔'' نباہ نے دروازے پر ہونے والی آہٹ پر عجلت میں فون بند کردیا۔

''شارق...... یہ شارق کون ہے؟'' سمیرا کا سر چکرایا۔

''ماما...... آپ...... اتنی صبح...... خیریت تو ہے؟'' نباہ مڑی تو ماں سے ٹکراگئی، بے ربط جملے منہ سے پھسل پڑے۔

''میری چھوڑو، یہ بتاؤ تم یہاں کھڑی کیا کررہی ہو اور کس سے بات کررہی تھیں؟'' سمیرا نے کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو نباہ گھبراگئی۔

''وہ...... وہ...... میں تو...... اپنی کالج فرینڈ

www.paklibrary.com

فریحہ سے بات کر رہی تھی۔" اس نے انگلیاں مسلتے ہوئے جھوٹ بولنے کی ناکام کوشش کی۔

"اچھا۔ فریحہ یا شارق؟" سمیرا نے بھناتے ہوئے اس سے فون چھین لیا۔

نباہ مسمرائزی سی کھڑی رہ گئی، بغیر مزاحمت کے ماں کو فون دے دیا۔ سمیرا نے پہلے تو کال ریکارڈ چیک کیا، اس کا میسج باکس کھول لیا، نباہ کی حالت خراب ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ پیغامات پڑھتی گئی، اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک اٹھیں۔ سر کا درد مزید شدت اختیار کر گیا۔

"مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ ہر کام پوچھ پوچھ کر کرنے والی میری چھوٹی سی نباہ اب اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ خود کر لیا، ماں کو بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔" تکلیف کے مارے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سمیرا کے ہاتھ سے موبائل فون گر گیا اور وہ ایک شاک کے عالم میں بیٹی کے کمرے سے باہر کی طرف چل دی۔

"ماما...... سنیں تو......" نباہ نے بے اختیار پکارا مگر سمیرا چلتی چلی گئی۔

دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے مڑ کر نباہ پر ایک نگاہ ڈالی، جو سپید چہرے کے ساتھ مجرموں کی طرح اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات پر سمیرا کا دل دھڑکا، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سب کچھ بھلا کر بیٹی کو سینے میں چھپا لیتی، مگر اب جب کہ شام کو بھائی صاحب کی فیملی ان کی شادی کی تاریخ طے کرنے آ رہی تھی۔ بیٹی کی محبت کی نئی افتاد سر پر آ کھڑی ہوئی، المیہ یہ ہوا کہ نباہ کو اس بات کی خبر ہی نہیں تھی کہ کاشف نے اس کی شادی کی تاریخ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

☆☆☆

دوست چڑیا کہیں دور سے چونچ میں پانی کے چند قطرے لائی اور اپنے بچے کے منہ میں قطرہ قطرہ ٹپکانے لگی، شاخ پر پڑے پڑے بچہ نڈھال ہو گیا تھا، چہرے پر مردنی اور آنکھیں بھی بند تھیں، سمیرا کا دل ایک لمحے کو دھڑکا۔ دماغ میں یہ سوچ ابھری کہ کہیں چڑیا کا بچہ مر مرا تو نہیں گیا۔

"ماما۔ میں آپ کو شارق کے بارے میں پہلے ہی بتانا چاہتی تھی مگر ڈر لگتا تھا کہ کہیں آپ لوگ خفا نہ ہو جائیں۔" نباہ نے ماں کا چہرہ تھام کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بتانا چاہا۔ اس نے مڑ کر بیٹی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بھی مردنی سی چھائی ہوئی تھی دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر ڈوبنے لگیں۔

"کہیں بچہ سچ مچ میں تو نہیں مر گیا؟" سمیرا نے گھبرا کر چڑیا کے بچے کی طرف دیکھا اور بڑبڑائی۔

"چڑیا کے بچے کا تو نہیں پتا، پر شارق کے بغیر میں ضرور مر جاؤں گی۔" ماں کی نگاہوں کا پیچھا کرتے ہوئے وہ ایک دم سے بلبلائی۔

"اپنی خوشیوں کے لیے تم کتنی خود غرض ہو گئی ہو، یہ بھی نہیں سوچا کہ زمانہ کیا کہے گا؟ خاندان بھر میں ہم لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" سمیرا ایک بار پھر چڑیا کی بے قراری کو فراموش کرتے ہوئے بیٹی کو ناراضی سے تکنے لگی۔

"ماما...... میں خود غرض نہیں ہوں، مجھے آپ دونوں سے بہت پیار ہے شاید شارق سے بھی کئی گنا زیادہ۔" نباہ نے ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دباتے ہوئے کہا، اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سمیرا اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوئی۔

"میں اپنے والدین سے محبت کرتی ہوں مگر کیا آپ کو بھی مجھ سے سچی محبت ہے؟ سچ بتائیے گا، کیا آپ اپنی بیٹی کو اپنے جیسی زندگی دینا چاہیں گی؟" اس کی سوالیہ نگاہیں ماں کی گیلی نظروں سے چپک گئیں۔

"کیوں میری زندگی کو کیا ہوا؟" اپنا بھرم قائم رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے، سمیرا کے لب پھڑپھڑائے۔

"یہ بات آپ بھی جانتی ہیں نا کہ تایا ابا کو ہم سے نہیں صرف پاپا کے بزنس سے مطلب ہے، ساری زندگی تو انہوں نے خود ساختہ بیماریوں کا

www.pklibrary.com

ڈرامہ رچا کر کچھ کمایا نہیں، ساری ذمہ داری پاپا نے ہی اٹھائی، بڑے بھائی کا خیال کرتے ہوئے ان کی فیملی کا خرچا اٹھانے کے باوجود اس گھر کے فیصلے ان کی مرضی سے کروائے گئے، کہیں تایا ابا کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ بدلے میں ان لوگوں نے کبھی ہمارا نہیں سوچا، ہماری معاشی خوش حالی ہماری جذباتی بد حالی کا سبب بنی۔ اسی پیسے کے چکر میں تائی اماں نے ساری زندگی آپ کے اور پاپا کے درمیان فاصلے پیدا کرنے کی سرتوڑ کوشش جاری رکھی۔ ان لوگوں کا گھٹیا پن دیکھیں کہ میری پیدائش پر بھی آپ کو پاپا کی نگاہوں میں یہ کہہ کر معتوب ٹھہرایا کہ بیٹا کیوں نہیں ہوا، یہ چرچا اس قدر ہوا کہ آپ نفسیاتی طور پر اتنا مجروح ہوئیں کہ دوبارہ ماں ہی نہیں بن سکیں۔"

ماضی نباہ کے لبوں سے آہوں کی صورت میں نکلا۔

"یہ ہم بڑوں کے بیچ کی بات ہے، جو گزر گیا سو گزر گیا، تم آنے والی خوشیوں کو ماضی کے ترازو میں نہ تولو۔" آنکھیں میچتے ہوئے سمیرا نے سمجھایا۔

"ماما۔ مجھے دانش بھائی میں تایا ابا کی جھلک دکھائی دیتی ہے، مارے باندھے ماسٹرز کیا ہے، اس کے باوجود کسی جاب کے لیے سیریس نہیں ہوتے، چھوٹی موٹی جاب ان کی نگاہوں میں سماتی نہیں، گھر کی کوئی ذمہ داری اٹھانا نہیں چاہتے، ان کا اثر چھوٹے بھائیوں پر بھی پڑ رہا ہے، مفت میں ساری خواہشات پوری ہو رہی ہیں تو وہ سب بھی بے فکری کے مزے لوٹ رہے ہیں۔" اس کے دل کا درد بیٹی کی زبان سے احتجاج بن کر ابھرا تو وہ حیران رہ گئی، بے فکری نباہ اتنی میچور ہو گئی ہے، اس کا اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔

"نباہ! تم نے کون سا دنیا دیکھ رکھی ہے، تم لوگوں کے بارے میں کیا جانتی ہو، ویسے شارق تم سے مخلص ہے، اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟" وہ اپنا بھرم رکھتے ہوئے بولی۔

"ماما۔ دنیا کے سارے لوگ آپ کے جیٹھ جٹھانی جیسے نہیں ہوتے، بہت سارے خاندان رشتوں کا پاس رکھنا بھی جانتے ہیں؟" نباہ نے اسے لاجواب کیا تو وہ چپ رہ گئی۔

"ویسے جہاں تک شارق کی بات ہے۔ وہ صرف مجھ سے پیار کرتا ہے، میرے پاپا کیا کرتے ہیں؟ کتنا بینک بیلنس ہے، مہینے میں کتنا کما لیتے ہیں اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی، اور نہ ہی میں نے کوئی ذکر نکالا۔ ویسے بھی اس کا اپنا کاروبار دو شہروں میں پھیلا ہوا ہے۔" نباہ نے صاف لہجے میں بتایا۔

"اچھا تو؟" سمیرا نے پوچھا

"تو پھر یہ ماما کہ اسے صرف میری ذات سے محبت ہے اور میرے حوالے سے آپ دونوں بھی اس کے لیے بہت معتبر ہیں، خاص طور پر آپ، کیوں کہ اس کی ماں کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور وہ آپ کے بارے میں مجھ سے کرید کرید کر پوچھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔" نباہ کی بات پر وہ چونک کر بیٹی کا منہ تکنے لگی۔

"مشکل یہ ہے کہ یہ سب کچھ سن کر کاشف اتنے ناراض ہوں گے کہ شاید تمہارا منہ دیکھنا بھی پسند نہ کریں، ہو سکتا ہے وہ اس بات پر ہم دونوں کو گھر سے نکالنے میں بھی ایک لمحہ نہ لگائیں۔" ان دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں تو سمیرا کے خیالات اس تک بخوبی پہنچ گئے۔

"ماما۔ آئی ایم سوری گھر میں آپ جیسی زندگی نہیں گزار سکتی، دبے ہوئے، گھٹے گھٹے ماحول میں جہاں بیوی کے منہ سے نکلی ایک بات کو بھی امانت کی طرح دل میں رکھنے کی جگہ پورے خاندان کے سامنے ٹھٹھے کی طرح اڑایا جاتا ہو، ایک بات بتائیں، کیا ایسے داماد کی آپ کی نگاہوں میں قدر و منزلت ہو گی جو پاپا کے پیسوں پر پلتا ہو؟ اس سے اچھا تو ہم اس گھر سے چلے ہی جائیں۔"

نباہ نے آنسو پونچھتے ہوئے مضبوط لہجے میں ماں کی طرف دیکھ کر جتایا۔ اس کی نگاہیں ایک بار پھر چڑیا کی طرف اٹھیں جو اپنی اولاد کے لیے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کر رہی تھی۔

"پھر کیا تمہیں اس لڑکے شارق پر پورا یقین ہے۔ کہیں وہ تم سے فلرٹ تو نہیں کر رہا ہے یا گیم میں تم

www.pklibrary.com

سے شادی کرے گا نا؟" سمیرا نے سکوت توڑتے ہوئے بیٹی کے سامنے سارے اندیشے دہرا دیے۔

اس سے پہلے کہ نباہ کوئی جواب دیتی، اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے موبائل کی گھنٹی تواتر سے بج اٹھی۔ وہ وڈیو کال ریسیو کرتے ہوئے مسکرائی۔ سمیرا بیٹی کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا بغور جائزہ لینے لگی۔

"نباہ پہلے سے ہی خوب صورت ہے یا شارق کے ساتھ نے اسے سچی خوشیوں سے نوازا ہے" محبت کے رنگوں نے جیسے اس کے چہرے کے نقوش کو سنہرا پن عطا کر دیا تھا۔ سمیرا دم بخود سی بیٹی کو تکتے ہوئے سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

"ماما! شارق آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔" نباہ نے ماں کا کاندھا ہلا کر موبائل اس کے سامنے کر دیا۔

"ہیلو......" سمیرا کی کپکپاتی آواز پر نباہ مسکرا دی۔

نباہ شارق کو اچھی طرح سے جانتی تھی، اس لیے مطمئن تھی۔ اس کی توقعات غلط نہیں تھیں، وہی ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں سمیرا کے من میں جیسے سکون سا اترتا چلا گیا، اندیشے پر لگا کر اڑ گئے۔ شارق کے اپنائیت بھرے لہجے اور اعتماد نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی، وہ دیکھنے میں بھی بہت گڈ لکنگ تھا۔ نباہ کا پرفیکٹ میچ۔

"ماما پر بھی شارق کا جادو چل گیا۔" نباہ نے گھڑی کی سوئیوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے خوش ہو کر سوچا۔

جب شارق سے بات شروع ہوئی تو سمیرا نے بھی یہی سوچا تھا، کہ چند لمحوں میں رسمی سی گفتگو کے بعد فون رکھ دے گی۔ مگر یہ کیا آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی وہ اس سے باتوں میں یوں مگن رہی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو۔ شارق کے بے تکلفانہ اور اپنائیت بھرے انداز پر مسکراتے ہوئے اس نے بے خیالی میں کھڑکی سے باہر جھانکا تو چڑیا بڑی دقتوں سے چونچ میں دبائے اپنے بچے کو گھونسلے تک واپس لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ سمیرا کے چہرے پر ایک نئی سوچ عزم بن کر چمکی، کمزور سی دوست چڑیا نے اسے ایک نیا سبق پڑھایا تھا، ممتا کا سبق۔

☆☆☆

"ماما۔ آپ نے ہمیشہ مجھے یہ احساس دلایا کہ میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی مگر بلیو می۔ شارق کے معاملے میں میرا فیصلہ درست ثابت ہوگا، وہ آپ کا داماد ہی نہیں بیٹا بھی ثابت ہوگا، جبکہ دانش بھائی تو تایا ابا کی لالچ اور تائی اماں کی خاندانی سازشوں میں پھنس کر میرے وجود کو ہی فراموش کر بیٹھیں گے، پھر آپ لوگوں کو کیا خاک عزت دیں گے۔" نباہ نے ماں کا ہاتھ چھوتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"کیا صحیح ہے کیا غلط۔ میرے لیے تو یہ بات ہی اچنبھے کی ہے کہ ایک لڑکی بھی کوئی فیصلہ کر سکتی ہے، کیوں کہ مجھے تو یہ حق بھی ملا ہی نہیں، والد نے اپنی مرضی سے مجھے کاشف کے ساتھ بیاہ دیا، اس کے بعد سے اس گھر کے ساتھ ساتھ میرے وجود پر بھی کاشف صاحب کی حکومت رہی، ایسے اٹھو، ایسے بیٹھو، میرے گھر والوں کی یوں خدمت کرو، یہ ہی سنتے سنتے زندگی گزار دی۔ اب یہ ہی دیکھ لو کہ آج شام کو میری بیٹی کی بات طے ہونے جا رہی ہے اور کاشف نے مجھے یہ بات بتانے کی زحمت نہیں کی، وہ تو کل تمہاری تائی کی کال آئی اور انہوں نے بڑی نخوت سے دعوت کا مینیو بتایا جس سے میرا دماغ گھوم گیا، ان سے پوچھا تو بولے، بھابھی صاحب جو کہتی ہیں وہ پکوا لو، ویسے بھی دونوں بچوں کی شادی کی بات طے ہونے جا رہی ہے۔" سمیرا نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھیں۔

"ماما...... نہیں...... پاپا سے کہیں، مجھے معاف کر دیں۔ میرا ایسے گھر میں گزارا مشکل ہے جہاں میری ماں کی عزت نہیں۔" نباہ بھونچکی سی ماں کو تکنے کے بعد ایک دم نفی میں سر ہلاتے ہوئے رو دی۔

"رو نہیں نباہ! اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے، تمہارے پاپا نے شروع سے تمہیں اتنا دبا کر رکھا، یہاں تک کہ جیون ساتھی چنتے ہوئے بھی

www.pklibrary.com

تمہاری رائے جاننے کی کوشش نہ کی، اسی لیے تم ہم سے اپنے دل کی بات نہ کہہ سکیں اور اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر بیٹھیں۔" سمیرا نے بیٹی کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر آنسو پونچھتے ہوئے یوں کہا، جیسے وہ خود کسی نتیجے تک جا پہنچی ہو۔

"ماما۔ پلیز، میں دانش بھائی سے شادی نہیں کروں گی اس سے اچھا آپ مجھے ساری عمر اسی گھر میں رکھیں۔" اس کا انداز التجائیہ ہوا۔

"ویسے نباہ! تم نے شارق کو یہ سوچ کر چنا ہوگا کہ اب تم میچور ہوگئی ہو، اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود سے کر سکتی ہو مگر بیٹا بڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے والدین کی خواہشات کو ایک طرف رکھ کر اپنی مرضی سے جو دل چاہے کرتے پھریں۔" سمیرا کا انداز ناصحانہ ہوا۔

"آئی ایم سوری ماما! شاید اس وقت میرا انداز آپ کو غلط لگ رہا ہو مگر وقت بتائے گا کہ شارق آپ کے اور پاپا کے لیے کتنا اچھا ثابت ہوگا۔" نباہ نے نگاہیں جھکاتے ہوئے اپنا موقف واضح کیا۔

"کوئی بات نہیں، ماضی پر ہمارا اختیار نہیں، جو ہوگیا سو ہوگیا مگر مستقبل ابھی بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ چلو آگے جو ہوگا اسے ہم بہتر طریقے سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" سمیرا نے دوست چڑیا کو مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر بیٹی کو دلاسہ دیا، وہ خود میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگی۔

"ماما...... کہاں جارہی ہیں؟" سمیرا ایک دم اندر کی جانب بڑھنے لگی تو نباہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"تمہاری تائی کو فون کرنے کہ شام کی دعوت کینسل ہوگئی ہے۔" سمیرا کا شانت لہجہ اسے ہولانے لگا۔

"اگر تائی اماں ناراض ہوئیں اور پھر ہمارا خاندان...... دنیا والے وغیرہ وغیرہ؟" نباہ کے گلابی لب تھرتھرائے۔

"کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کرے گا کہ میری نباہ اپنی زندگی کیسے گزارے گی، اس کا فیصلہ ہم خود کریں گے نا میری بیٹی۔" ماں کا پریقین لہجہ نباہ کے کانوں میں رس گھولنے لگا۔

"اور...... پاپا؟" اس نے ماں سے پوچھا۔

"ہم ساری عمر چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اچھا بن کر دکھائیں تو کیا والدین ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم بھی اچھے ماں باپ بن جائیں۔ اپنے پاپا کی فکر نہ کرو، زندگی میں پہلی بار میں بھی ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ اپنی بیٹی کی خوشیوں کی بھیک مانگوں گی، مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کر پائیں گے اور ہمارا پچاس فیصد کام بن جائے گا۔" سمیرا نے بیٹی کو پرسکون انداز میں بتایا۔

"اور...... باقی کا پچاس فیصد؟" نباہ نے سوال کیا۔

"وہ شارق خود کاشف سے مل کر انہیں اپنے حق میں کرلے گا، مجھے اس پر پورا یقین ہو چلا ہے۔" سمیرا کی شرارت پر نباہ کھکھلائی۔

"تھینک یو ماما۔" وہ خوش دکھائی دینے لگی۔

"مگر بیٹا ایک بات یاد رکھنا تم نے خود کو میچور سمجھتے ہوئے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ تو کرلیا۔ اب چاہے اس راہ میں کتنی بھی کٹھنائیاں آئیں، ثابت قدم رہنا کیوں کہ واپسی کے سارے راستے بند ملیں گے، مجھ پر پورے خاندان کا دباؤ ہوگا کیوں کہ میں اب اس معاملے میں تمہارے پاپا کی بھی نہیں سنوں گی۔" سمیرا نے گہری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

"آئی لو یو ماما۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" نباہ بے اختیار ماں سے لپٹ گئی، زندگی میں پہلی بار اس نے ماں کو اتنا پراعتماد دیکھا تو اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی، ورنہ تو اسے پورا یقین تھا شارق سے شادی کے لیے اسے تن تنہا ہی لڑنا ہوگا۔ مگر ماں کے ساتھ نے اس کی طاقت بڑھادی۔ وہ شارق کو خوش خبری سنانے چل دی۔ نباہ کے جانے کے بعد سمیرا نے کھڑکی سے باہر جھانکا، دوست چڑیا اور اس کا بچہ گھونسلے میں بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے، اسے لگا جیسے زندگی بھر کے زخموں پر مرہم لگ گیا ہو۔

☆

سمیرا

حسن آرا

شام کا اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ حسن آرا نے تسبیح رکھی اور اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سیاہ تارکول کی سڑک دور تک ویران اور سنسان تھی، اکا دکا لوگ تو تھے ہی لیکن ان کا بیٹا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اب تو رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ صبح سے جو لڑ جھگڑ کر گھر سے نکلا تھا تو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور ان کے دل کو جیسے پنکھے لگے ہوئے تھے خالی گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ سیل فون نکال کر دوبارہ اس کا نمبر ملایا۔

''بس آ رہا ہوں راستے میں ہوں۔'' اس نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی اور پھر کچھ ہی دیر میں اس کی گاڑی آتی دکھائی دی تھی۔ تنا ہوا چہرہ اور تھکن بھرا انداز حسن آرا کا دل کٹ رہا تھا۔

''کھانا لاؤں تمہارے لیے۔''

''نہیں، میں کھا کر آیا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے جو تم کھا کر آئے ہو، یہ جھوٹ کسی اور کو سنانا۔ اب آرام سے بیٹھو ادھر تمہارے انتظار میں ابھی تک میں بھی بھوکی بیٹھی ہوں۔'' اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے حسن آرا نے بڑی پھرتی سے میز پر کھانا چن دیا تھا۔ بریانی، رائتہ اور سلاد، اپنے بیٹے کے لیے اس عمر میں وہ اتنا ہی کر سکتی تھیں۔

''کس بات پہ جھگڑا ہوا ہے تم دونوں میں۔'' کھانے کے دوران انہوں نے بڑے سرسری انداز میں استفسار کیا تھا۔

''کچھ خاص نہیں بس آپ ٹینشن نہ لیں۔''

''میں جاؤں کی کل اسے......''

''ہرگز نہیں آپ کہیں نہیں جائیں گی اسے اگر آنا ہوگا تو وہ خود آئے گی ورنہ مجھے کوئی پروا نہیں۔'' اس کا انداز اتنا قطعی تھا کہ حسن آرا چپ کی چپ رہ گئیں۔

☆☆☆

برقی قمقموں سے سجے گھر میں آج خوب ہی رونق لگی ہوئی تھی، ہر سو خوشی کا سماں تھا قہقہے اور ہنسی کی جھنکاریں گونج رہی تھیں۔ حسن آرا آج بے حد خوش تھیں اور پھر خوشی کا ہی تو دن تھا۔ ان کا بڑا بیٹا زریاب آج دولہا بنا تھا ہر ماں کو کتنا ارمان ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا دولہا بنے۔

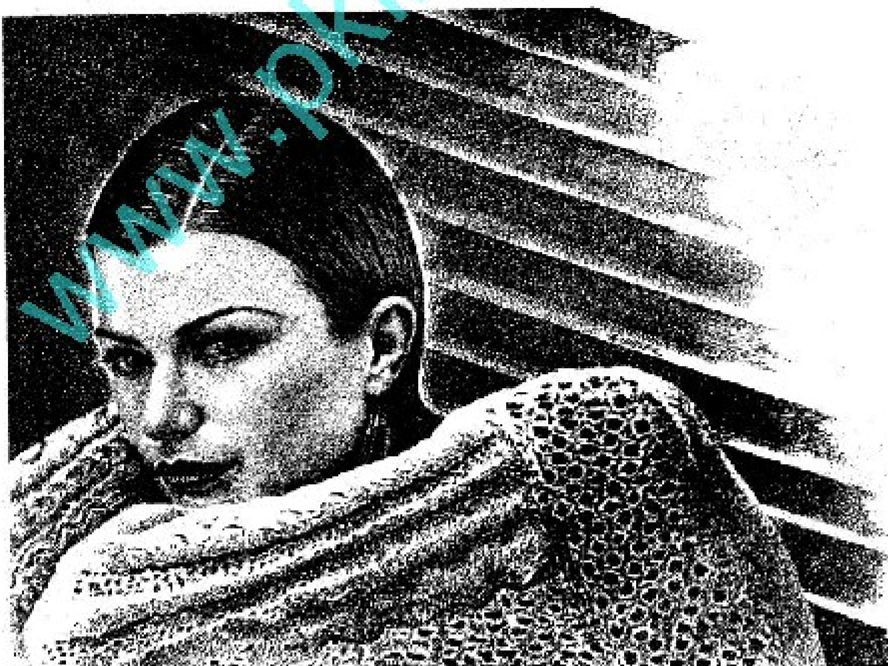

www.pklibrary.com

تو آج ان کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی سب لوگ مبارک باد دے رہے تھے۔ بیٹا تو سورج تھا ہی دلہن بھی چاند جیسی تھی۔ اور حسن آرا ان کی بلائیں لیتی نہیں تھک رہی تھیں۔ لیکن خوشی کے یہ دن بے حد کم ثابت ہوئے۔

زریاب تو ایسا ماہ نور کے حسن کا اسیر ہوا تھا کہ جیسے باقی ہر رشتہ ہی بھول چکا تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ تو بس بیوی کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی دنیا بس ایک کمرے تک محدود ہو چکی تھی۔

صبح اٹھ کر کمرے میں ہی ناشتہ کرنا اور سٹنگ روم میں رک کر ایک منٹ کے لیے الوداعی کلمات ادا کرنا اور نکل جانا۔ شام میں آ کر پھر جو کمرے میں گھستا تو اگلے روز ہی وہاں سے صورت نمودار ہوتی تھی۔

اس کے پاس تو بہن بھائیوں کے پاس بیٹھنے کا بھی وقت نہیں رہا تھا۔ دلہن کا موڈ ہوتا تو کمرے سے نکلتی ورنہ اپنے موبائل اور لیپ ٹاپ میں سر دیے رہتی۔ ذمہ داری کوئی نہ تو حسن آرا نے اس پہ ڈالی تھی اور نہ ہی اس نے خود سے بڑھ کر کسی کام میں حصہ لیا تھا۔

زیان کا اور ان کا ناشتہ نمرہ بنا دیتی تھی صفائی اور برتنوں کے لیے ملازمہ تھی۔ گھر میں کام ہی کتنا تھا لیکن کام چھوڑ ان میں گھلنے ملنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

ایک دو بار نمرہ اس کے کمرے میں گئی اور پھر منہ لٹکا کر واپس آ گئی تھی۔

''کیا ہوا۔'' حسن آرا نے اس کی خفت کو محسوس کر لیا تھا۔

''میں نے اتنی باتیں کیں لیکن انہوں نے ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہیں دیا اب میں اکیلی کتنا بول سکتی تھی۔'' حسن آرا اس کی بات سن کر خاموش ہو گئیں پھر انہوں نے خود سے بھی بلا کر آواز دے کر اپنے پاس بٹھا کر دیکھا مگر وہ پاس آ کر ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی نے کوئی سزا سنا دی ہو۔

چند روز کی کوششوں کے بعد حسن آرا نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔ بیٹے سے شکایت کیا کرتیں وہ تو خود دو پل کو بس شکل دکھاتا تھا لیکن اس روز انہیں بہت دکھ ہوا۔

ان کی بڑی بیٹی امبرین آئی ہوئی تھی کھانا وغیرہ تو سب نمرہ نے ہی تیار کیا تھا۔ امبرین زریاب کی شادی کے بعد آج ہی آئی تھی سوئی نوبلی بھابی سے ڈھیروں باتیں کرنے کا ارمان تھا مگر وہ تھی کہ بیڈروم سے نکلنے کو تیار نہیں تھی۔

''ایسی بھی کیا ساؤنڈ پروف دیواریں ہیں امی، کیا اس کو میری آواز نہیں آئی ہو گی اب کیا میں خود جا کر شہزادی کو سلام کروں۔'' آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا اسے آئے ہوئے اور بھابی آ کر ملی بھی نہیں تھی اس کا دل برا ہو رہا تھا۔

''ٹھہرو اجاؤ نمرہ بلا کر لاؤ۔'' انہوں نے نمرہ سے کہا وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ دونوں کمرے سے تک سک سے تیار ہنستے مسکراتے باہر نکلے۔ کھڑے کھڑے سلام کیا اور زریاب نے کہا۔

''امی ہم ذرا باہر جا رہے ہیں۔'' اور بس رکے بغیر چلے گئے۔ امبرین تو منہ کھولے بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

''امی! یہ کیا بات ہوئی؟ کیا گھر آئے مہمان سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں آئی ہوں اور یہ تیار ہو کر نکل گئے۔''

''تم کیوں ہونے لگیں مہمان، تمہارا اپنا گھر ہے جب چاہے آؤ، ہم ہیں نا تمہارے پاس۔'' حسن آرا نے اس کی دلجوئی کی خاطر دلاسا دیا ورنہ غصہ تو ان کو بہت آ رہا تھا۔

''پھر بھی چلو اگر جانا ہی تھا تو میرے بچوں کو ہی ساتھ لے جاتے۔'' امبرین کی کسی صورت تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

''چھوڑو آپی! وہ نیا نویلا جوڑا ہے اب کیا کباب میں ہڈیاں جوڑ لیتا۔'' نمرہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''اور آپ فکر نہ کریں شام کو ہم انہیں گھمانے لے جائیں گے آخر زیان ہے نا۔'' بظاہر تو وہ مسکرا دی تھی لیکن دل میں یہ تاثر جو اس نے دیا تھا بڑا چبھ رہا تھا۔

''آ لینے دو ذرا زریاب کو واپس، دیکھنا اچھی طرح خبر لوں گی۔'' نمرہ کے بتائے حربے سے مکمل انصاف کرتے ہوئے دل میں مصمم ارادہ کیا

لیکن شام میں سکندر اسے لینے آ گئے اور ان دونوں کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ پہلی بار میکے سے گھر آتے ہوئے اس کا دل برا ہو رہا تھا۔

☆☆☆

رات دس بجے دونوں واپس آئے تھے مارے غصے کے حسن آرا ابھی تک جاگ رہی تھیں۔

"ویسے تمہارے جیسے شوہر، ہر لڑکی کا آئیڈیل ہوتے ہیں۔" گاڑی سے اترتے ہوئے ماہ نور نے اسے ایک اور چابی بھری تھی۔

"ہاں تو اب ہمارا ٹائم ہے ہمیں اپنی مرضی سے جینا چاہیے اب اس عمر میں بھی بزرگوں کی انگلی پکڑ کر چلنا ہے کیا۔"

"زریاب تمہاری یہی باتیں سن کر مجھے اپنی قسمت پر رشک آتا ہے۔" لاؤنج میں حسن آرا کو دیکھ کر دونوں چونک گئے۔

"یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔" وہ زریاب پر چلائیں۔

"آنے کا کیا مطلب، اس ٹائم تو لوگ گھروں سے نکلتے ہیں۔" جواب بیٹے کی جگہ بہو نے دیا تھا اس کی ہمت دیکھ کر زریاب کی بھی ہمت بڑھی۔

"تمہاری بہن آئی تھی آج۔"

"تو کیا کوئی پہلی بار آئی تھی۔" وہ اس تفتیش پہ حیران ہوا۔

"اپنی بھابی سے ملنے تو پہلی بار ہی آئی تھی اور تم لوگ بس منہ اٹھا کر نکل گئے کیا اتنی بھی تہذیب نہیں کہ مہمان گھر میں ہو اور بجائے اسے کمپنی دینے کے تم لوگ اپنے سیر سپاٹوں کو نکل جاؤ۔" ماہ نور نے پہلی بار انہیں اتنے جلال میں دیکھا تھا وہ تھوڑی خائف ضرور ہوئی تھی لیکن گھبرائی بالکل بھی نہیں۔

"زریاب آپ یہ پیشی بھگتا کر آ جانا مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔" کہہ کر اس نے کمرے کی راہ لی۔ اور حسن آرا پہ تو جیسے سکتہ طاری ہو چکا تھا۔

"امی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے یہ جو آپ آدھی رات کو یوں راہ روک کر کھڑی ہو گئیں کیا سوچے گی ماہ نور، کیسے آپ اس کے سامنے مجھ سے بات کر رہی تھیں۔" الٹا وہ انہیں سنا کر چلا گیا اور کیا سوچے گی ماہ نور بس اس کی فکر تھی ماں اور بہن کے دل کا کوئی خیال نہیں تھا۔

حسن آرا نے صوفے کا سہارا لیا اور وہیں بیٹھ گئیں۔ آج سے قبل انہیں اپنا آپ اتنا ہلکا کبھی نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

اور پھر چند روز تک حسن آرا نے اس سے بات تک نہیں کی تھی بیڈ روم کا دروازہ جو کبھی کبھار کھلا مل جاتا تھا اب تو وہ بھی بند رہنے لگا تھا۔ اندر خانے جو کھچڑی پک رہی تھی جلد ہی اس کا ڈھکن بھی کھل گیا۔

زریاب بضد تھا کہ وہ گھر میں دیوار بنوا کر اپنا پورشن الگ کر لے گا۔ جمشید صاحب نے ساری عمر کی پونجی لگا کر یہ چھ مرلوں کا گھر بنایا تھا اور ان سے غلطی یہ ہوئی کہ دونوں بیٹوں کے نام کر دیا۔ خود تو چل بسے یہ رولا حسن آرا کو سونپ گئے۔

"امی آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔" امبرین دوبارہ آئی تو یہ سب سن کر بے چین ہو اٹھی اور جب ماہ نور سے بات کی تو وہ بڑی پرسکون تھی۔

"آخر ایک دن الگ تو ہونا ہی ہوتا ہے اس میں اتنا دکھی ہونے والی کیا بات ہے۔" امبرین نے بے حد غصے سے اسے دیکھا۔

"ہر کام اپنے وقت کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے ابھی کچھ عرصہ قبل تو ہم نے یہ گھر بنایا ہے ابھی تو میری ماں کو برتنا بھی نصیب نہیں ہوا اور تم حصے کرنے آ گئی ہو۔ نمرہ اور زیان کی شادی ہو جانے دو ضرورت ہوئی تو۔۔۔ بن جائے گی دیوار بھی۔"

"نمرہ اور زیان کی شادی سے ہمارا کیا تعلق جو کل بھی ہمارا ہے اسے آج دینے میں مسئلہ کیا ہے، گھر لڑکا اور کاروبار دیکھ کر ہی رشتہ کیا تھا ہم نے۔" وہ تو ذرا بھی لحاظ نہیں کر رہی تھی۔

امبرین اٹھ کر ماں کے پاس چلی آئی۔ ماہ نور کو سمجھانا بے کار تھا اب ماں کو ہی تسلی دلاسہ دیا جا سکتا تھا۔

انہوں نے پہلی میں ہی نہیں دوسری اور تیسری

www.pklibrary.com

منزل تک دیوار اٹھائی تھی چھ مرلے کا کھلا گھر اب تین مرلوں میں بند ڈبہ ہی لگ رہا تھا تو انہیں بھی کچھ ضروری تبدیلیاں کروانی پڑ رہی تھیں۔

نمرہ بے چاری اکیلے ہی سب کام نمٹا رہی تھی اس وقت رات کے کھانے کے لیے سب کو کمروں سے نکال کر لائی تھی۔

"ایسا کرتے ہیں زیان کی شادی کر دیتے ہیں کچھ تو تبدیلی آئے گی۔"

"ہم تو ایک سے ہی بھر بیٹھے۔" حسن آرا کی نگاہ دیوار کی سمت اٹھی تو زیان نے اٹھ کر اپنا بازو ان کی گردن میں ڈال دیا۔

"میں ہوں نا آپ کا فرماں بردار لاڈلا سپوت، جو کبھی آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔" جانے کیا بات ہے ساری اولاد میں ایک ضرور ماں باپ کا احساس کرنے والا اور فرماں بردار ہوتا ہے۔

☆☆☆

نمرہ کے ایگزیم ختم ہوئے تو اس کے لیے ایک بے حد اچھا رشتہ آ گیا اب غور و خوض کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لڑکا اور اس کی ایک ہی بہن تھی جو بیاہی ہوئی تھی حسن آرا نے منظوری دے دی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے بعد گھریلو ذمہ داریاں کون سنبھالتا اب اس عمر میں حسن آرا گھر تو نہیں سنبھال سکتی تھیں سو زیان کے لیے بھی ساتھ ہی رشتہ ڈھونڈنا پڑا اور جہاں منگنی ہوئی وہاں تو بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا۔

"اچھا ہے ہم سے کم حیثیت لوگ ہیں تو لڑکی ہم سے ذرا دب کر رہے گی' بڑے گھر کی لا کر بھگت چکے ہیں۔" امبرین کو بھی لڑکی پسند آئی تھی۔

اس کی ماں گورنمنٹ ٹیچر تھی انعم کا اپنی دوست کے بھائی کے ساتھ افیئر تھا لیکن آنسہ خاتون کسی صورت نہیں مان رہی تھیں زیان کا رشتہ آیا تو جھٹ ہاں کر دی۔ لیکن بیٹی کے دل و دماغ میں کیا چل رہا تھا وہ اس سے بے خبر تھیں۔

زیان نے سارا معاملہ ماں کو سونپ رکھا تھا۔ شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو بڑی بہو اور بیٹے کو بھی منانا پڑا بلکہ انہوں نے خود ہی معافی مانگ کر شامل ہونے کی کوشش کی تھی پھر بڑا بیٹا تھا بھلا کب تک ماں ناراض رہتی ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا اب مان جانے میں ہی عافیت تھی۔

☆☆☆

اور یہ ان کی خوش فہمی ہی تھی کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا حسن آرا کی قسمت میں شاید بہو کا سکھ ہی نہیں تھا۔ دلہن بنی انعم کی جس حرکت کو سب نے نوٹ کیا وہ اس کا سیل فون تھا جو کسی صورت اس سے جدا نہیں ہو رہا تھا پتا نہیں کون تھا ایسا بے تاب کہ جس کو نہ خود چین تھا۔ نہ وہ دلہن کو چین سے بیٹھنے دے رہا تھا۔ اور پھر یہ عقدہ بھی جلد ہی کھل گیا۔

"تمہارے ساتھ میری شادی زبردستی ہوئی ہے میں کسی صورت اس رشتے کو قبول نہیں کروں گی۔" یہ تھے وہ جملے جو زیان کی منہ دکھائی کے جواب میں ادا کیے گئے تھے۔ وہ جس کی تصویر دیکھ کر ہی اس پہ دل و جان سے فدا ہو چکا تھا وہ کسی اور کو دل میں بسائے بیٹھی تھی۔

"دیکھیں جو ماضی میں ہو چکا......"

"ماضی نہیں وہ میرا حال، مستقبل سب کچھ ہے اس شادی کو محض گڈے گڑیا کا کھیل سمجھو۔" زیان کو لگا وہ کم عمر' بیوقوف سی تو ہے جو اس کی باتوں اور حرکتوں سے ہی لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا نرمی سے محبت سے وہ اسے سمجھا لے گا مگر اس نے تو پہلے ہی قدم پر ہاتھ اٹھا کر نہ صرف اسے باور کروایا تھا بلکہ خود ہی ڈریسنگ روم میں جا کر اپنا ہار سنگھار نوچ کر اتارا اور منہ دھو کر واپس اس کے روبرو آ بیٹھی۔

وہ جو ابھی تک ویسے ہی بیٹھا تھا چونک کر سیدھا ہوا۔

"دیکھو میں وکی سے پیار کرتی ہوں وہ میری بیسٹ فرینڈ ارما کا بھائی ہے تم سے پہلے اس کا ہی پرپوزل آیا ہوا تھا لیکن مما کو تم میں جانے کون سے سرخاب کے پر نظر آئے جو مجھے ایموشنل بلیک میلنگ' ٹارچر اور نہ جانے کیا کیا کرنا شروع کر دیا مجبوراً مجھے تم سے شادی کرنا پڑی چلو اچھا ہے ان کی بھی سمجھ میں آئے گا کہ زبردستی کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ویسے تم بھی کوئی اتنے برے نہیں ہو لیکن کیا

www.pklibrary.com

کروں وکی کے ساتھ ذرا دل کا معاملہ ہے اور میں چاہتی ہوں کہ یہ جو دو چار دن ہیں یہ ہنسی خوشی گزر جائیں کیونکہ میں زیادہ دیر منہ بسور کر نہیں بیٹھ سکتی۔" بیٹے پہ آتی بالتی مارے وہ اس سے ایسے بات کر رہی تھی جیسے اس کی پکی سہیلی ہو۔

"تم بھی بتا دو اپنا کہیں پکڑو کر تو ہو گا۔" اور اس سے قبل کہ وہ کچھ بولتا اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔

"لو وکی کی کال آ گئی۔" کہہ کر وڈیو کال آن کی۔

"ہیلو وکی، کیا حال بنا لیا اپنا، یہ شیو کیوں نہیں بنائی میرے فراق میں پورے مجنوں لگ رہے ہو۔" اور پھر آنکھ مار کر اسے چڑایا۔

"اور نہیں تو کیا، میرے تو دل کی دھڑکن رک رک کر آ رہی ہے انو یار کیا کروں کہیں دل نہیں لگ رہا کہاں چلی گئی ہو تم اور بات سنو اسے بتایا ہے ہمارے بارے میں۔"

"ہاں سب بتا دیا ہے۔" انعم نے چور نظروں سے دیکھا۔

"کیا کہا اس نے۔" وکی کے لہجے میں عجیب سا خوف تھا۔

"کچھ کہہ تو کیا عکس میں ہے کچھ نہیں کہا تم خود ہی بات کرو۔" کہہ کر سکرین اس کی طرف کی اور آنکھوں سے بات کرنے کا اشارہ کرنے لگی۔ اب زیان بھلا کیا بات کرتا وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ اگلے روز ولیمہ تھا۔ ولیمے کی شام زیان نے اسے گھر ڈراپ کیا اور خود واپس چلا آیا تھا۔

حسن آرا اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"بیٹا رسم کے مطابق آج تمہیں وہیں رہنا تھا پھر کل ہم تم دونوں کو لینے آتے۔"

"کوئی ضرورت نہیں اب اسے لینے جانے کی۔"

"ہیں! یہ کیا کہہ گیا ہے۔" حسن آرا نے امیرین کو بلایا وہ بھی سن کر پریشان ہوئی۔

"میرے خیال میں اس وقت اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ اب کل صبح ہی بات کریں گے۔" وہ انہیں لے کر کمرے میں چلی گئی اور آرام سے سونے کا مشورہ دیا لیکن آرام بھلا اب کہاں آ سکتا تھا وہ آدھی رات کو اٹھ کر زیان کے بیڈروم میں کھڑی تھیں۔

زیان نے انہیں یوں پریشان دیکھا تو سارا ماجرا کہہ سنایا۔

"لگتی تو ایسی نہیں تھی اتنی ہنس مکھ اور باتونی، جب بھی ہم گئے اتنی عزت سے ملی اب کیا پتا تھا کہ اس کے دماغ میں یہ سب چل رہا تھا۔" بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔"

"اچھا آپ ریلیکس کریں جو ہونا تھا ہو چکا جب انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تو ہم کیوں ہلکان ہو رہے ہیں۔" انہیں پرسکون کرنے کے لیے وہ خود بھی مسکرا دیا تھا۔

"تم دیکھنا میں اسی مہینے تمہاری دلہن لے کر آؤں گی، میرے بیٹے کو کیا لڑکیوں کی کمی ہے۔" وہ دل میں مصمم ارادہ کر کے اٹھی تھیں۔

☆☆☆

دلہن تو گھر آ گئی لیکن کسی کے دل کو کوئی خاص نہیں لگی تھی۔ زیان کے دماغ کو بھی انعم کے حسن کا بخار چڑھا ہوا تھا اور پھر پہلے دو تجربوں کے بعد اب باقی سب کا رویہ بھی بڑا اکھڑا اور لیا دیا سا تھا حالانکہ لڑکی اپنے ہی خاندان کی تھی لیکن تھوڑا وقت لگا اور ایڈجسمنٹ ہو گئی اور جب سب نارمل ہو گئے تو اقراء کے پر پرزے نکلنا شروع ہو گئے۔ جب سے اسے خوشخبری ملی تھی وہ تو گویا ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

اس روز بھی صبح صبح ہی دونوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔

"اقراء جلدی اٹھا کرو تمہیں پتا ہے نا امی شوگر کی مریضہ ہیں انہیں بھوک جلدی لگتی ہے۔"

"تو وہ خود بنا لیں نا اپنا ناشتہ ——" اس نے خوب برا سا منہ بنایا تھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں کون سا کام نہیں کر سکتیں۔ دوسری بات محض سوچ ہی گئی تھی۔

"ویسے آج کل کی لڑکیوں کے دماغ میں یہ نیا فتور سمایا ہوا ہے کہ ساس ہے تو ان کی خدمت کیوں کریں، ہماری ذمہ داری نہیں نندوں کے لیے کھانا کیوں بنائیں فلاں کے کپڑے کیوں دھوئیں۔" اس کے ذہن میں جو ماہ نور کا خاکہ تھا وہ اس کے تناظر میں

www.pakilibrary.com

کروں وکی کے ساتھ ذرا دل کا معاملہ ہے اور میں جانتی ہوں سچ کے یہ جو دو چار دن ہیں یہ ہنسی خوشی گزر جائیں کیونکہ میں زیادہ دیر منہ بسور کر نہیں بیٹھ سکتی۔" بیڈ پہ آلتی پالتی مارے وہ اس سے ایسے بات کر رہی تھی جیسے اس کی پکی سہیلی ہو۔

"تم بھی بتا دو اپنا کہیں چکر وکر تو ہوگا۔" اور اس سے قبل کہ وہ کچھ بولتا اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔

"لو وکی کی کال آ گئی۔" کہہ کر ویڈیو کال آن کی۔

"ہیلو وکی، کیا حال بنا لیا اپنا، یہ شیو کیوں نہیں بنائی میرے فراق میں پورے مجنوں لگ رہے ہو۔" اور پھر آنکھ مار کر اسے چڑایا۔

"اور نہیں تو کیا، میرے تو دل کی دھڑکن رک رک کر آ رہی ہے انو یار کیا کروں کہیں دل نہیں لگ رہا کہاں چلی گئی ہو تم اور بات سنو اسے بتایا ہے ہمارے بارے میں۔"

"ہاں سب بتا دیا ہے۔" انعم نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا کہا اس نے۔" وکی کے لہجے میں عجیب سا خوف تھا۔

"کچھ بھی نہیں تو شاک میں ہے کچھ نہیں کہا تو تم خود ہی بات کر لو۔" کہہ کر کیمرے کا رخ زیان کی سمت کر دیا اور آنکھوں سے بات کرنے کا اشارہ کرنے لگی۔ اب زیان بھلا کیا بات کرتا وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ اگلے روز ولیمہ تھا۔ ولیمے کی شام زیان نے اسے گھر ڈراپ کیا اور خود واپس چلا آیا تھا۔

حسن آرا اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"بیٹا رسم کے مطابق آج تمہیں وہیں رہنا تھا پھر کل ہم تم دونوں کو لینے آتے۔"

"کوئی ضرورت نہیں اب اسے لینے جانے کی۔"

"نہیں! یہ کیا کہہ گیا ہے۔" حسن آرا نے امبرین کو بلایا وہ بھی سن کر پریشان ہوئی۔

"میرے خیال میں اس وقت اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ اب کل صبح ہی بات کریں گے۔" وہ انہیں لے کر کمرے میں چلی گئی اور آرام سے سونے کا مشورہ دیا لیکن آرام بھلا اب کہاں آ سکتا تھا وہ آدھی رات کو اٹھ کر زیان کے بیڈروم میں کھڑی تھیں۔

زیان نے انہیں یوں پریشان دیکھا تو سارا ماجرا کہہ سنایا۔

"لگتی تو ایسی نہیں تھی اتنی ہنس مکھ اور باتونی، جب بھی ہم گئے اتنی عزت سے ملی اب کیا پتا تھا کہ اس کے دماغ میں یہ سب چل رہا تھا۔" بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔"

"اچھا آپ ریلیکس کریں جو ہونا تھا ہو چکا جب انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تو ہم کیوں ہلکان ہو رہے ہیں۔" انہیں پرسکون کرنے کے لیے وہ خود بھی مسکرا دیا تھا۔

"تم دیکھنا میں اسی مہینے تمہاری دلہن لے کر آؤں گی میرے بیٹے کو کیا لڑکیوں کی کمی ہے۔" وہ دل میں مصمم ارادہ کر کے اٹھی تھیں۔

☆☆☆

دلہن تو گھر آ گئی لیکن کسی کے دل کو کوئی خاص نہیں لگی تھی۔ زیان کے دماغ کو بھی انعم کے حسن کا بخار چڑھا ہوا تھا اور پھر پہلے دو تجربوں کے بعد اب باقی سب کا رویہ بھی بڑا محتاط اور لیا دیا سا تھا حالانکہ لڑکی اپنے ہی خاندان کی تھی لیکن تھوڑا وقت لگا اور ایڈجسمنٹ ہو گئی اور جب سب نارمل ہو گئے تو اقرا کے پر پرزے نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ جب سے اسے خوشخبری ملی تھی وہ تو گویا ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

اس روز بھی صبح صبح ہی دونوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔

"اقراء جلدی اٹھا کرو تمہیں پتا ہے نا امی شوگر کی مریضہ ہیں انہیں بھوک جلدی لگتی ہے۔"

"تو وہ خود بنا لیں نا اپنا ناشتہ ——" اس نے خوب برا سا منہ بنایا تھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں کون سا کام نہیں کر سکتیں۔ دوسری بات محض سوچ ہی سکی تھی۔

"ویسے آج کل کی لڑکیوں کے دماغ میں یہ نیا فتور سمایا ہوا ہے کہ ساس ہے تو ان کی خدمت کیوں کریں، ہماری ذمہ داری نہیں، نندوں کے لیے کھانا کیوں بنائیں فلاں کے کپڑے کیوں دھوئیں۔" اس کے ذہن میں جو مادہ فور کا تھا کہ تھا وہ اس کے تناظر میں

بول رہا تھا۔

لیکن اقرا کو تو آگ ہی لگ گئی تھی وہ بھڑک کر اٹھ بیٹھی۔

"ہاں تو بیوی کوئی پورے شہر کی نوکر نہیں ہوتی۔"

"زندگی کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ہی چلتی ہے میری بہنیں مہمانوں کی طرح آتی ہیں ان کی مہمان نوازی کرنا تمہارا فرض ہے اور میری ماں کی ایسی کون سی خدمتیں کر رہی ہو تم، پہلے یہ سب کام ثمرہ کرتی تھی اب وہ نہیں ہے تو گھر سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"کچھ ذمہ داری ماہ نور کے ذمہ بھی لگاؤ میں آخر وہ بھی اس گھر کی بہو ہے۔"

"مثلاً کون سی ذمہ داری۔" وہ اب اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا جو ذرا سی بات کا جھگڑا بنائے کھڑی تھی۔

"ابو تو تمہارے اب رہے نہیں تو امی کی ذمہ داری تم دونوں بھائیوں کو آپس میں بانٹنا......" اور اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پہ لگا تھا۔

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔" زیان نے الماری کھول کر اس کے سارے کپڑے بیڈ پہ ڈھیر کر دیے تھے۔

"ابھی اور اسی وقت نکلو یہاں سے اور اگر واپس اس گھر میں آنا ہو تو دماغ سے یہ خناس نکال کر آنا۔" کسی کام سے ان کے کمرے کی سمت آتی حسن آرا وہیں سے واپس پلٹ گئی تھیں۔

کمرے میں آ کر ایک گلاس پانی پیا مگر حواس بحال نہیں ہوئے۔ یہ ان کی بہو نے کیا کہا تھا ان کی سماعتیں سلگنے لگی تھیں۔

اور کچھ دھندلی یادوں کا عکس جھلملاتے ہوئے انہیں بہت دور لے گیا تھا۔

☆☆☆

کچے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ، سوندھی سوندھی مٹی کی مہک، امرود کا درخت، چڑیا کا گھونسلا، فضا میں پرندوں کی چہکار، بھینسوں کا باڑا، مرغیوں کا ڈربا، بکری کا میمنا، صحن کی کچی دیوار اور حد نگاہ تک پھیلے سرسبز شاداب کھیت وہ خوبصورت گاؤں کی عورتیں۔ بہوؤں کی چغلیاں اور آپس کی چھیڑ چھاڑ۔

اور اس سب کے بیچ وہ دھیمے لہجے میں بولنے والی مدھم سا مسکرانے والی پر شفقت نورانی چہرے والی اس کی ساس۔ خورشید بیگم۔

کیا تھیں وہ اس کے لیے، اتنی مہربان بالکل ماں جیسی، ماں بھی کبھی کبھار ڈانٹ لیتی تھی مگر خورشید بیگم کا مہربان لہجہ کبھی نامہربان نہیں ہوا تھا وہ تو اس کے لیے سراپا محبت تھیں۔ بڑے فخر سے کہتیں۔

"جتنی خوب صورت میری بہو ہے سارے چند میں کسی کی نہیں ہوگی۔" بہو کا حسن ہی ایسا تھا چم چم کرتا ہوا جسے خورشید بیگم نے کبھی دھول سے بھی میلا ہونے نہیں دیا تھا کبھی حسن آرا کے ہاتھ میں جھاڑو نہیں تھمائی۔ جب گاؤں کی عورتیں بہوؤں کی برائیاں کرتی تھیں۔

"میری بہو کو برتن دھونے نہیں آتے کپ کی ڈنڈیوں کے اندر اتنا میل جمع کر دیا۔"

"اور میری کپڑے دھونے بیٹھی تو آستینیں، پائنچے اور کف ملے ہی نہیں اور صابن کا بے دریغ استعمال۔"

"اور میری کا تو حال ہی مت پوچھو جو سالن رات کو بنایا کسی نے چکھا تک نہیں میرا بیٹا کہہ رہا تھا جو اماں کے ہاتھ میں سواد ہے وہ کسی کے ہاتھ میں نہیں۔" اس زمانے میں تو ہر لڑکی سگھڑ، سلیقہ مند ہوا کرتی تھی پھر بھی وہ سسرال میں پھوہڑ، کم عقل، بیوقوف ہی رہتی۔

مگر اس کی ساس نے کبھی اس کی برائی نہیں کی، کبھی اس سے برتن، کپڑے نہیں دھلوائے، لہسن تک خود چھیلتی تھیں سبزی خود بنا کر دیتیں۔ اپلے اور لکڑیوں کا چولہا خود جلاتیں اسے سلنڈر منگوا کر دیا۔ محلے کی کیا پورے گاؤں کی بہوویں اس پہ رشک کرتی تھیں۔

بچوں کی پیدائش کا مرحلہ آیا تو پورے چھ مہینے تک بچوں کو خود سنبھالا ان کی مالش کی نہلایا

دھلایا، فیڈر ریٹانا کردیا راتوں کو اٹھ کر جاگیں۔

اس کا ایک دیور تھا جو فوج میں تھا اس کی بیوی زرینہ اس کے ساتھ ہی رہتی تھی جب بھی گاؤں آتے تو خورشید بیگم ان کی بھی ایسی ہی خاطر تواضع کیا کرتی تھیں اس کی دیکھا دیکھی حسن آرا کو بھی شہر میں رہنے کا شوق چڑھ گیا تھا تب اس کی گود میں زریاب اور امیرین تھے۔

بچوں کی تعلیم کو جواز بنا کر گاؤں چھوڑ دیا۔

خورشید بیگم وہاں اکیلی رہ گئیں۔

ہفتے، مہینوں اور مہینے سالوں میں بدل گئے۔ وہ بوڑھی ہو گئیں اور کمزور بھی، اپنے ہی کام مشکل سے کرنے لگیں، جمشید صاحب نے اس بار گاؤں کا چکر لگایا تو انہیں اپنے ساتھ گھر لے آئے حسن آرا بظاہر تو خاموش رہیں لیکن انداز میں جو ناگواری تھی وہ خورشید بیگم نے چند دنوں میں ہی بھانپ لی۔ اور واپس گاؤں چلی گئیں۔ جمشید صاحب نے انہیں وہاں ایک ملازمہ بھی رکھ کر دی لیکن ملازمہ اپنی من مرضی کی مالک تھی۔ اسے کون سا کوئی پوچھنے والا تھا۔ سارا گھر اور صاف ستھرا تھا۔ پر تمہیں کاؤ میں خورشید بیگم کی خراب حالت، ان کے ہاتھ میں سوکھی روٹی تھی جسے وہ چائے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ جو ساتھ پٹھان کرائے دار رہتے تھے ان سے مانگ کر کھا رہی ہیں۔

ابھی وہ اس دھچکے سے نہیں سنبھلے تھے کہ وہی پٹھانی خوب لڑاکا انداز میں ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

”او صاحب، کوئی اپنی ماں کو ایسے چھوڑتا ہے بے آسرا اور اکیلا تمہارا ملازمہ پورے ہفتے سے نہیں آ رہا ہم ہی ان کا سب کام کر رہے ہیں خود سے تو اب غسل خانہ بھی نہیں جا سکتا۔“ جمشید نے انہیں گاڑی میں بٹھایا اور دوبارہ گھر لے آئے۔ ایک دو ملازمہ کا انتظام بھی کیا لیکن چند ہی دنوں میں وہ چھوڑ جاتیں۔

تنگ آ کر حسن آرا نے صاف کہہ دیا۔

”یہ میری ذمہ داری نہیں ہے تمہاری ماں ہے تم سنبھالو یا پھر اپنے بھائی سے کہو آ کر لے جائے۔“ اور ان کی نند جمیلہ جانے کب کی آئی دروازے میں کھڑی سب سن رہی تھی۔ اس نے بھائی کی ہاتھ جوڑ کر منت کی تھی کہ ماں کو اس کے ساتھ بھیج دیں۔

لیکن جمشید صاحب کو بدنامی کا خوف تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ لیکن پھر بیوی کی ہٹ دھرمی اور بہن کی منت کے آگے ہار گئے تھے اور ایک مہینے بعد جب ان کا انتقال ہوا تو فوراً جا کر گھر لے آئے اور سب سے واہ واہ بھی سمیٹ لی کہ حسن آرا نے تو خوب ساس کی خدمت کی ہے۔

اور آج ان کی بہو نے کیا کہا تھا انہیں لگا اقرا کے روپ میں حسن آرا ہی کھڑی ہیں۔ وقت اتنی جلدی خود کو دہراتا ہے۔

زیان کا بیٹا ہوا تھا لیکن اس کی بیوی گھر آنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ اس گھر میں نہیں آئے گی، اسے الگ گھر لے کر دیا جائے۔ اور زیان کسی صورت اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا بلکہ ایک وقت تو وہ اسے چھوڑنے پہ رضامند ہو چکا تھا۔

وہ یہی کہانی کو جمیلہ تو جانتی تھی کیونکہ اقرا اس کی ہی بیٹی تھی۔ ”آپ بھول گئیں ممانی نے جو نانی کے ساتھ کیا تھا۔“ اقرا نے کہا۔

”اپنے گھر جاؤ اور ساس کی ماں سمجھ کر خدمت کرو کیونکہ اب تمہارے پاس بھی ایک بیٹا ہے کیا تم چاہو گی کہ وقت ایک بار پھر خود کو دہرائے۔“ دوسری طرف حسن آرا زیان سے کہہ رہی تھیں۔

”جاؤ زیان اپنی بیوی اور بچے کو لے آؤ میں سمجھ چکی ہوں کہ کیوں میری کوئی بہو مجھے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔“ وہ اب اپنے کیے پہ پچھتا رہی تھیں لیکن وقت گزر چکا تھا اور مداوے کی اب کوئی صورت نہیں تھی مگر جو بات حسن آرا نے نہیں سمجھی تھی وہ اقرا کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس نے اپنا سامان باندھا اور بیٹے کو لے کر گھر واپس آ گئی۔

☆

امتہ العزیز شہزاد

یہ جو ہم لوگ ہیں

"جب سے آئی ہیں کچھ بجھی بجھی سی لگتی ہیں۔" وریشہ نے جو ابھی ابھی سنوری تو بیا چتا بڑی بہن کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر کسی گہری سوچ میں مستغرق پایا تو تشویش سے استفسار کر رہی تھی۔

"کیا ہوا آپو...... سب خیر تو ہے؟" وہ پوچھتی ہوئی بستر پر اپنی "آپو" کے مقابل بیٹھ گئی۔ اور بہت کھوجتی نگاہوں سے اس کا پُرکشش چہرہ دیکھنے لگی۔

"آں...... ہاں!" وہ جو اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ وریشہ کی آواز پر چونک گئی اور غائب دماغی سے خود سے تین برس چھوٹی، "گوری چٹی" گول چہرے اور بھورے گھنگھریالے بالوں والی اپنی اس بہن کو دیکھنے لگی جو ابھی انٹر کی طالبہ تھی۔ مگر اس وقت اس کے چہرے پر چھائے تفکرات کے بادل اسے اپنی اصل عمر سے کہیں زیادہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے......

"تم کچھ کہہ رہی تھیں؟" رمشا نے یک لخط توقف کے بعد پوچھا تو وریشہ اپنی بھوری آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ البتہ آپ کی متورم آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں؟" رمشا نے تحیر سے پوچھا۔

"وہی...... جو کچھ آپ ہم سب سے چھپانا چاہتی ہیں۔" وہ پراسراریت سے مسکرا کر بولی۔

"مگر میں تو کچھ بھی نہیں چھپا رہی۔" وہ خود کو سنبھال کر ٹالنے کی خاطر جلدی سے بولی مگر "وہ" بھلا ٹلنے والی "شے" تھی؟

"جھوٹ مت بولیں۔" وہ اس کی بات کو مکمل رد کر کے اسے کندھوں سے تھام کر اس کی مسکارے وکاجل سے سجی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

www.pklibrary.com

ناولٹ

www.pklibrary.com

"سچ سچ بتادیں...... کہ آخر کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ؟"

اس کے مسلسل اصرار پر رمشا کا دل بھر آیا۔۔۔۔

"بولیں...... چپ کیوں ہیں خدارا کچھ تو بولیں۔" وریشہ اسے جھنجوڑنے لگی۔ تب رمشا کے آنسو خمیدہ پلکوں کی باڑ توڑ کر بغاوت پر اتر آئے اور اس کے پھڑپھڑاتے لبوں سے ہلکی سی آواز برآمد ہوئی۔

"دھوکا!"

"دھوکا!" وریشہ کی آنکھیں اپنے اندازے کی صد فیصد درستی پر مارے جوش کے پھٹ گئیں۔ "کیسا دھوکا؟" اس نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔

"کیا روحان بھائی نے ...... "سوتن کا سہاگ" کے ہیرو کی طرح پہلے ہی سے کوئی خفیہ شادی کر رکھی تھی؟"

"نہیں......" رمشا نے بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلادیا۔

"تب تو ضرور وہ "سسرال ایک جہنم" ڈرامے کے "پرنس چارمنگ" نکلے ہوں گے۔" وریشہ کا دم اپنے پسندیدہ ڈرامہ سیریل کا وہ خوف ناک سین یاد کر کے سینے میں اٹکنے لگا۔

"انھوں نے یقیناً شادی کی رات ہی آپ پر واضح کردیا ہوگا کہ آپ صرف ان کے گھر والوں کی "چاکری" ہی کے لیے اس گھر میں لائی گئی ہیں ورنہ انھیں تو کسی "نیلی آنکھوں والی" حسینہ سے عشق تھا...... ہے نا؟" وہ بول کر (بلکہ بکواس کر کے) بے حد ذوق سے رمشا کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کون سے سسرال والے اور کیسے سسرال والے؟" رمشا نے گلو گیر آواز میں کہتے ہوئے جھنجلا کر اپنے کندھے اس کے "چنگل" سے آزاد کروائے۔

"کوئی میرا درد نہیں سمجھ سکتا...... کوئی نہیں......"

"ہائے میرے اللہ......" رمشا کی بے بسی دیکھ کر اس بار بے اختیار اپنا دل پکڑ لیا اس کی آنکھوں میں ہراس بھری بے یقینی در آئی اور وہ صدمے سے چور لرزتی آواز میں بولی۔

"اب میں بھی...... کہیں روحان بھائی "صنم ہرجائی" کے بلند بخت شاہ تو ثابت نہیں ہوئے؟"

"صنم ہرجائی کا بلند بخت شاہ" رمشا اپنا سیاپا بھول کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

"اب یہ کون ہے؟"

"ہے ایک گھٹیا آدمی......" وریشہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "جو اپنی اچھی خاصی معصوم بیوی کو چھوڑ اپنی سالی پر بری نظر رکھتا ہے۔"

"کیا بے ہودہ بکواس کر رہی ہو۔" رمشا ناگواری سے ایک دم چلا اٹھی تو وریشہ اس کا انداز دیکھ کر سہم گئی...... پھر خجالت سے بولی۔

"میں تو صرف اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"تم اپنے اندازے اپنے پاس رکھو اور اس طرح کے ڈرامے ذرا کم دیکھا کرو...... اب جاؤ اور جا کر امی کو بلا کر لاؤ...... مجھے ان سے بات کرنا ہے۔"

ہونہہ...... آخر تھی نا بڑی بہن بس دو منٹ میں اپنا اصل روپ دکھا دیا...... وریشہ کا منہ اتر گیا مگر وہ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخری کوشش کے تحت بولی......

"لاتی ہوں بلا کر...... مجھے بھی تو بتائیں نا کہ آخر ہوا کیا ہے آپ کے ساتھ جو آپ شادی کے محض ایک ہفتے بعد ہی اتنی غم زدہ نظر آرہی ہیں۔"

لانبا قد...... بھوری آنکھیں...... دلکش جسامت ترشیدہ بال اور سانولی سلونی سی رنگت...... یہ تھیں رمشا ایوب...... جو چھ ماہ قبل ہی مقامی جامعہ سے ایم ایس کر کے فارغ ہوئی تھیں۔ اور جن کے نزدیک "شادی" ایک "زبردست پیکیج" کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی...... اور...... جی؟ کیا پوچھا آپ نے؟ کیسا پیکیج؟ ارے وہی پیکیج نا...... جو آج کل کی "مائیں" اپنی اپنی بیٹیوں کے لیے ڈھونڈ رہی ہیں......

www.pklibrary.com

بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ڈھونڈنے کی خاطر دھڑا دھڑ اشتہاری "میچ میکرز" کی مٹھیاں گرم کر رہی ہیں۔ اچھی سی ڈگری والا ایک عدد کاٹھ کا الو...... جو سیدھا آسمان سے ٹپکے (یعنی نہ اس کے آگے کوئی ہو...... نہ ہی پیچھے) اور ان کی جھولی میں آگرے...... کسی پوش علاقے میں ایک فرنشڈ گھر یا چلو فلیٹ ہی ہو اس کی ملکیت ہو...... اور جو "ہنی مون" پر ان کی نور نظر کو کم از کم دبئی، تھائی لینڈ اور بنکاک تو لے ہی جاسکے۔

خیر جی...... تو ہم ذکر کر رہے تھے رمشا ایوب کا کہ جن کی والدہ فہمیدہ (محض نام کی) کو ان کے لیے بالکل ایسا ہی کوئی گوہر نایاب درکار تھا۔ جو رمشا کی بلند قسمت کی بدولت جلد ہی انہیں دستیاب بھی ہو گیا اور صد شکر کہ اس کے بالوں میں چاندی اترنے سے پہلے اس کے ہاتھوں میں لالی رچ گئی...... مگر وہ کہتے ہیں نا کہ۔ لاکھ چھان ڈالو...... قسمت کا "کرکرا" پھر بھی نہیں چھنتا...... تو بس...... ایسی ہی صورت حال کا سامنا اس وقت رمشا ایوب کو تھا...... کیا پوچھا؟ کیسی صورت کا سامنا......؟

ذرا اور یہ تو لیں...... وہی تفصیل تو سنائی جا رہی ہے آپ کو...... خیر۔

ہاں...... تو ہوا کچھ یوں کہ......

"تیل اگر کچا رہ جائے تو سالن میں ہیک آجاتی ہے تو اس لیے بہتر ہے کہ پہلے تیل کو اچھی طرح گرم ہونے دیا جائے۔" لو یہ ہو گیا تیل گرم...... اب ہم اس میں سب سے پہلے یہ تھوڑا سا پسا ہوا میتھی دانہ ڈالیں گے...... اور خیال رہے کہ زیادہ نہیں ڈالنا ورنہ سالن کڑوا ہو جائے گا۔ کلیئر؟"

اب اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ مکالمے کسی خاتون خانہ کے ہیں تو آپ غلطی پر ہیں کیوں کہ یہ الفاظ کسی خاتون خانہ کے نہیں بلکہ "مردِ خانہ" کے ہیں اور جنہیں زمانے والے روحان وجیہہ الدین کے نام سے جانتے ہیں۔

دیکھا؟ رہ گئے نا آپ حیرت زدہ...... مگر ابھی سے خوامخواہ اس قدر حیران ہونے کی چنداں ضرورت نہیں کہ آگے بہتیرے مواقع آئیں گے...... فی الوقت تو ہم اس منظر کی جانب واپس پلٹتے ہیں کہ جہاں روحان اپنے پرتعیش باورچی خانے میں سفید ایپرن پہنے کھڑا تھا...... چولہے پر درمیان کڑاہی دھری تھی۔ جس سے دھواں اٹھ رہا تھا...... اور دھواں تو خیر اس وقت گلابی جوڑے میں ملبوس رمشا روحان کا چہرہ بھی ہو رہا تھا کہ آج اس کی شادی کا چوتھا دن تھا...... اور وہ سر شام ہی بج سنور کر اس نیت سے بیٹھی تھی کہ آج تو "ڈنر" کرنے وہ اپنے میاں جی کے ساتھ باربی کیو ٹونائٹ جائے گی مگر ہوا کچھ یوں کہ اس کی لاڈ بھری فرمائش پر روحان پہلے تو مسکرا دیا...... پھر بولا۔

"چھوڑو نا یار...... یہ باربی کیو ٹونائٹ...... پھر کبھی چلیں گے...... آج تو ایسا کرو کہ تم اپنے ان پیارے پیارے ہاتھوں سے بنا کر مجھے چکن کڑاہی کھلا دو...... گھر کی کھائے بہت دن گزر گئے۔"

"چکن کڑاہی......" رمشا نے پہلے تو خاصے تعجب سے اپنے خوبرو چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑے "اپنے" چار دن پرانے مجازی خدا کو دیکھا......

پھر یکایک آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور پست لہجے میں بولی۔

"مگر مجھے تو چکن کڑاہی بنانا ہی نہیں آتی۔"

دراصل اسے کہنا یہ چاہیے تھا کہ مجھے سوائے باتوں، نئے کپڑوں اور نت نئے ہیر اسٹائلز کے علاوہ اور کچھ بھی بنانا نہیں آتا...... مگر اس نے عظیم عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف "چکن کڑاہی" کہنے پر اکتفا کیا تھا اس پر بھی بے چارہ اچھل پڑا۔

"وہاٹ؟" کیا کہا...... تمہیں چکن کڑاہی جیسی سمپل ڈش بنانا نہیں آتی؟"

"نہیں......!" رمشا اس کا انداز دیکھ کر خائف ہو گئی تب ہی ہونٹ لٹکا کر خاصے معصومانہ انداز سے

نفی میں سر ہلانے لگی......

"چلو کوئی بات نہیں......" وہ کوئی پتھر دل جلاد تو تھا نہیں جو محض تین دن پرانی زوجہ کے چہرے پر چھائی معصومیت اور خوف زدگی دیکھ کر بھی نہ پگھلتا......

"تو پھر ہم چلیں؟" رمشا کا اترا چہرہ سرتاج کے مان جانے پر کھل اٹھا......

"ہاں...... میں ذرا ایپرن پہن لوں......" وہ اپنی کلائی سے گھڑی اتارتا ہوا اپنے تئیں "جانے کے لیے" تیار ہوتا ہوا بولا۔

"آپ ایپرن پہن کر باہر جائیں گے؟" رمشا نے بوکھلا کر پوچھا۔

"باہر نہیں کچن میں......" اس نے مسکرا کر بڑے انداز سے سامنے موجود باورچی خانے کی جانب اشارہ کیا...... اسٹور روم میں جا کر الماری سے نیا نکور ایپرن برآمد کر کے پہنا اور جب واپس باہر نکلا تب پریشان کھڑی رمشا نے پریشانی ہی سے استفسار کیا۔

"مگر کچن میں جا کر کیا کریں گے؟"

"اپنی بیگم کو اپنے ہاتھوں سے بنا کر مزے دار سی کڑاہی کھلائیں گے......اور کیا۔"

"کیا؟" وہ متعجب ہو کر ہلکا سا چیخی...... "آپ کو کھانا بنانا آتا ہے؟"

"کوئی ایسا ویسا......؟" وہ فریزر سے چکن کا پیکٹ نکال کر پلٹا اور دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر تفاخر آمیز انداز سے سر کو ہلکا سا خم کر کے بولا۔

اور رمشا تو اس کا جواب سن کر ایسے چپ ہو گئی گویا کہنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو...... مگر اس کے پاس کہنے کو اگر کچھ نہ بچا تھا تو کیا ہوا؟ روحان کے پاس تو نہ صرف کہنے کو بلکہ اسے سکھانے کو بھی بہت کچھ موجود تھا۔ تب ہی بڑے مصروف انداز سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے کچن سے دوستانہ آواز میں ہانک لگائی۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو...... ادھر آؤ نا۔ مجھے دیکھو میں کڑاہی کیسے پکا رہا ہوں اگر دیکھو گی نہیں تو آئندہ مجھے پکا کر کھلاؤ گی کیسے؟"

اور ہفت آسمان ٹوٹ پڑنا کسے کہتے ہیں یہ آج جا کر رمشا بی بی پر روشن ہوا تھا۔

☆☆☆

"تو پھر کیسی لگی تھی میرے ہاتھ کی کڑاہی۔" اگلی دوپہر ٹی وی دیکھتے ہوئے روحان نے اچانک داد طلب نگاہوں سے اسے دیکھ کر استفسار کیا۔ وہ جو گرین ٹی کا کپ لیے بیٹھی تھی چونک گئی۔

جی تو چاہا کہ کہہ دے "بڑی زور سے لگی تھی" مگر مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر...... اسی لیے شہد آگیں لہجے میں بولی۔

"بہت زبردست، بے حد ٹیسٹی۔"

"ہے نا!" وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔ پھر محبت سے لبریز پرجوش لہجے میں بتانے لگا۔

"یہ میری اماں کی اپنی خاص ریسپی تھی۔ جانتی ہو۔ انہیں بازاری تیار مسالوں سے خاص چڑ تھی۔ وہ کھانا پکاتے وقت بڑی محنت کی قائل تھیں۔ ہلدی، مرچیں، چاٹ مسالہ، گرم مسالہ خود اپنے ہاتھوں سے گھر میں پیسا کرتیں۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا تب تک وہ اپنی اسی روٹین پر کاربند رہیں۔ مگر جب انہیں فالج کا اٹیک ہوا تو گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ بہت کڑا وقت تھا وہ میرے لیے۔"

وہ بولتے بولتے آخر میں اداس سا ہو گیا۔ رمشا جو بڑی توجہ اور بھرپور دلچسپی سے اس کے ماضی کے اوراق میں تصور کی آنکھ سے جھانک رہی تھی — اس کی کیفیت سمجھ کر نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ اس کے لمس کو محسوس کر کے جیسے حال میں واپس پلٹا۔ پھر اپنا بایاں ہاتھ اپنے دائیں کندھے پر دھرے رمشا کے ہاتھ کے اوپر رکھ کر پھیکے انداز سے مسکرا کر مزید گویا ہوا۔

"ابا تو بہت پہلے ہی ہمیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔

میرے لیے جو کچھ بھی تھیں ایک اماں ہی تو تھیں......
اسی لیے میں نے اپنے طور پر ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی...... جب کہ ان دنوں خود میرے اپنے کھانے پینے کا بہت مسئلہ ہو گیا تھا۔"

"اس میں مسئلہ والی کیا بات تھی روحان!" رمشا بولی۔ "آپ باہر جا کر کھا لیتے یا پھر آرام سے گھر میں آرڈر کر کے منگوا لیتے۔"

"کیا بات کر رہی ہو یار؟" روحان برا مان کر بولا۔ "میں نے ساری زندگی باہر کے کھانے نہیں کھائے تو اس وقت کیسے کھا لیتا؟"

"جو کام تمام عمر نہ کیا ہو۔ وہ بحالت مجبوری کبھی نہ کبھی کر ہی لیا جاتا ہے۔"

وہ باقاعدہ بحث پر اتر آئی۔

"یار......" وہ بولا "اب میں اتنا بھی مجبور نہیں تھا اور پھر یہ کوئی ایک دو دن کی بات تو تھی نہیں بس یہی سوچ کر میں نے اماں سے پوچھ پوچھ کر پکانا شروع کر دیا۔"

"کیا؟" رمشا کا ہاتھ ایک جھٹکے سے روحان کے کندھے سے ہٹا۔

"کیوں؟" روحان نے تعجب سے اس کا بے تکا انداز ملاحظہ کیا۔ "تمہیں کیا ہوا؟"

"کک ...... کک ...... کچھ نہیں۔" رمشا نے اپنے تاثرات پر قابو پا کر کہا۔

"لیکن کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ آپ اتنی مشقت اٹھانے کے بجائے کوئی شیف رکھ لیتے؟"

"میں رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"مگر کیوں؟" وہ جیسے احتجاجاً بولی کہ روحان کی گفتگو کی روشنی میں اسے اپنے مستقبل کا نقشہ ضرورت سے زیادہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"کیونکہ مجھے اپنی اماں کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کا ذائقہ کبھی پسند ہی نہیں آیا۔ اور ان کے بعد اگر مجھے کسی اور کے ہاتھ کا ذائقہ بھایا ہے تو وہ تم ہو۔"

"جی؟" اس بار رمشا حقیقتاً اچھل پڑی......
مسلسل ہاتھ...... ہاتھ کی گردان نے اس کا ہاتھ...... اوہ یعنی کہ دماغ ہی گھما ڈالا۔

"مگر میرے ہاتھ کا پکا کھانا آپ نے کب کھایا؟" وہ اپنے ڈولتے دماغ کو قابو میں کرنے کی سعی ناکام کرتے ہوئے تعجب سے گویا ہوئی۔

"اوہ...... اس قدر جلد بھول گئیں۔" روحان اسے دیکھ کر دل کشی سے مسکرایا۔

"یاد کرو کہ جس دن میں اپنی پھپھو کے ساتھ تمہارے گھر رشتہ دیکھنے آیا تھا۔ تم نے کتنے مزے دار چپلی کباب اور مونگ کی دال کا حلوہ بنایا تھا۔ سوندھا

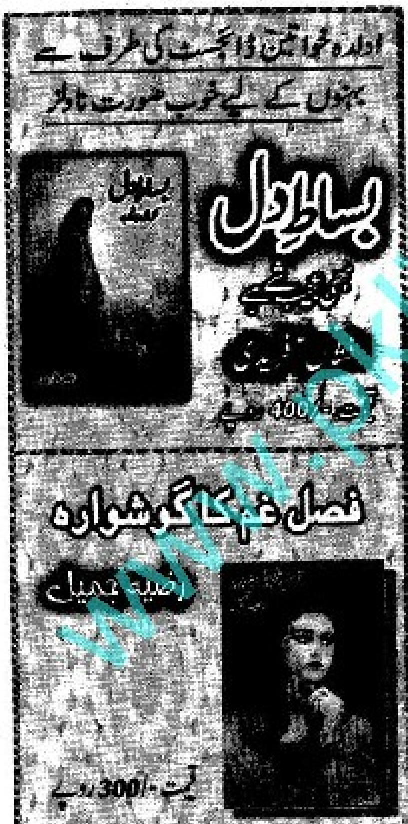

www.pklibrary.com

سوندھا اور خوش رنگ...... بالکل میری اماں کی طرح......میں نے تو اس دن گھر لوٹنے کے ساتھ ہی پھپھو کو کہہ دیا تھا کہ بس اب اس لڑکی کو ہاتھ سے جانے نہ دیں......اس کے ہاتھ میں بالکل میری اماں کے ہاتھوں جیسا ذائقہ ہے۔'' وہ سرشاری سے بتاتے گیا......اس بات سے قطعی بے خبر کہ ابھی ''ہاتھوں'' کے چکر میں خود اس کے ساتھ ''ہاتھ'' ہو چکا ہے۔

''مم......مگر......'' رمشا نے ہکلاتے ہوئے کہنا چاہا۔ ''مجھے تو کچھ بھی......میں تو......وہ تو......''

''ارے یار اب چھوڑ یہ اگر مگر......اور یہ بتاؤ کہ رات کو کھانے میں کیا بنا رہی ہو......ایسا کرو کہ چپلی کباب ہی بنا لو......کیوں کیا خیال ہے؟'' وہ رائے طلب نگاہوں سے سوالی انداز سے ششدر بیٹھی رمشا کو دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

اور رمشا کا دل اس وقت دھاڑیں مار مار کر رونے کا چاہ رہا تھا لہٰذا بلا تکلف وہ دھاڑیں مار مار کر ایک دم رو دی......

اب بوکھلانے کی باری روحان کی تھی۔

''غضب خدا کا......'' فہمیدہ سامنے بیٹھی رمشا کے منہ سے سارے حالات جان کر تلملاتے ہوئے بولیں۔ میں نے تو اکیلا لڑکا دیکھ کر لڑکی دی تھی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ نام نہاد اکلوتا لڑکا اپنے اندر پورا سسرال سموئے بیٹھا۔''

''ابھی تو میں آپ کی یاد کا بہانا کر کے یہاں چلی آئی اور چپلی کباب بنانے سے میری جان چھوٹ گئی۔ مگر کب تک جلد یا بدیر آخر کار آپ کے داماد پر یہ راز کھل ہی جاتا ہے کہ مجھے کوکنگ وکنگ کرنا نہیں آتی......سوچیے تب کیا ہوگا؟ میں پوچھتی ہوں آخر آپ کو یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔'' وہ بے حد ناراضی سے بولی۔

''غضب خدا کا......'' وہ جز بز ہو کر بولیں، سارا زمانہ رشتے ناتے جوڑتے وقت ایسے ''بے ضرر'' سے جھوٹ بول ہی دیتا ہے اگر میں نے بھی بول دیا تو ایسی کون سی قیامت آ گئی۔''

''میرے لیے تو تمہیں آہی گئی نا......'' وہ بگڑ کر بولی۔ ''کیا میں نے اتنی محنت سے ایم ایس سی اسی لیے کیا تھا کہ یوں قورمے، بریانیاں پکا کر خود کو ''ضائع'' کروں۔''

''کیا ایم ۔ ایس کرنے والیوں پر قورمے، بریانیاں پکانا حرام ہو جاتا ہے؟''

وریشہ جو اپنی عادت سے مجبور ہو کر کھڑکی سے لگی کن سوئیاں لے رہی تھی بے اختیار بول پڑی......مگر پھر فوراً ہی اپنی عظیم حماقت کا احساس ہونے پر اپنی چل جانے والی زبان لبوں تلے دبا بھی لی مگر کیا فائدہ؟

''غضب خدا کا......'' فہمیدہ جو تنک کر بیٹھی ہوئی تھیں چونک کر ایک دم غصے سے چلائیں۔

''تو نہیں سدھرے گی وریشہ......ناک کٹوائے گی میری اپنے سسرال جا کر۔''

اور وریشہ نے جو یہ سنا تو وہاں سے فی الفور چمپت ہونے ہی میں عافیت جانی مبادا فہمیدہ باہر آ کر اس کی ''تواضع'' شروع کر دیں۔

''اس کے سسرال کی فکر چھوڑیں۔'' رمشا نخوت سے ناک چڑھا کر انہیں اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اور مجھے یہ بتائیں کہ میں روحان کا کیا کروں۔''

''تم کیا کرو گی؟'' فہمیدہ وریشہ پر آیا غصہ جھٹک کر بولیں۔ ''غضب خدا کا ہم نے تو یہی سوچ کر تمہاری شادی وہاں کر دی کہ لمبی چوڑی سسرال کا کوئی جھنجھٹ نہیں، چولہے کے آگے کھڑے ہو کر اپنی جوانی گھلانے سے تمہاری جان بچی رہے گی۔ مگر نہ جی۔'' انہوں نے اپنی گردن کو زوردار جھٹکا مارا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ......'' رمشا روہانسی سی ہو کر بولی۔ ''پھر ایک دو دن کی کوئی بات ہو تو میں کسی طرح کچھ ''مینیج'' کر بھی لوں۔ مگر اس طرح روز، روز کھانا پکانا تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''تو فکر مت کرو۔'' فہمیدہ بیٹی کا اترا چہرا دیکھ کر بولیں۔ 'آ جائے رات کو روحان' میں کرتی ہوں اس

www.pklibrary.com

سے بات۔“

☆☆☆

”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟“ جس وقت فہمیدہ اور رمشا اپنے خفیہ مذاکرات ختم کرکے آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئیں، ٹی وی دیکھتے ہوئے ایوب صاحب نے ٹی وی کی آواز بند کرکے ان کی جانب متوجہ ہوکر خاصے سخت لہجے میں استفسار کیا تو دونوں ایک دم گھبرا گئیں۔

”آپ نے تو آواز ہی بند کردی۔“ فہمیدہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاکر بولیں۔ ”پھر ہم کیسے بتا سکتے ہیں کہ آپ کیا سن رہے تھے؟“

”میں یہ بات نہیں۔“ وہ ”پوچھ رہا ہوں۔“ بارعب شفیق چہرے پر یہ کہتے ہوئے سختی نمایاں ہوئی۔

”کیا یہ وہ...... یہ وہ کیے جارہے ہیں؟“ فہمیدہ ان کے مقابل دھرے کاسنی رنگ کے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے جھلاہٹ سے بولیں...... رمشا بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”وہی جو تم دونوں اندر خفیہ مذاکرات کررہی تھیں۔“ وہ در پردہ طنزیہ پیرائے میں مگر بظاہر متانت سے بولے۔ ”میں اس کے متعلق پوچھ رہا ہوں؟“

پوچھ تو وہ ضرور رہے تھے مگر انہیں بتانا آسان کب تھا۔ اسی لیے تو وہ ماں بیٹی ان سے رازداری برت رہی تھیں مگر یہ وریشہ کی بچی...... ایوب صاحب کی مخبر......

”جب آپ کو، آپ کی وہ ”خبری“ پہلے ہی ساری خبریں دے چکی ہے تب آپ ہم سے کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں؟“ فہمیدہ پہلے تو کچھ چپ ہی ہوگئیں مگر پھر فوراً ہی دانت پیس کر بولیں...... تب ہی اچانک کسی کونے سے نمودار ہوکر وہ ”معصوم خبری“ منمناتی آواز میں اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

”میں نے کیا، کیا کیا ہے...... وہ تو ابو نے جب مجھ سے پوچھا کہ تمہاری امی کہاں ہیں تو......“

”غضب خدا کا“ اس کے وضاحتی انداز پر فہمیدہ مزید بھڑک اٹھیں۔ ”باپ نے صرف اتنا پوچھا کہ ماں کہاں ہے اس پر تو نے اپنی طرف سے پوری کہانی بنا کر سنا ڈالی۔ کچھ شرم کرلے کہیں تو آگے جاکر جوتے کھائے گی۔“

وہ قہر آلود نگاہوں سے اسے گھور کر بولیں۔ ان کی لتاڑ سیدھا اس کے نازک دل پر جا لگی۔ اسی لیے آنکھیں بھر آئیں۔

”دیکھ لیں۔“ وہ ڈبڈبائی نگاہوں سے ایوب صاحب کی جانب دیکھ کر شکایتی لہجے میں بولی۔ ”یہ سلوک ہوتا ہے اس گھر میں میرے ساتھ۔“

”تمہارے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ برا ہونا چاہیے۔“ اس سے پہلے کہ ایوب صاحب اسے کوئی تسلی آمیز جملہ کہہ پاتے رمشا سلگ کر بولی۔ اور کیسے نہ سلگتی۔ ان کی ساری احتیاط پسندی اس ڈرامہ کوئین کی بدولت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ ڈرامہ کوئین نے ایک ناراض نظر اپنی جلاد صفت بڑی بہن پر ڈالی اور احتجاجاً پیر پٹختی ہوئی وہاں سے واک آؤٹ کرگئی۔

”بہت بری بات ہے رمشا!“ ایوب صاحب ناپسندیدہ لہجے میں اسے سرزنش کرتے ہوئے بولے۔ ”چھوٹی بہن سے بھلا اس لہجے میں بات کرتے ہیں؟“

”اور جو اس نے آپ کے کان بھرے وہ؟“ رمشا منہ بسور کر بولی۔ ”آپ نے اس پر اسے کیوں نہیں ڈانٹا؟“

”کوئی کان نہیں بھرے اس نے میرے۔“ ایوب صاحب نے بتانا چاہا مگر اس بار فہمیدہ تنک کر بولیں۔

”پھر آپ کو کیسے پتا چلا کہ اندر ہماری کوئی میٹنگ چل رہی ہے؟“

”ہاں......“ ایوب صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ اطلاع اس نے ضرور دی تھی۔“

”تو یہ آپ کی نظر میں آگ لگانا نہ ہوا؟“ وہ رو دینے کو ہو کر بولیں۔

”تم الٹا بحث کرنے کے بجائے مجھے سیدھی طرح بتاؤ گی کہ آخر کیا مسئلہ ہے؟“

ایوب صاحب بالآخر جلال میں آگئے...... اور یہ ان کا وہ روپ تھا کہ جس کے آگے فہمیدہ میں دم مارنے کی مجال نہ تھی اس لیے پینترا بدل کر لہجے کو دانستہ لاپروا بنا کر بولیں۔

"ارے کیا مسئلہ ہوگا؟ ماں بیٹی کے درمیان ہزاروں باتیں ہوتی ہیں۔ اب آپ کو کیا کیا بتاتے پھریں؟"

"یہ کھانا پکانے کا کیا قصہ ہے...... اتنا ہی بتا دو تو مہربانی ہوگی۔" اس مرتبہ ایوب صاحب نے انہیں گھور کر سیدھا سوال پوچھا تو یک لخت چپ کی چپ رہ گئیں...... رمشا کی تو گویا سٹی گم ہوگئی۔

"دراصل......" فہمیدہ چند ثانیے بعد بولیں۔

"روحان...... رمشا سے کوکنگ کروانا چاہتا ہے۔" ان کا لہجہ کچھ ایسا تھا گویا وہ اس سے زبردستی کوئی قتل کروانا چاہتا ہو۔

"اچھا......" ایوب صاحب نے منہ لٹکائے بیٹھی رمشا کی جانب دیکھ کر تمسخر سے کہا۔ "تو پھر کرو کوکنگ...... اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟"

"مگر مجھے پراپر کوکنگ کب آتی ہے؟" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"کوئی بات نہیں اب آجائے گی...... شاباش تم کوشش تو کرو۔" وہ اسے پچکار کر اس کی ہمت بندھانے کی خاطر یوں بولے مگر فہمیدہ کا مارے طیش کے برا حال ہوگیا۔

"غضب خدا کا...... جب بھی دیں گے۔ الٹی ہی صلاح دیں گے۔" وہ سلگ کر بولیں۔

"ارے وہ کیوں پکائی پھرے کھانے...... کیا ہم نے اسی دن کے لیے لاکھوں کمانے والے کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھمایا تھا کہ وہ جا کر باورچی خانے میں کھڑا کردے۔ غضب خدا کا...... بجائے اسے سمجھانے کے اپنے داماد کو کیوں نہیں سمجھاتے کہ وہ اسے شیف رکھ کر دے۔ کیا میری بیٹی کا اتنا بھی حق نہیں؟"

"پہلے اسے اپنے فرائض تو پورے کر لینے دو۔" ایوب صاحب ان کی جارحانہ تقریر کے جواب میں تحمل سے بولے۔ "پھر ہم اس کے حقوق کی بات کرتے اچھے بھی لگیں گے۔"

رمشا والد بزرگوار کی دانائی سے لبریز گہری بات پر غور کرنے کی زحمت کیے بغیر برے برے منہ بنانے لگی۔ فہمیدہ کو بھی موصوف کی فلاسفری ایک آنکھ نہ بھائی اسی لیے بگڑ کر بولیں۔

"یعنی آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی اپنے گھر میں محض باورچن بن کر رہ جائے۔"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری بیٹی اپنے گھر میں راج کرے۔"

"یہی تو میں بھی چاہتی ہوں تب ہی تو آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ روحان سے باورچی رکھنے کی بات کریں...... اگر آپ بات نہیں کریں گے تو مجبوراً پھر مجھے ہی یہ کام کرنا پڑے گا۔" وہ بہت بے چارگی سے بولیں تو ایوب صاحب نے بے ساختہ انہیں گھور کر دیکھا۔

"تمہیں اتنا مجبور ہونے کی ضرورت نہیں...... بات ضرورت پڑنے پر میں روحان سے خود کرلوں گا...... فی الحال تمہارا جو فرض بنتا ہے وہ ادا کرو۔" وہ قطعیت سے کہہ کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے اور غالباً مزید بحث سے دامن بچانے کی خاطر وہاں سے چل دیے۔

"اب کیا ہوگا امی...... ابو نے تو بات کرنے سے صاف انکار کردیا...... اب میں کیا کروں گی۔" والد کے لاؤنج عبور کرتے ہی اتنی دیر سے لب بستہ بیٹھی رمشا سخت پریشانی سے بول پڑی۔

"کھانا پکانا سیکھ لو...... اور بھلا کیا کروگی؟" اب ہوتی اگر فہمیدہ کی جگہ کوئی واقعتاً ذی عقل خاتون تو یقیناً اپنی دختر نیک اختر کو یہی صلاح دیتی مگر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے کہ فہمیدہ خاتون کو تو لفظ "فہم" سے محض نام ہی کی حد تک علاقہ تھا لہٰذا وہ پھر دبی سی آواز میں غرا کر بولیں۔

www.pklibrary.com

"انہیں تو تم رہنے ہی دو...... اور اب غور سے میری بات سنو۔"

اور پریشان حال رمشا کی پریشانی کا شان دار حل اس بلا کی ذہین و فطین خاتون نے کیا نکالا؟ یہ جاننے کی خاطر ہمیں فی الفور اگلے منظر کی جانب بڑھنا پڑے گا۔ تو پھر دیر کس بات کی؟ بڑھیے نا...... بلکہ پڑھیے نا......

☆☆☆

رات کے گیارہ، ساڑھے گیارہ کا عمل تھا جب میکے سے اس کی واپسی ہوئی۔ سارے راستے وہ والدہ ماجدہ کے زریں مشوروں کی روشنی میں ان الفاظ کا چناؤ کرتی رہی جنہیں استعمال کرتے ہوئے اس نے روحان کے سامنے اس دکھڑے پر بات کرنی تھی جو وہ آج اپنی اماں حضور کے روبرو "رو" کر آئی تھی...... بہرحال تو ہم بتا رہے تھے کہ رات ساڑھے گیارہ بجے رمشا کی اپنے گھر واپسی ہوئی۔ کپڑے وغیرہ تبدیل کرتے کرتے بارہ بج گئے...... روحان نجانے کہاں مصروف تھا؟ وہ اس کی تلاش میں کمرے سے باہر نکلی تو وہ کافی کے دو کپ تھامے باورچی خانے سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔

"یہ لو گرما گرم کافی...... چلو ٹیرس پر چل کر پیتے ہیں۔" اس نے جوش و خروش سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اس کے ساتھ لاؤنج سے ملحقہ ٹیرس پر نکل آئی...... باہر بادلوں سے ڈھکی رات کا سحر پھیلا ہوا تھا۔ سرگوشیاں کرتی سرد ہوا اپنے سنگ کہیں سے رات کی رانی کی مہک چرا لائی تھی...... چہار اطراف بکھرا معنی خیز دل نشیں سناٹا...... ایک پل کو جیسے رمشا اپنے سارے تفکرات یکسر بھلا بیٹھی۔

"موسم کس قدر حسین ہے نا روحان......" وہ اس پل کی رومانویت میں بہہ کر بلا ارادہ کہہ گئی۔

"گاجر کا گرما گرم حلوہ اس موسم میں کتنا مزے دار لگتا ہے۔" اس کے برابر میں کھڑا کافی کی چسکیاں لیتا روحان حسرت زدہ لہجے میں ایک دم بولا تو رمشا کے کان جو روحان کی جانب سے "موسم حسین ہے مگر تم سے کم" کی طرح کا کوئی نرم گرم سا جملہ سننے کے منتظر تھے بری طرح جھنجنا اٹھے۔

"روحان!" وہ سخت بے مزہ ہو کر ہلکی سی آواز میں چلائی۔ "آپ کھانے پینے کے علاوہ بھی تو کوئی اور بات کر لیا کریں۔"

"اتنی مشکلوں سے تو میری زندگی میں یہ "بہار" آئی ہے۔ تب میں کوئی اور بات کیوں کروں؟" وہ ذرا برا مان کر بولا۔ "تم نہیں جانتیں رمشا، میں گھر کے کھانے کھانے کے لیے کس قدر ترسا ہوا ہوں۔" وہ بولتے بولتے جذباتی سا ہو گیا تو رمشا نے گردن موڑ کر اسے خاصی عجیب نظروں سے گھورا۔

"یعنی کھانا کھانے کے علاوہ آپ کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں۔" اس نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے یہ کب کہا؟" وہ بہت حیران ہو کر رمشا کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"کہا تو نہیں مگر آپ کا ندیدہ پن تو یہی ظاہر کرتا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی تو روحان گہرے رنج میں ڈوب گیا۔

"تم کچھ نہیں جانتیں نا...... اس لیے یہ بات کہہ رہی ہو۔"

"کیا نہیں جانتی؟" وہ چونکی تو روحان ایک دم سنبھل کر بولا۔

"کچھ نہیں...... چھوڑو یہ بے کار بات...... اور یہ بتاؤ جواد کی دعوت کرنے کے لیے یہ اتوار کیسا رہے گا؟"

"کون جواد؟" رمشا جو اس اچانک حملے کے لیے قطعی تیار نہ تھی ایک دم بوکھلا گئی۔

"حد ہے یار......" روحان نے کافی کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد خالی کپ منڈیر پر ایک طرف رکھتے ہوئے ہلکی سی خفگی سے کہا۔ "تمہیں بتایا تو تھا جواد کے بارے میں کہ میرا بہترین دوست ہے۔ کیا بھول گئیں؟"

"ہاں...... ہاں شاید...... آپ نے بتایا تو تھا" وہ بوکھلاہٹ پر قابو پا کر ذہن پر زور ڈالنے لگی۔

www.pklibrary.com

"ہاں تو بس جواد کی دعوت کرنی ہے۔ مجھے اس اتوار کو۔"

"لیکن دعوت تو اصولاً انہیں ہماری کرنا چاہیے۔" وہ ذرا چڑ کر بولی۔

"اس کا رسک تو وہ شاید کبھی نہ لے۔" روحان مزہ لینے والے انداز سے ہنس پڑا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" رمشا کا منہ بن گیا۔

"واقعی اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں البتہ جواد کے لیے رونے کا مقام ضرور ہے کیوں کہ بقول اس کے اس کی بیگم کو اچھا کھانا پکانا نہیں آتا۔" وہ سنبھل کر وضاحتی لہجے میں بولا۔

"تو نہ پکوائیں بیگم سے کوئی شیف رکھ لیں۔" رمشا کے نزدیک شاید دنیا بھر کے مسائل کا یہی ایک واحد حل تھا۔

"وہ تو رکھنا چاہتا ہے مگر اس کی بیگم نہیں مانتی اور یہ اس کا موقف ایک لحاظ سے اپنی جگہ درست بھی ہے۔ میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ اپنے گھر والوں کے لیے کھانا پکانا خاتون خانہ ہی کی ذمے داری ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو رمشا جز بز ہو کر کہنے لگی۔

"مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جہاں مجبوری ہو وہاں تو انسان کسی شیف کی خدمات لے سکتا ہے۔"

"ہاں......" روحان نے تائیداً سر اگر اثبات میں ہلایا۔ "جہاں مجبوری اور ضرورت ہو۔ وہاں سوچا جا سکتا ہے۔"

"پر آپ نے تو اپنی امی کے پیرالائزڈ ہونے پر انتہائی مجبوری اور ضرورت کے تحت بھی شیف نہ رکھا۔" وہ اس کے قول و فعل کے اس قدر کھلے تضاد پر کھول کر طنزیہ بولی تو وہ یکبارگی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ سا منہ بنا کر بولا۔

"ہاں...... میں نے تو نہیں رکھا کیوں کہ میرا مسئلہ ذرا دوسرا تھا۔"

"اور وہ مسئلہ کیا تھا؟" رمشا کا طنز کرنے کے لیے ٹیڑھا ہوا منہ اب بھی سیدھا نہ ہوا۔

"او یار......" اب کی بار وہ سخت جھنجلا گیا۔ "چھوڑو نا میری بات...... اور یہ بتاؤ کہ پھر کر لوں میں اس اتوار جواد کو مدعو؟" روحان کے اس سوال پر رمشا بے چاری کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے عجیب مضحکہ خیز سے ہو گئے کہ ہم سے تو اپنے قہقہے کا گلا گھونٹنا دوبھر ہو گیا۔ تب ہی تو ہم فوراً سے پیشتر وہاں سے کھسک لیے مبادا ہم خود پر سے اختیار کھو بیٹھیں اور بندر کی بلا آ پڑے طویلے پر۔

☆☆☆

"آج ہم آپ کو بتائیں گے گھر بسانے کے چار سو خفیہ، نادر و نایاب طریقے جو ناظرین کہیں جانیے گا مت ہم یوں گئے اور یوں آئے۔"

اسکرین پر جلوہ گر چھیل چھبیلی سی مارننگ ہوسٹ جو اپنے تیسرے شوہر سے بمشکل جان خلاصی کروا کر آج کل بالکل فارغ تھیں نے چٹکی بجاتے ہوئے اعلانیہ انداز سے کہا تو بالائی تھرا پایا چائے میں ڈبو ڈبو کر تناول فرماتی فہمیدہ نے منہ بناتے ہوئے ٹی وی کی آواز کم کر دی اور ابھی چینل تبدیل کرنے ہی والی تھیں کہ سامنے میز پر دھرا ان کا سیل فون ایک تھرتھراہٹ کے ساتھ گنگنا اٹھا...... پہلے تو وہ بے طرح چونک گئیں...... پھر فون اٹھا کر دیکھا۔

رمشا کا تھا...... لہٰذا فطری طور پر پریشان ہو کر انہوں نے چائے پاپے کی چھوٹی سی ٹرے گود سے اٹھا کر سامنے میز پر پٹخی اور جلدی سے سبز بٹن دباتے ہوئے فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو رمشا...... کیا ہوا سب خیریت تو ہے...... یہ اتنی صبح ہی صبح تمہیں میری یاد کیسے آ گئی؟"

"یاد تو مجھے آپ کی ساری رات ہی آتی رہی امی......" دوسری جانب وہ علیک سلیک کے بعد بولی۔

"کیوں...... کیا ہوا......؟" فہمیدہ چونکی ہو کر بولیں۔ "تمہاری بات ہوئی روحان سے؟ کیا کہا اس نے؟"

"وہ تو مجھ سے اپنے دوستوں کی دعوتیں

کرواتے کو تیار بیٹھے ہیں امی۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "اب آپ ہی بتائیے...... ایسی صورت میں ان کے سامنے یہ اقرار کیسے کروں کہ مجھے کچھ بھی پکانا نہیں آتا۔"

"غضب خدا کا...... میں نے کل تمہیں اتنا سمجھا بجھا کر تو بھیجا ہے اور تم اب پھر وہی سوال کر رہی ہو کہ اقرار کیسے کروں...... بات کیسے کروں۔" انہیں غصہ آنے لگا اس کی کم ہمتی پر......

"مجھے ان کا متوقع ردعمل خوف زدہ کر رہا ہے امی......" وہ کسی قدر بے چارگی سے بولی تو اس بار فہمیدہ اپنے ابلتے غصے کو دبا کر نسبتاً نرم لہجے میں بولیں۔

"اری بزدل...... اس میں اس قدر ڈرنے والی کیا بات ہے بھلا...... ارے آج کل کی شاطر لڑکیاں تو اپنے "میاؤں" سے جانے کیا کیا کچھ منوا لیتی ہیں اور یہاں تم ہو کہ تم سے صرف یہ ایک "بات" نہیں سنبھالی جا رہی ہے۔"

"بات نہیں جھوٹ...... اور وہ بھی "سفید"۔" وہ مرے مرے سے لہجے میں بولی تو اس بار فہمیدہ نے اپنے امڈتے طیش کو قابو کرنے کا تردد بالکل نہ کرتے ہوئے غضب ناکی سے کہا۔

"غضب خدا کا...... کہہ لو...... تم بھی ماں کو جھوٹا کہہ لو مگر ذرا اس بات پر بھی غور کر لینا کہ ماں نے یہ سفید جھوٹ کس کی بھلائی کی خاطر بولا تھا۔"

"ظاہر ہے کہ میری...... روحان کا رشتہ ہر لحاظ سے بہت آئیڈیل تھا اور آپ چاہتی تھیں کہ میری شادی یہاں ہو جائے۔" وہ رٹو توتے کی طرح فرفر جلدی سے بولی تا کہ فہمیدہ کچھ ٹھنڈی ہو جائیں مگر وہ نہ ہوئیں الٹا مزید بگڑ کر بولیں۔

"بس تو پھر جاؤ اور جا کر اپنے میاں سے بات کرو...... یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں جو بیٹھ کر حل نہ کیا جا سکے۔"

کہنے کو تو انہوں نے کہہ کر غصے سے فون بند کر دیا...... مگر دل تو ظاہر ہے کہ ان کا اپنی نور نظر ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ اسی لیے انہوں نے بے زاری سے ٹی وی پر جاری ناچ گانا بند کر دیا...... اور ٹھنڈی پڑتی چائے اٹھا کر لبوں سے لگالی...... اور سوچنے لگیں کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

اور بالکل یہی بات تو ہمارے ذہن میں بھی آئی تھی تب ہی تو ہم لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے اٹھ کر رمشا کے گھر چلے آئے۔

یہاں آئے تو دیکھا کہ روحان بس ابھی ابھی ہی بیدار ہوا ہے اور لاؤنج میں گم صم بیٹھی رمشا سے بڑے بشاش لہجے میں مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ۔

"اتنے دن سے تو صبح بریڈ کھا رہے ہیں۔ کیوں نہ آج تمہارے ہاتھ کے پکے گرما گرم پراٹھے ہو جائیں؟"

"مجھے پراٹھے پکانے نہیں آتے۔" پہلے تو رمشا اس کی فرمائش پر گڑبڑائی مگر پھر ایک دم ہی...... ابھی نہیں تو کبھی نہیں والے لہجے میں دل کڑا کر کے کہہ ہی گئی۔

"کیا!" یہ سن کر روحان کو جھٹکا سا لگا۔ تاہم رمشا کا شرمندہ شرمندہ سا چہرہ دیکھ کر اس نے اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے زبردستی کی مسکراہٹ سے لبوں کو زیبار کرتے ہوئے فراخ دلی سے کہا۔

"چلو...... کوئی بات نہیں...... کھانا تو تم اس قدر لاجواب بناتی ہو...... کوشش کرو تو پراٹھے بنانا بھی سیکھ ہی جاؤ گی۔ ابھی ایسا کرتے ہیں کہ پراٹھے میں بنا لیتا ہوں...... تب تک تم آلو انڈے کا مزے دار سا خاگینہ بنا ڈالو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" اس نے تائید طلب نگاہوں سے مستقل سر جھکائے بیٹھی رمشا کی جانب دیکھا...... تو وہ اس کی نگاہیں محسوس کر کے سر جھکائے جھکائے پھر بھرائی ہوئی آواز سے مجرمانہ لہجے میں بولی۔

"مجھے خاگینہ بھی بنانا نہیں آتا۔"

"کیا بات کر رہی ہو یار۔" وہ اس بار واقعی یہ سمجھا کہ رمشا اس سے کوئی مذاق کر رہی ہے تب ہی یقین نہ کرنے والے لہجے میں بولا۔ "خاگینہ تو اس

www.pklibrary.com

قدرے آسان سی ڈش ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہیں بنانا نہ آتی ہو۔"

"ممکن ہے روحان...... بالکل ممکن ہے...... کیوں کہ مجھے خاکینہ تو کیا...... کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔" وہ تیزی سے سر اٹھا کر بے اختیار چلائی تو روحان ٹھٹھک کر بے یقینی سے اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

☆☆☆

اور جوں ہی اس کا سکتہ ٹوٹا...... وہ بڑی غیر معمولی سنجیدگی سے رمشا سے بنا کوئی باز پرس کیے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدھا اس کے میکے لے آیا۔ اور اب وہ ایوب صاحب کے مہمان خانے میں کافی دیر سے خاموش بیٹھا غالباً اس خیال میں گم تھا کہ بات کی شروعات کہاں سے کی جائے؟

اس کے بالمقابل، ہلکے زیتونی رنگ کے بڑے صوفے کے ایک کونے پر بیٹھے ایوب صاحب کے چہرے سخت پریشانی تھی جب کہ اسی صوفے کے دوسرے کونے پر رونق افروز فہمیدہ، اپنے داماد کو بڑی کینہ توز نگاہوں سے گھورنے کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ پر دھرے صوفہ پر مسلسل اپنے ہونٹ چباتی اور دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود نگینہ جڑی انگوٹھی گھماتی رمشا عجب ہی عالم اضطراب میں تھی۔ اعصاب شکن صورت حال کی گھمبیرتا جب بام عروج پر جا پہنچی تب ایوب صاحب نے ہی دھیرے سے کھنکھارتے ہوئے داماد کو بڑی حلاوت سے مخاطب کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کرنے کی غرض سے کہا۔

"کیا بات ہے روحان بیٹے؟ اگر کوئی پریشانی ہے تو ہمیں اپنا بزرگ سمجھ کر بلا جھجک کہہ ڈالو۔"

"پریشانی نہیں۔" ایوب صاحب کا استفسار اسے گومگو۔ کی سی کیفیت سے نکالنے میں مددگار ثابت ہوا۔ تب ہی وہ بالآخر ایک بے بسی آمیز ٹھنڈی سانس خارج کرتا ہوا غیر معمولی سنجیدہ آواز میں گویا ہوا۔ "شکایت ہے آپ لوگوں سے...... سخت شکایت"

اور یہ شکایت اس کے لہجے و چہرے پر بھی خاصے واضح الفاظ میں درج تھی۔ جسے پڑھ کر ایوب صاحب کی پریشانی دو چند ہو گئی۔

"پر کیسی شکایت بیٹا، کچھ پتا تو چلے۔" فکر میں ڈوبی آواز میں انہوں نے ہی پوچھا۔

"جب آپ لوگوں کو ہماری پہلی ہی ملاقات میں میری پھپھو نے واضح کر دیا تھا کہ میری لائف پارٹنر کے حوالے سے کوئی اور ڈیمانڈ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کھانا پکانے کے ہنر میں طاق ہو......" "تب پھر آپ لوگوں نے ہم سے غلط بیانی کیوں کی؟" وہ طیش آمیز ناراضی کی کیفیت کے زیر اثر جواباً بولا تو اس بار ایوب صاحب کو اس کا لہجہ بہت ناگوار گزرا تب ہی وہ چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔

"کیسی غلط بیانی روحان میاں؟ بہتر ہو گا کہ تم کھل کر بات کرو۔" اب ظاہر ہے وہ تو داماد کے اس شکوے کے پس منظر سے لاعلم ہی تھے تب ہی اسے کھل کر بات کرنے کا کہہ گئے۔ یہ نہ دیکھا کہ ان کے اس جملے پر زوجہ محترمہ کے چہرے کی رنگت کیسی زرد پڑ گئی۔ دیکھ لیتے تو شاید۔

"آنٹی سے پوچھیے" وہ دیکھ اب بھی ایوب صاحب ہی کی جانب رہا تھا تاہم توجہ وہ اب فہمیدہ کی جانب تھا اور لہجہ انتہائی سرد، برفیلا، شرمندہ کرنے والا۔ "کیا انہوں نے رشتہ جوڑتے وقت میری پھپھو سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری بچی کھانا پکانا بہت اچھی طرح جانتی ہے۔"

"ہاں تو کیا غلط کہا تھا؟" اب اصولی طور پر ہونا تو یہاں فہمیدہ کو شرمندہ تھا۔ مگر چوں کہ اپنے نام کی واحد تھیں لہٰذا نہ ہوئیں الٹا چمک کر ہاتھ نچا کر بولیں۔

"مگر رمشا نے تو صبح خود میرے سامنے یہ اعتراف کیا ہے کہ اسے کچھ بھی پکانا نہیں آتا۔" فہمیدہ کا لہجہ اتنا قطعی تھا کہ روحان جو بوجوہ ان کی اور دیکھنے سے گریزاں تھا بے ساختہ ان کی جانب دیکھ کر الجھن زدہ سے لہجے میں بولا...... جس پر پہلے تو فہمیدہ نے نفسیاتی سے انداز میں ناخن چباتی اپنی دختر کو سختی

www.pklibrary.com

سے گھورا جس پر اس کا لٹکا منہ مزید گھٹنوں پر جا پہنچا پھر دوبارہ روحان کی جانب متوجہ ہو کر سابقہ لہجے میں بولیں۔

"ہاں تو میں نے رمشا کی بات کب کی؟ میں تو اپنی وریشہ کا ذکر کر رہی تھی۔" اور وریشہ جس کی انٹری اس اجلاس میں بین تھی اور جو پھر بھی اپنی عادت سے مجبور مہمان خانے کے دروازے کے باہر کھڑی کن سوئیاں لینے میں مصروف تھی، والدہ محترمہ کے اس بیان (صاف جھوٹ) پر قدرے لڑکھڑا سی گئی۔ جب کہ اندر ان کی تقریر جاری تھی۔

"رمشا کو تو اپنی پڑھائیوں ہی سے فرصت نہ تھی۔ اسے کہاں کچھ پکانا آتا ہے۔" وہ فراٹے سے بولتی چلی گئیں اور اپنے تئیں روحان کو لاجواب کر دینے کی کوشش کی مگر وہ لاجواب تو خیر کیا ہوتا الٹا تعجب سے پوچھنے لگا۔

"یعنی آپ اس روز رمشا کا نہیں بلکہ وریشہ کا ذکر کر رہی تھیں؟"

"ہاں تو اور میں کیا کہہ رہی ہوں۔" روحان کی خود پر جمی نگاہوں میں موجود تاثر دیکھ کر وہ اس مرتبہ ذرا کی ذرا گڑبڑا سی گئیں اور ان کے مصنوعی حواتزن لہجے کی یہ محسوس لڑکھڑاہٹ ایوب صاحب سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ لہجے کے ہچکولوں سے میں "لڑکھڑاہٹ" کا بھید پا گئے۔ جس پر انہیں جلال تو بہت آیا تاہم یہ موقع جلال ظاہر کرنے کے بجائے بگڑے معاملے کو سنبھالنے کا تھا چنانچہ وہ بہت محتاط الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے روحان کے تنے عضلات والے چہرے کی جانب دیکھ کر بڑے سبھاؤ سے بولے۔

"روحان بیٹے! میں نہیں جانتا کہ غلط بیانی کی گئی یا پھر تمہیں ہی کوئی غلط فہمی ہو گئی بہرحال جو ہونا تھا سو ہوا مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ بہتر یہی ہے کہ اب اس مسئلے کو افہام و تفہیم سے حل کر لیا جائے۔"

"شاید...... ٹھیک کہا آپ نے۔" روحان جو لفظ "غلط بیانی" و "غلط فہمی" کے درمیان پھنس کر شدت سے الجھ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک بے بسی آمیز ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "یقیناً ہمیں ہی سننے میں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ واقعی جو ہوا سو ہو ہی گیا نا...... مگر انکل...... میری اصل پریشانی یہ ہے کہ اب آگے کیا ہو گا۔ رمشا کو تو کوکنگ آتی نہیں تب پھر اب میں کیا کروں گا؟"

بے چارے کے اس "پر تنگ کوئچن" پر ماں، بیٹی نے بے ساختہ ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ فہمیدہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب دماغی سے مستقل خاموش بیٹھی رمشا کو چند اشارے کر کے بولنے پر اکسایا کہ موقع بے حد مناسب ہے۔ اپنا مطالبہ سامنے رکھ دو۔ مگر یہ رمشا...... سدا کی کھا مڑ، ان کا اشارہ سمجھنے کے بجائے دوبارہ ایوب صاحب کی جانب متوجہ ہو گئی جو روحان کے لچک دار انداز پر یک گونہ اطمینان محسوس کرتے ہوئے اس بار بہت شفقت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بہت نرمی سے پوچھ رہے تھے۔

"پہلے کیا کیا کرتے تھے بیٹا؟"

ان کے استفسار پر ہارے ہوئے جواری کے سے انداز میں کندھے ڈھلکائے بیٹھا روحان گویا کرنٹ کھا کر ایک جھٹکے سے بالکل سیدھا ہو گیا۔ اب وہ انہیں "کیا" بتاتا کہ وہ پہلے کیا کیا کچھ کرتا رہا ہے۔ اسی لیے ذرا سنبھل کر محتاط لہجے میں بولا۔

"کبھی خود پکا لیتا تھا...... کبھی ایک دوست کے گھر کھا لیا کرتا تھا۔"

"ہوں...... یعنی باہر کا کھانا بالکل نہیں کھاتے...... چلو کوئی بات نہیں...... یوں سمجھو چند دن کی تکلیف اور ہے۔ تب تک رمشا بھی کھانا پکانے کی ابجد سے واقف ہو ہی جائے گی پھر ان شاء اللہ تمہیں اس ضمن میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔" انہوں نے مدھم سا مسکرا کے کہا تو روحان، جو انجانے خدشات میں گھرا بیٹھا تھا...... ایک دم جیسے ہلکا پھلکا سا ہو گیا اور ابھی وہ کھل کر مسکرا بھی نہ پایا تھا کہ ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے فہمیدہ بھڑک کر بولیں۔

"غضب خدا کا..... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بھئی..... میری بیٹی کھانا کیوں پکائے......"

"آپ خاموش رہیں فہمیدہ بیگم۔" ایوب صاحب نے چونک کر زوجہ کو خشمگیں نگاہوں سے تنبیہا گھورا۔ "میں بات کر رہا ہوں نا۔"

"ارے کیا خاک بات کر رہے ہیں۔" وہ ان کی "گھوری" کو مطلق خاطر میں نہ لاتے ہوئے تنک کر بولیں۔ "غضب خدا کا، بجائے داماد کو کوئی عقل کی بات سمجھانے کے، الٹا بیٹھے مسلسل اس کی ہاں میں ہاں ملائے چلے جا رہے ہیں۔"

"فہمیدہ! میں کہہ رہا ہوں نا کہ آپ خاموش رہیں۔" ایوب صاحب نے اس بار اپنا لہجہ مزید سخت کر لیا مگر شاید..... دیر ہو چکی تھی کہ روحان جو بہت عجیب نگاہوں سے خوش دامن کے ناخوشگوار تیور بغور ملاحظہ کر رہا تھا سرد لہجے میں ایک دم بول اٹھا۔

"نہیں انکل..... انہیں کہنے دیں..... میں بھی تو سنوں کہ آخر یہ مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہیں۔"

"یہی کہ میری بیٹی کھانا نہیں پکائے گی..... تم اسے کوئی شیف رکھ دو۔"

فہمیدہ کو اللہ معلوم ایسی کیا جلدی تھی جو بلاتوقف فوراً بول پڑیں۔

"اور اگر میں شیف رکھنے سے انکار کردوں تب ..... تب آپ کیا کریں گی؟"

وہ بھی یقیناً جلدی میں تھا..... تب ہی ٹھنڈے ٹھار لہجے میں جانچتی نگاہوں سے فہمیدہ کا چہرہ دیکھ کر سوال کیا..... اے کاش..... وہ اس وقت رمشا کا ان کے مابین جاری تکرار سن کر انجانے خدشات میں گھر کر سپید پڑتا چہرہ دیکھ لیتا تو شاید۔

(شاید واند کچھ نہیں..... دیکھ لیتا تو کہانی میں اگلا موڑ کیسے آتا؟)

"تب میں اپنے خرچے پر رمشا کے لیے کسی کھانا پکانے والی کا بندوبست کردوں گی مگر یوں اسے چولہا چوکی میں پڑ کر اپنی زندگی کے سنہری دن ضائع ہرگز بھی نہ کرنے دوں گی۔" لوجی! جذبات کی انتہاؤں پر پہنچی فہمیدہ کا دو ٹوک جواب حاضر تھا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" اس قدر صاف جواب سن لینے کے بعد باقی کیا رہ جاتا تھا؟ ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں سو وہ فوراً سے پیشتر اپنی نشست سے تلملاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ رکھیں اپنی بیٹی اپنے پاس اور اس کے سنہری ماہ و سال تباہ و برباد ہونے سے بچالیں..... میری طرف سے خدا حافظ!"

اس کے عقب میں ایوب صاحب بوکھلا کر "ارے، ارے" ہی کرتے رہ گئے مگر وہ اس قدر شدید غصے میں آچکا تھا کہ ان کی پکار —— ان سنی کرتا ہوا آندھی طوفان کی مانند کمرہ عبور کر گیا۔

اس کا ردعمل اس قدر غیر متوقع اور حیران کن تھا کہ رمشا تو رمشا، خود فہمیدہ تک اپنی جگہ ششدر رہ گئیں۔

اور یوں یہ منظر انتہائی بدمزگی پر تمام ہوا۔ نہیں ہونا چاہیے تھا مگر ہوا اور ہم اپنا بوجھل دل لیے آگے بڑھ گئے کہ آگے ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔

☆☆☆

"بس کردیں آپو..... یوں کب تک روتی رہیں گی..... رونے سے مسئلے حل ہوجاتے ہیں کیا؟"

روحان کے اٹھ کر جانے کے بعد، جوں ہی رمشا کا سکتہ ٹوٹا، وہ بنا کسی کی جانب دیکھے، بری طرح روتی ہوئی اٹھ کر مہمان خانے سے اپنے کمرے میں بھاگ آئی ..... کچھ بڑی زور سے ٹوٹا تھا اندر..... اشک تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے..... اس کے پیچھے پیچھے آئی پریشان صورت وریشہ، اسے دلاسہ دینے کی اپنی سی کوشش کرتے میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

"وریشہ پلیز....." روتی ہوئی رمشا ہچکیوں کے درمیان بولی۔ "تم جاؤ یہاں سے اس وقت میں کوئی بھی بات سننا نہیں چاہتی۔"

"مگر آپو....." وریشہ اسے یاسیت سے دیکھ کر بے چارگی سے بولنے لگی مگر رمشا نے ہاتھ اٹھا کر گویا

اسے مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا اور قطعیت سے بولی۔

"میں نے کہا نا...... جاؤ تو جاؤ۔" وہ یقیناً اس وقت بے طرح بکھری تھی۔ خود کو سمیٹنے کے لیے اسے تنہائی درکار تھی...... سو دریشہ نے ایک بے بسی آمیز ٹھنڈی سانس لی اور اٹھ کر کمرے سے باہر چل دی۔

☆☆☆

"جب میں رسانیت سے بات کر رہا تھا تب تمہیں درمیان میں مداخلت کرنے کی ضرورت ہی کیا پڑی تھی۔"

روحان کو گئے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تو گزر ہی چکا ہوگا مگر ایوب صاحب کا شاذ و نادر چڑھنے والا پارہ، آج نیچے اترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا...... اور لیتا بھی کیوں کر؟ "نئے نویلے" داماد کا یوں ناراضی سے اٹھ کر جانا کوئی معمولی واقعہ بھی تو نہیں تھا...... داماد کے بدلحاظ رویے کے ہاتھوں جو ہزیمت اٹھائی وہ اپنی جگہ، بیٹی کے مستقبل کا نقشہ الگ دھندلا گیا...... اب ایسے میں، وہ اپنی جگہ گم صم سی بیٹھی فہمیدہ کو سخت سست نہ سناتے تو پھر کیا میگھ ملہار سناتے؟

"پہلے تو خواہ مخواہ اس بھلے مانس سے غلط بیانی کر کے یہ سارا کھڑاگ کھڑا کیا پھر بجائے اس مسئلے کو عقل مندی سے حل کرنے کے اپنی بے وقوفانہ جلد بازی سے ایک اور مسئلہ کھڑا کر لیا...... مجھے بتاؤ فہمیدہ آخر تم چاہتی کیا ہو؟" وہ عالم طیش میں ٹہلتے ٹہلتے سر نیہواڑے بیٹھی فہمیدہ کے سامنے ایک دم رک کر بے طرح دھاڑے۔

"میں کیا چاہتی ہوں؟" فہمیدہ نے نجانے کس احساس کے تحت اپنا جھکا سر اٹھا کر بڑی زخمی نگاہوں سے شوہر نامدار کا غضب ناک چہرہ دیکھا۔

"میں تو بس...... یہی چاہتی ہوں کہ وہ ساری راحتیں اور مسرتیں میری بیٹی کا مقدر بنیں...... جو آپ کی بدولت مجھے نصیب نہ ہو سکیں۔"

وہ رندھی ہوئی آواز میں بڑے جتاتے لہجے میں بولیں۔ اور پھر فوراً ہی اٹھ کر مہمان خانے سے نکلتی چلی گئیں کہ کم از کم اس وقت ایوب صاحب کے سامنے اپنا ضبط کھونا انہیں گوارا نہ تھا۔ تب ایوب صاحب شکست خوردگی سے صوفے پر ڈھے گئے کہ بخوبی واقف تھے کہ وہ انہیں کیا کچھ جتا گئی ہیں۔

☆☆☆

بے اندازہ غصہ تھا، نادانی تھی، بے چارگی تھی، اور ہاں اپنی قابل رحم حالت پر ڈھیر سارا تاسف بھی تو تھا۔ بس یہی سوغات تھی جو آج وہ اپنے سسرال سے ہمراہ لے کر لوٹا تھا۔ ساس تو چلو ساس ہی ہوتی ہے (جی ہاں! لڑکوں کی بھی) پر اصل نادانی تو اسے رشا کی مسلسل خاموشی پر تھی۔

دو لفظ اگر شوہر کی حمایت میں بول دیتی تو کیا قیامت آجاتی بھلا۔ نہ جی...... وہ کیوں کرنے لگی اپنی والدہ ماجدہ کی مخالفت، جب کہ بات بھی وہ سراسر اس کے فائدے ہی کی کر رہی تھیں، اسی لیے تو وہ خاموش رہی، غلطی سے بھی والدہ کو نہ ٹوکا کہ جب میرا شوہر میری اتنی بڑی خامی کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کو تیار ہے۔ تب کیا میرا یہ فرض نہیں بنتا کہ میں اس کی خواہش کا احترام کروں۔ مگر نہیں......"

اس نے غصے سے گردن کو ایک زوردار جھٹکا مارا...... تب ہی دیوار گیر گھڑی نے شام کے چار بجنے کا اعلان کیا تو اسے احساس ہوا...... کہ وہ تو صبح سے یوں ہی بھوکا بیٹھا ہے۔

"بھوکا ہوں تو بھوکا ہی سہی۔" اس نے چڑ کر ٹھیلے پن سے سوچا۔

"میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ آج کے بعد کھانا پکانے کے لیے کچن کا رخ ہرگز ہرگز بھی نہیں کروں گا...... میں روحان وجیہہ الدین بقائمی ہوش و حواس اپنے کچن کو طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔"

وہ بڑے تنفر سے اپنے باورچی خانے کی جانب دیکھ کر زہرخند سے لہجے میں کچھ اس طرح بولا کہ اگر جو ہم اس کی اس حرکت کے "پس منظر" سے ناواقف ہوتے تو عین ممکن تھا آپ کی طرح ہم بھی اس کی

دماغی صحت کی جانب سے مشکوک ہو جاتے۔ اور بھی کیا پوچھا آپ نے؟ کیا پس منظر؟ تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ کیا ہم کوئی دیوانے معلوم پڑتے ہیں جو کہانی کا سارا ''سسپنس'' یوں ہی اتنی آسانی سے ختم کر ڈالیں نہیں نا؟ بس تو پھر پھر سے آگے کی کہانی پڑھیے...... (اوہ ہو......اب منہ کے زاویے تو مت بگاڑیے......)

☆☆☆

''سولہ کا سن تھا، جب میں اپنی کنواری آنکھوں میں خوش رنگ سپنے سجائے اور سینے میں دھڑکتے ہزار ہا ارمان چھپائے ایوب صاحب کے آنگن میں اتری اور شادی کے محض تیسرے ہی روز میں نے یہ جانا کہ خواب تو بس خواب ہی ہوتے ہیں، ان کا حقیقی دنیا سے تو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔''

اگلے دن فہمیدہ، رمشا کے پاس بیٹھی، بڑی رنجور سی آواز میں یاسیت سے گویا تھیں...... گزشتہ شب، اس گھر کے مکینوں پر بے حد گراں گزری تھی...... ہر کوئی اپنی جگہ بے چین، مضطرب، اور الجھا ہوا تھا...... خصوصاً رمشا......اس کے تو ذہن نے جیسے کام کرنا ہی چھوڑ رکھا تھا...... ساری رات تکیے میں منہ دیے بے آواز روتی رہی۔ عام حالات میں وریشہ اس کے ساتھ نہ سوئی تھی مگر کل سوئی...... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اس کی ابتر حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہی...... یوں ہی تفکرات میں ڈوبے کب پلک جڑی کچھ پتا نہیں...... آنکھ فہمیدہ کی بھرائی ہوئی آواز سن کر کھلی...... وہ متورم آنکھوں والی رمشا کے برابر میں بیٹھی غائب دماغی کی سی کیفیت میں اپنے ماضی کا کوئی باب دہرا رہی تھیں۔

شادی کے محض تیسرے ہی دن تمہاری دادی نے مجھے یہ بڑے سارے باورچی خانے میں لے جا کر کھڑا کر دیا اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

فہمیدہ نے دونوں بازو پھیلا کر گویا باورچی خانے کا حدود اربعہ بتانے کی کوشش کی۔ ''کہ لو بھئی...... گھر کی بڑی بہو ہونے کے ناتے آج سے باورچی خانہ تمہاری ذمے داری...... مجھ بڑھیا سے تو اب یوں بھی چولہا چوکی سنبھالا نہیں جاتا لہٰذا اب تم جانو اور تمہارا کام...... جو پکا کر دو گی چپ کر کے ہنسی خوشی کھا لیں گے ہاں مگر پکوان کے ذائقے اور معیار پر تم ہم سے کسی بھی قسم کی رعایت کی امید مت رکھنا۔''

وہ یقیناً ساس مرحومہ کا سیاسی بیان حرف بہ حرف سنا رہی تھیں۔ رمشا کے لیے چوں کہ یہ داستان قطعی طور پر نئی نہ تھی لہٰذا وہ تو سپاٹ چہرہ لیے یوں ہی پتھر کی صورت بنی بیٹھی رہی ہاں مگر وریشہ...... داستان تو خیر یہ اس کے لیے بھی پرانی ہی تھی مگر بات یہ تھی کہ آج سے قبل چوں کہ فہمیدہ نے کبھی اس کے سامنے یہ قصہ اتنی جزئیات کے ساتھ نہ سنایا تھا سو اس کے چہرے کی تمتماہٹ اور تجسس آنکھوں سے مترشح دل چسپی دیدنی تھی۔

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' لمحے بھر کا توقف بھی اس کو شاق گزرا تھا تب ہی تو وہ جو بستر کے سامنے دھرے صوفے پر دراز تھی ایک دم اچھل کر اٹھ بیٹھی اور بڑی بے ساختہ قسم کی بے چینی سے فہمیدہ کا سنجیدہ و رنجیدہ چہرہ دیکھ کر گویا ہوئی۔

''ہونا کیا تھا؟'' وہ خلاف معمول اس کے یوں سوال کرنے پر اسے ٹوکے یا جھڑکے بغیر خاصی مغموم آواز میں بولیں۔

''سوائے اس کے کہ اس دن کے بعد میری زندگی کا مقصد گویا اپنے بھرے پرے سسرال والوں کی شکم سیری بن کر رہ گیا۔ ساس کے علاوہ، بیوہ چچی ساس، دادی ساس، جن کا تینوں وقت پرہیزی کھانا پکتا۔ نو چھوٹے دیور نندیں اور ہمہ وقت جاری مہمانوں کی آمد و رفت...... یوں سمجھو کہ ایک وقت میں مجھے کوئی تیس، پچیس آدمیوں کے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا۔ بازاری مسالہ جات کا گھر میں استعمال سختی سے ممنوع تھا۔ تمہاری دادی ہلدی، مرچیں تو چھوڑ دو نمک تک مجھ سے اپنی نگرانی میں ہاون دستے میں پسواتیں۔ گندم صاف کر کے آٹا گھر میں موجود چکی پر پیسا جاتا۔ اوپر سے تینوں وقت گھر کے

مکینوں کو تازہ کھانا درکار ہوتا۔ یوں چند ہی ہفتوں میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے میں برسوں سے اس باورچی خانے میں قید ہوں اور رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ کب صبح ہوئی، کب دن ڈھلتا مجھے کوئی خبر نہ ہوتی۔"

اتنا کہہ کر بے اختیار فہمیدہ سسک اٹھیں۔ رمشا کے لب سختی سے بھینچ گئے۔ جب کہ وریشہ کا مارے طیش کے برا حال ہو چکا تھا یعنی کہ اتنا اور ایسا "ڈرامائی ظلم"

"گھر میں اتنے سارے لوگ تھے...... کیا کوئی بھی آپ کی ہیلپ نہیں کرواتا تھا؟" اس نے برہمی سے پوچھا۔ اس کی تو خیر ماں تھیں فہمیدہ، یقین جانیے یہ سب سن کر خود ہمیں بھی اپنے امڈتے اشتعال پر قابو پانا خاصا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ خیر...... خیر جواب میں کیا کہہ رہی ہیں فہمیدہ خود آپ بھی سنیے...... (اوہ ہو بھئی پڑھیے)

"دادی ساس مفلوج تھیں، چچی ساس خرانٹ اور تمہاری دادی ایک روایتی ساس...... نندیں ان کے بقول سب ہی چھوٹی تھیں اور ظاہر ہے کہ دیور تو ہاتھ بٹانے سے رہے۔ تب ایسے میں میرا مددگار کون بنتا؟ ہاں صفائی ستھرائی کے لیے ملازمہ رکھی ہوئی تھی، کپڑے بھی دھوبن لے جاتی۔ مگر باورچی خانے کے کاموں میں کوئی مددگار تو خیر میں کیا رکھ پاتی کہ تمہاری دادی کو تو کام والی کا وہاں پھٹکنا تک نا منظور تھا۔"

"یہ تو بینا رٹی ہوئی۔" یہ سب جان کر غصے میں ناک تک بھری بیٹھی وریشہ ناک چڑھا کر غصے سے بولی۔

"اللہ جانے کیا ہوئی اور کیا نہیں۔" فہمیدہ اپنے تواتر سے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے ٹھنڈی سی آہ بھر کر بولیں۔ "میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ بہت کڑا اور کٹھن وقت تھا جو میں گزار آئی۔ پیچھے رہ جانے والے والدین سے کچھ کہنا بے کار ہی تھا کہ وہ تو وقت رخصت یہ نصیحت کر ہی چکے تھے کہ اب جو جاری ہو سسرال تو کفن لپیٹ کر ہی واپس آنا۔ پر ایک روز میں نے بہت زیادہ تھک کر دبے لفظوں میں جب ایوب صاحب سے شکوہ کیا تو وہ تیوری چڑھا کر بولے۔

"میں اس گھر کا بڑا بیٹا ہوں اور میرے حوالے سے تم بڑی بہو...... اماں نے تم پر اعتماد کرتے ہوئے اہل سمجھ کر اپنا باورچی خانہ یعنی اپنی راج دھانی تمہیں سونپی ہے اور تم ہو کہ محض چار دن ہی میں ذمے داریوں سے گھبرا گئیں۔" کچی عمر اور مجازی خدا کا رعب بہت...... بس اس دن کے بعد میں نے اپنے لب سی لیے...... پھر اسی قید با مشقت میں تین برس کا عرصہ بیت گیا۔

اور ایک روز میری گود میں تم آ گئیں...... اس دن میں روئی...... بہت روئی۔" رو تو وہ اس وقت بھی رہی تھیں مگر اب ان کے بہتے آنسوؤں نے گویا بہتے دریا کو شرمندہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی...... اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اتنی دیر سے گم صم بیٹھی رمشا بھی اس ذکر پر پہلے بے چین ہوئی...... پھر اس کے باہم پیوست لب تھرتھرائے۔ پلکیں لرزیں اور بالآخر وہ پگھل گئی۔

"اور یہ فیصلہ میں نے اسی پل کر لیا کہ جس طرح میرے سینے میں دھڑکتے ارمان چولہے کی نذر ہوئے، ایسا میں ہرگز بھی تمہارے ساتھ نہیں ہونے دوں گی مگر دیکھو، ہوں نا حرماں نصیب...... بھلا کرنا چاہا تھا تمہارا...... نادانستگی میں برا کر بیٹھی...... بہت بری ماں ہوں میں بہت بری۔"

وہ بہت بے بسی سے بولی تھیں رمشا بڑھ کر بے اختیار ان کے گلے سے لگ گئی۔ اور اب دونوں ماں بیٹی، فراخ دلی سے آنسو بہا رہی تھیں اور سامنے بیٹھی وریشہ......

دل تو خیر اس کا بھی اس جذباتی منظر پر بھر بھر آ رہا تھا مگر دماغ...... کی بتی جل چکی تھی۔

☆☆☆

"اتنی دیر سے گری میں کھڑا بیل بجا رہا ہوں...... تو کیا ـــــــ فوت ہو گیا تھا جو گھنٹی کی چنگھاڑتی ہوئی آواز تک تجھے سنائی دی۔"

دروازہ کھلنے پر کالی پتلون اور سفید آفس شرٹ میں ملبوس غصے سے ابلتا جواد ایک دم پھٹ پڑا۔ وہ

پچھلے پندرہ منٹ سے روحان کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجاتے ہوئے مسلسل اس وقت کو کوس رہا تھا کہ جب اس نے تین چار روز سے "لاپتا" روحان کی خیریت دریافت کرنے کا ارادہ باندھا تھا۔ فون بھی موصوف کا مستقل "پاورڈ آف" کا مژدہ سنا رہا تھا اور وہ دوستی کا مارا اپنے دفتر سے سیدھا ادھر آیا تھا سو ایسے میں اگر اس کی زبان، روحان کا نیم غنودہ چہرہ دیکھ کر طنز کے تیر برسانے پر آمادہ تھی تو اس میں تعجب کی بات نہ تھی۔

"اب شادی کر لینے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آدمی ہمہ وقت بیگم کے آنچل کے سائے تلے پڑا اونگھتا رہے۔" گھر کے اندر تیزی سے داخل ہوتے جواد نے میٹھے لہجے میں طنز کا ایک اور تیر تاک کر دے مارا جو سید ھا روحان کے دل پر پھٹ سے جا لگا۔

"حق ہا...... کون سا آنچل اور کیسا سایا؟" جواد کو ساتھ لیے اپنے گھر کے مختصر سے لان کی جانب بڑھتا روحان بلا ارادہ ایک سرد سی آہ بھر کر بولا۔

"خیر...... میری چھوڑ اور اپنی بتا۔"

"ابے...... کیا ہو گیا ہے تجھے؟" جواد اپنی بتانے کے بجائے لان میں بچھی دو عدد سفید پلاسٹک کی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہوتے ہوئے حیرت سے بولا۔

"اس طرح بات کیوں کر رہا ہے جیسے خدانخواستہ اب سے کچھ دیر بعد مرنے والا ہو؟ سب خیریت تو ہے...... بھابھی کہاں ہیں؟" وہ تشویش سے تابڑ توڑ سوالات کرتے کرتے ایک دم چونکا۔

"میں اسے، اس کے گھر چھوڑ آیا۔" مقابل مردنی سے ڈھیر ہوتے ہوئے روحان نے مدھم، افسردہ سے لہجے میں بتایا۔

"ہیں؟" حیرت کی زیادتی سے جواد کا منہ ضرورت سے زیادہ وا ہو گیا۔ "گھر چھوڑ آیا؟ مگر کیوں چھوڑ آیا بھائی؟" اس پر بھرے بیٹھے روحان نے چند تامے جیسے کچھ غور و خوض فرمانے کے بعد بالآخر اس کے گوش گزار کر ہی دیا کہ۔

"بھئی...... یوں چھوڑ آیا۔"

"اوہ یار...... یہ تو بہت زیادہ غلط ہو گیا تیرے ساتھ۔" روحان کی داستان "رنج و الم" سن کر جواد کو گہرا صدمہ ہوا۔ "پر اب...... اب تو کرے گا کیا؟" وہ بہت فکرمندی سے بولا۔

"بھئی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟" وہ اضطراری انداز سے اپنے منتشر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولا۔

"اپنی پھپھو سے بات کر۔" جواد نے پُرسوچ سے لہجے میں مشورہ دیا۔ "وہ تیری بڑی ہیں...... شاید وہ تیرا "مسئلہ" بہتر طور پر ان لوگوں کو سمجھا کر انہیں اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹ جانے پر رضامند کر سکیں۔"

"پھپھو میری شادی کر کے واپس امریکہ جا چکی ہیں اور ویسے بھی میں ہرگز انہیں اس مسئلے میں انوالو کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اگر انہوں نے میرے سسرالیوں سے بات کی تو تو جانتا ہے میری پھپھو کو...... وہ انہیں "سب کچھ" بتا کر دم لیں گی اور یہ میں ہرگز بھی نہیں چاہتا۔"

روحان قطعیت سے جواد کا مشورہ رد کرتا ہوا بولا۔ اور جواد جو روحان کا دیرینہ دوست ہونے کے ناطے اس "موضوع" اور اس موضوع پر روحان کی حساسیت سے بخوبی واقف تھا، نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے متانت سے بولا۔

"اگر پھپھو کو انوالو نہیں کرنا چاہتا تو ڈائریکٹ بھابی سے بات کر...... کیا پتا وہ اپنی والدہ سے علیحدہ موقف رکھتی ہوں اس بارے میں۔"

"اگر علیحدہ موقف رکھتی تو اس روز میرے حق میں کچھ تو بولتی...... ایسے لب بستہ تو نہ بیٹھی ہوتی۔" اس کے لہجے میں ناراضی ضرور تھی مگر ساتھ ہی دکھ کی آنچ بھی تھی...... جسے محسوس کر کے جواد ماحول پر طاری گھمبیرتا کے باوجود زیرِ لب مسکرا دیا۔

"ہائے...... یہ نئی نئی پروان چڑھتی کم بخت محبت...... جو محبوب سے اچھی طرح خفا بھی نہیں

...سے خفا تھی۔

"پہلا تو انہوں نے تیرے خلاف بھی کچھ نہیں۔" جواد آہستگی سے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر مدلل لہجے میں بولا۔

"پھر اس کی خاموشی کا اور کیا مطلب تھا؟" وہ نروٹھے پن سے الجھ کر بولا۔

"معنی و مطلب تلاش کرنا تیرا کام ہے یار۔" جواد سنجیدگی سے بولا۔

"میں تو تجھے نصیحت ہی کر سکتا ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہو بھابھی سے رابطہ کر کے یہ مسئلہ حل کر لے...... ورنہ ایسا نہ ہو کہ کہیں واقعی دیر ہو جائے۔"

جواد کے جگنو جیسے الفاظ مایوسی اور بد دلی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ٹمک ٹوئیاں مارتے روحان کے دماغ کو درست دکھانے لگے تھے۔ تب ہم نے بھی ذرا اطمینان محسوس کیا اور اگلے منظر میں چھلانگ مار دی۔ جہاں اپنے گھر کی چھت پر اداس بلبل بنی کھڑی رمشا سے وریشہ مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی کہ......

☆☆☆

"کیا سوچ رہی ہیں آپو؟" چھت کی مغربی دیوار کے ساتھ ایستادہ رمشا کے برابر میں موجود وریشہ نے اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر ایک دم پوچھا۔

"میں؟" وہ جو غائب دماغی کی سی کیفیت میں اپنے آشیانوں کی جانب واپس لوٹتے طائران پر اپنی حسرت آمیز اداس نگاہیں جمائے کھڑی تھی نے وریشہ کی آواز پر بے طرح چونک کر اس کی جانب یوں دیکھا، گویا اس کی موجودگی سے یکسر لاعلم رہی ہو...... حالانکہ یہ وریشہ ہی تھی جو اپنے کمرے میں سارے زمانے سے خفا ہو کر منہ سر لپیٹے پڑی رمشا کو حتیٰ الامکان کھینچ کھانچ کر چھت پر لے کر آنے میں کامیاب ہوئی تھی تاکہ تازہ ہوا کھا کر وہ کچھ بشاشت محسوس کر سکے۔

"میں کیا سوچوں گی؟" وہ یاسیت آمیز لہجے میں الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

"وہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔" وریشہ ترنت بولی۔

"میں کچھ نہیں سوچ رہی۔" رمشا سر جھٹک کر بولی۔

"روحان بھائی کے متعلق بھی نہیں؟" کن انکھیوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیتی وریشہ کا اگلا استفسار یہ تھا۔

"نہیں وریشہ......" چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد رمشا گلوگیر آواز میں بدقت تمام بولی۔ "جو بے قصور مجھے سزاوار ٹھہرا گیا۔ میں اس شخص کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی۔"

"پر کچھ نہ کچھ تو سوچنا پڑے گا نا آپو......" وریشہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر افسردگی آمیز گھمبیرتا سے بولی۔ "ورنہ یہ مسئلہ پھر حل کیسے ہوگا؟"

"حل ہو گیا نہیں۔" وہ دائیں آنکھ سے ٹپک پڑنے والے ایک باغی آنسو کو ہاتھ کی پشت سے بے دردی سے رگڑتے ہوئے بولی۔ "اب اس بات کی مجھے پروا ہے بھی نہیں کہ وہ شخص جو اس ایک ذرا سی بات پر مجھے چھوڑ کر یوں چلتا بنا کیا میں اب اس کی ہمراہی پر اعتبار کر سکوں گی؟" سوال تلخ تھا مگر مصلحتاً وریشہ ملائمت سے بولی۔

"بات اگر اعتبار کی ہے تو اعتبار تو روحان بھائی کا بھی چکنا چور ہوا ہے...... مگر اس کے باوجود بھی وہ اس دن بگڑے معاملات کو بات چیت کے ذریعے خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کر تو رہے تھے...... وہ تو پھر آپ نے بات ہی ایسی کر دی کہ انہیں غصہ آ گیا اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔" وہ یوں دلیل پر دلیل دیتی گئی گویا روحان نے باقاعدہ معاوضہ دے کر اسے اپنا وکیل مقرر کر رکھا ہو۔

"چلے کی تصحیح کرو وریشہ۔" رمشا خود اذیتی سے بولی۔ "اٹھ کر نہیں...... مجھے چھوڑ کر۔"

"اوف فو آپو۔" وریشہ اس بار قدرے چڑ سی گئی۔ "ایک تو یہ آپ کی سوئی آٹھ بجے والے ڈراموں کی طرح ایک ہی بات پر کیوں اٹک گئی ہے؟ ایسے تو بات نہیں بنے گی۔" (ہاں، وہ بات تو بالکل بھی نہیں بنے گی جو وریشہ بنانا چاہ رہی تھی)

"بات بنے یا بگڑے...... میں نے کہہ تو دیا کہ اب مجھے کوئی پروا نہیں۔" وہی دہاؤ، پراگندگی کا شکار رمشا ہذیانی انداز سے بولی تو وریشہ ذرا گھبرا سی گئی۔

www.pklibrary.com

"اچھا...... چلیں چھوڑیں اس ٹاپک کو...... میں آپ کو کل والے ڈرامے کی کہانی سناتی ہوں۔" وریشہ نے رمشا کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر موضوع بدل دیا...... اور اپنا منصوبہ نمبر ایک بھی۔

اب اسے پلان بی پر کام کرنا تھا...... اور یہ پلان "بی" بھلا کیا تھا؟

☆☆☆

"اب اٹھ بھی جائیے نا...... یہ دیکھیے، میں آپ کے لیے اپنے ہاتھوں سے کیا بنا کر لائی ہوں۔"

جھلملاتے گلابی جوڑے میں ملبوس، سجی سنوری سی رمشا نے اپنے حنائی ہاتھوں میں تھامی سفید رنگ کی ڈش روحان کے سامنے کرتے ہوئے خاصا اٹھلا کر کہا اور گویا اس کی "آتش شکم" کو بھڑکا دیا۔ وہ وفور شوق سے آگے بڑھ کر ڈش کا ڈھکن ابھی اٹھانے ہی لگا تھا کہ بے چارے کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔

"آہ...... تو یہ خواب تھا!" وہ جو جواد کے جانے کے بعد اس کے نصیحتوں پر غور فرماتے ہوئے شدید ذہنی تھکاوٹ کے باعث لاؤنج کے صوفے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا۔ نامعلوم احساس کے تحت آنکھ کھل جانے پر ــــــ کراہ کر سوچ گیا۔

"مگر یہ خواب آخر اتنے حسین کیوں ہوتے ہیں؟"

واضح رہے خواب میں ایک عدد پردہ نشین نقاب بھی موجود تھی۔

"تعبیر بھی حسین ہو سکتی ہے اے سست الوجود انسان...... تو کوئی عملی قدم اٹھا کر تو دیکھ۔"

اسے دوبارہ مراقبے میں جاتا دیکھ کر ہم بے اختیار کہہ اٹھے...... اور وہ جو تسا ہلی، کسل مندی اور پژمردگی وغیرہ وغیرہ سے صوفے پر ہنوز ڈھیر تھا، بے طرح چونکا...... پھر گھبرا کر یہاں وہاں ہراساں نگاہوں سے دیکھ کر گویا "آواز" کا منبع تلاش کرنے لگا...... ہاں ٹھیک ہے...... کہانی کے خوب رو ہیرو کو یوں خوف زدہ دیکھنا ہمارے لیے بھی کوئی خوش گوار تجربہ نہیں تھا مگر اب ہم بھی کیا کرتے کہ موصوف ٹس سے مس ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے......

اور انہیں کسی طور تو "ٹس" سے "مس" کرنا ہی تھا سو یہ ہی ہی...... سو ملاحظہ ہو ہماری آواز کا اثر ــــ موصوف نہ صرف ایک دم اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں بلکہ میز پر دھرے اپنے اسمارٹ فون کی جانب تیزی سے لپک کر اسے اٹھا بھی لیا ہے...... غالباً وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلسل بھوکے پیٹ رہ رہ کر ان کا دماغ تقریباً کھسک چکا ہے اور تب ہی انہیں عجیب وغریب آوازیں سنائی دے رہی ہیں...... خیر چاہے کسی وجہ سے بھی سہی بہر حال وہ رمشا کو فون ملا تو رہے ہیں...... مگر ہیں؟ یہ کیا؟

جناب تو بجائے فون ملانے کے کوئی وائس ایپ صوتی پیغام بڑی دل چسپی سے سننے میں منہمک رہ چکے ہیں۔

"اوفوہ...... اب یہ کیا نئی مصیبت ہے؟"

آپ یقیناً اس وقت قدرے بے زاری سے یہی سوچ رہے ہیں نا؟ مگر نہیں...... یہ پیغام مصیبت نہیں تھا...... ہرگز بھی نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو......

☆☆☆

"بس بیٹا...... جو گزر گیا سو گزر گیا اب سب کچھ فراموش کرتے ہوئے کشادہ دلی سے آگے بڑھ جانے ہی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔"

جذبات سے مغلوب آواز میں ایوب صاحب، مؤدب سے انداز میں اپنے ساتھ کھڑے روحان کا کندھا شفقت سے تھپک کر بولے تھے۔ آج کا دن بھی اس گھر کے مکینوں کے لیے گزشتہ دس، بارہ روز جیسا ہی بوجھل، پر تشویش اور اداس سا تھا۔ گھر ان میں سے کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ آج کی یہ رات اپنے دامن میں مسرتوں کے ہزار ہا پھول لیے ان کے آنگن میں اترے گی۔

اور اب ان ہی پھولوں سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ جب احساس ہو جانے پر خفا ہو کر جانے والا "از خود" لوٹ آیا تھا تب وہ لوگ اسے اور کیا کہتے؟ جو بھی گلے شکوے تھے وہ کچھ کہہ سن کر مٹائے جا چکے تھے...... دونوں فریقین کی جانب سے معذرت وعذرت بھی کر لی

گئی ...... یوں ایک طویل جذباتی مکالموں سے بھرپور سین کے بعد بالآخر رمشا، روحان کے ہمراہ واپس جانے کو بالکل تیار کھڑی تھی ...... مگر فہمیدہ اب بھی کچھ بے چین اور متذبذب سی دکھائی دے رہی تھیں ...... کہ جیسا انہوں نے چاہا تھا رمشا کی واپسی ان شرائط پر نہیں ہو رہی تھی مگر صد شکر کہ ہو تو رہی تھی ...... بس اسی نکتے پر آ کر با دل نخواستہ انہیں سمجھوتہ کرنا ہی تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ رمشا کے لیے فکرمند بھی تھیں۔ تب ہی وقت رخصت نم آنکھوں سے اسے گلے سے لگا کر خاصی پریشانی سے مدھم آواز میں اپنے مخصوص انداز سے بولیں۔

"خیر سے اپنے گھر جا ...... پر غضب خدا کا ...... میں تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوں کہ تجھے تو کچھ آتا جاتا نہیں۔ تب تو واپس جا کر آخر کرے گی کیا؟"

"غضب نہیں ...... شکر خدا کا۔" قدرے انبساط سے چمکتے چہرے والی رمشا کہ جس کے دل سے روحان کی واپسی اور معذرت نے اپنی بے قدری کا غم و غصہ نکال کر دیا تھا، بہت مطمئن لہجے میں فہمیدہ کی تسلی کی خاطر بولی۔

"انسان اگر ارادہ کر لے تو کوئی بھی کام مشکل نہیں۔ اس لیے آپ فکر نہیں بس میرے حق میں دعا کرتی رہیں۔"

جواباً فہمیدہ رمشا کی پیشانی محبت ــــ سے چوم کر کیا بولیں؟ (یقیناً دعائیہ کلمات بھی ادا کر رہی ہوں گی) ہمیں یہ سننے سے کہیں زیادہ دل چسپی فی الوقت ان لوگوں سے قدرے فاصلے پر موجود آپس میں رازدارانہ انداز سے محو گفتگو دریشہ اور ...... روحان میں محسوس ہو رہی تھی سو ہم بنا وقت ضائع کیے لپک کر ان تک پہنچے۔

"میں جانتی ہوں کہ اصل زندگی کوئی ڈرامہ نہیں ہوتی مگر آپ میری آپو کی زندگی کے اصل ہیرو تو ہیں ...... تو کیا میں آپ سے یہ امید کر سکتی ہوں کہ آپ کسی بلند کردار آئیڈیل ہیرو کی طرح میرا وہ "راز" خود تک ہی محدود رکھیں گے؟" اس الہڑ چہرے پر فکرمندی اور عینک کے عقب سے جھانکتی ذہین آنکھوں میں معصوم سی التجا تھی ...... روحان معنی خیزی سے مسکرا دیا۔

"تمہارے بھائی کا سینہ رازوں کا مدفن ہے بچاری بہنا۔" وہ کسی ہیرو ہی کی مانند بڑے جان دار انداز سے مسکرا کر پراسراریت سے بولا۔ "سو تم بے فکر رہو میں سب سمجھتا ہوں۔" اور اس سے پہلے کہ اس کے اس "اسرار بھرے بیان" پر طمانیت محسوس کرتی دریشہ اسے ایک عدد بھاری بھرکم شکر سے نواز پاتی معاً رمشا سے الوداعی معانقہ کر کے فارغ ہوئے ایوب صاحب روحان کی جانب متوجہ ہو کر گونج دار آواز میں بولے۔

"چلو بھئی بچو، رات کافی ہو گئی۔ اب اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔"

☆☆☆

"ویسے میں اب تک حیران ہوں۔" یہ روحان کے گھر میں اتری اگلی تر و تازہ اور روشن صبح کا ذکر تھا۔ روحان اور رمشا، باورچی خانے کی مختصر سی میز پر آمنے سامنے بڑی آسودگی و طمانیت سے بیٹھے ناشتہ تناول کر رہے تھے اور یہ اطلاع یقیناً آپ کے لیے دل چسپی سے خالی نہ ہو گی کہ یہ "ناشتہ" (یعنی چیز آملیٹ) بی بی رمشا نے یوٹیوب کی مدد سے بنایا تھا ...... واقعی ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے کہ اگر انسان ارادہ کر لے تو پھر کیا مشکل ہے۔ سو اس نے اپنی "مشکل" کو حل کرنے کی ٹھان لی تھی کہ جدائی کے ان مختصر ایام نے اس پر سوچ کے نئے در وا کر دیے تھے۔

بہرحال تو ہم بیان کر رہے تھے کہ رمشا اور روحان ناشتہ کر رہے تھے کہ تب ہی اچانک کسی خیال کے آ جانے پر رمشا روحان سے مخاطب ہو کر بولی۔

"کہاں تو آپ اس قدر خفا تھے کہ ابو کے فون کرنے پر اپنا سیل پاور ڈ آف کر دیتے تھے۔ تو پھر یہ خفگی اچانک دور کیسے ہو گئی؟"

"سوال اچھا ہے تمہارا۔" وہ جو رغبت سے بیگم کے ہاتھ کے پہلے پہلے آملیٹ سے انصاف کرنے میں مصروف تھا اس بظاہر سرسری سے سوال پر پہلے تو یکلخت چونک اٹھا ...... پھر کچھ توقف کے بعد (یعنی جواب سوچ لینے کے بعد) کسی بہت ہی بردبار و دانا سیاست دان کی مانند گردن دھیرے سے ہلا کر بولا۔ "مگر میرا جواب سن کر شاید تمہیں اچھا نہ لگے ...... اس لیے رہنے دو۔"

"نہیں مجھے برا نہیں لگے گا۔" رمشا نے زور دیا

کہ وہ واقعی بڑی الجھن میں تھی۔ "میں سننا چاہتی ہوں آپ کا جواب۔"

"لے بھئی روحان وجیہہ الدین ...... برے پھنسے۔)"

"آہم ..... آہم۔" وہ باقی ماندہ آملیٹ کا دی اینڈ کرتے ہوئے گلا کھنکھار کر بولا۔ "اچھا ..... سننا چاہتی ہو تو سنو، آنٹی کی باتوں سے میری "ایگو" بری طرح "ہرٹ" ہوئی تھی تم مسلسل خاموش تھیں سو میں غصے میں تمہیں بھی ان کا ہم نوا سمجھا مگر جب بعد میں غصہ اترا تو مجھے احساس ہوا کہ تمہاری خاموشی کا کوئی دوسرا مطلب بھی تو ہو سکتا ہے ..... سو وہی مطلب جاننے کی خاطر تمہیں فون کرنا چاہا مگر پھر جانے کیا سوچ کر ٹھہر گیا اور پھر اس کے بعد ..... اس کے بعد۔"

وہ یہاں تک کہہ کر پھر رک گیا کہ اب وہ آگے اسے کیا بتائے؟ اور کیا نہ بتائے؟

ہاں بھئی ..... بات ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ بوجوہ رمشا کو بتا نہیں سکتا مگر ہم تو آپ کو بتا سکتے ہیں نا کہ اس روز دراصل ہوا کیا تھا؟ تو پھر چلیے ہمارے ساتھ واپس اسی منظر میں کہ جب روحان نے رمشا کو فون ملانے کی خاطر اپنا سیل فون اٹھایا ..... تو ٹھیک اسی لمحے انہیں کسی "نامعلوم نمبر" سے ایک عدد وائس ایپ وائس نوٹ موصول ہوا

"اسلام علیکم روحان بھائی ..... امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے مگر میں آپ کو بتا دوں کہ آپو ہرگز ہرگز بھی خیریت سے نہیں ..... آپ یقیناً ہم سے ناراض ہیں۔ بے شک ناراض رہیں مگر اتنا تو بتا دیجیے کہ اس سارے معاملے میں میری معصوم آپو کا کیا قصور ہے؟ جب سے آپ انہیں یہاں چھوڑ کر گئے ہیں بے چاری اس دن سے سخت اذیت میں ہیں ..... نہ کچھ کھا رہی ہیں نہ پی رہی ہیں۔ بس ہر وقت رو رو کر آپ کو یاد کرتی رہتی ہیں۔ بیمار پڑ گئی ہیں ..... دوا بھی نہیں لے رہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگر آپ انہیں لینے نہ آئے تو انہیں یقیناً کچھ ہو جائے گا تب ایسے میں، میں آپ سے اور کیا کہوں کہ آ کر خدارا میری آپو کو بچا لیں ..... بچا لیں۔"

(اس کے بعد آہیں ..... سسکیاں اور وائس نوٹ ختم)

جی آپ درست سمجھے ..... تو یہ تھا دریشہ ایوب کا پلان "بی" جس پر اس نے بڑی ہشیاری، رازداری اور دانش مندی سے مکمل در آمد کیا ..... ہاں بھئی ..... تھی تو نری ڈرامے بازی مگر اس نے اللہ کا نام لے کر کر ڈالی کہ سے اپنی آپو کی خستہ حالی، والد کی بے چارگی بعد والدہ کے بے دریغ آنسو دیکھے نہ جا رہے تھے اور دوسری طرف روحان تھا کہ جو ایوب صاحب کا فون تک سننے کا روادار نہ تھا تو وہ ان کی بات کیا سنتا تو ایسے میں بھی سب سے بہتر طریقہ تھا اپنی طرف کے حالات موصوف کے علم میں لانے کا ..... اور خود روحان، جو جو او کے صلاح مشوروں کے زیر اثر رمشا سے رابطہ کرنے کی خواہش کے باوجود نامعلوم احساس کے تحت ہچکچاہٹ کا شکار تھا، بروقت موصول ہونے والا یہ وائس میسج اس کا تذبذب زائل کرنے میں کارگر ثابت ہوا یوں وہ پورے اعتماد سے رمشا کو لینے اس کے گھر جا پہنچا اور دریشہ کا پلان "بی" کامیابی کے سرخ فیتے تک .....

"جی؟ کیا پوچھا؟ دریشہ کا پلان "اے" کیا تھا؟"

ارے بھئی ہوگا کچھ بھی ..... اب اس کے تذکرے کا فائدہ بھی کیا ہے ..... اور بے فائدہ کام چوں کہ بے عقل لوگ کیا کرتے ہیں سو ہم یہ نہیں کریں گے اور ویسے بھی اس وقت ان باتوں سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ کہانی کو فائنل اختتام کی جانب لے جایا جائے۔ سو ہم لوٹ رہے ہیں روحان اور رمشا کی باورچی خانے میں جاری گفتگو کی جانب کہ اختتام سے قبل ہر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔

"پھر اس کے بعد کیا روحان؟" روحان کی چند لمحوں کی خاموشی پر رمشا نے بے چینی سے استفسار کیا۔

"پھر اس کے بعد۔" روحان نے رمشا کی آواز پر سلسلہ کلام وہیں سے جوڑتے ہوئے کہا کہ جہاں

www.pklibrary.com

سے اس نے دانستہ توڑ دیا تھا۔ ''تمہاری یاد کچھ اس شدت سے حملہ آور ہوئی کہ میں تمہیں فون کرنے کے بجائے سیدھا لینے ہی چلا آیا۔''

اس نے کمال ہوشیاری سے وریشہ کے وائس نوٹ کا ذکر کیے بغیر رمشا کو ایک ایسا جواب عنایت کیا جو بھلے سے نامکمل ہی ہے مگر تھا بہرحال سچ...... اور سچائی چوں کہ اپنا آپ منوا کر دم لیتی ہے سو ذہن میں کلبلاتے مزید سوالات کے باوجود رمشا کے دل نے شوہر نام دار کے بیان کی صداقت کو تسلیم تو کر لیا مگر شکوہ چوں کہ اس کا پیدائشی حق تھا، سو جی ہی جی میں فرط انبساط سے کھلکھلانے کے باوجود بظاہر بڑا اکھڑا سا منہ بنا کر بولی۔

''یاد نے حملہ آور ہونے میں کچھ دیر نہیں کر دی؟''

''حملے کے آگے میرے غصے کی دیوار موجود تھی ...... جوں ہی دیوار گری حملہ کامیاب ہو گیا...... اور ویسے یہ شکوہ تو میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔'' اس نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد نہلے پہ دہلا مارا۔ رمشا گڑبڑا گئی۔

''خیر...... خیر......'' اس نے عقل مند بیگمات کی طرح اس مرتبہ موضوع گفتگو تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''اب چھوڑیں یہ بے کار کے شکوے شکایات اور ذرا یہ بتائیں کہ آپ کو میرا بنایا ہوا آملیٹ کیسا لگا؟''

وہ پرشوق سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''اچھا تھا۔'' وہ ٹھنڈی ہوتی چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد حوصلہ افزائی کی خاطر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر تم کوشش کرو تو بہت اچھا کھانا پکا سکتی ہو ورنہ گزارے لائق بھی چلے گا کہ بہرحال یہ تمہارا ہی کام ہے۔''

''ہاں...... میں اپنی سی کوشش کروں گی مگر شاید آپ کی امی کے لیول تک نہ پہنچ سکوں۔'' رمشا نے بھی حفظ ماتقدم کے تحت پہلے ہی جتا دیا۔

جس پر بے چارے کو نامعلوم وجوہات کی بنا پر پہلے تو بے طرح کھانسی آ گئی۔

''آہم...... آہم۔'' پھر وہ اچھی طرح کھانس چکنے کے بعد گلا کھنکار کر بولا۔

''تمہیں ان کے لیول تک پہنچنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں...... کیوں کہ تم...... تم ہو اور وہ...... وہ تھیں۔''

''تھینک یو روحان۔'' رمشا کو روحان کے الفاظ نے پرسکون کر دیا...... تب ہی وہ ممنون لہجے میں بولی۔ ''مجھے خوشی ہے کہ آپ میرا پوائنٹ سمجھ گئے۔''

''(اور مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے اول روز تم پر رعب ڈالنے کی خاطر، تمہیں دبئی میں لینے کے لیے تم سے اپنی والدہ کے متعلق جھوٹ بولا...... میری والدہ کہ سگھڑاپا جنہیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا...... گھر میں چولہا جلانے کو جو عیب گردانتی تھیں۔ میرے والد نے ان سے محبت کی شادی کی تھی سو ساری زندگی بہت خندہ پیشانی اور بہت زیادہ پشیمانی سے اس محبت کو نبھانے کی خاطر ہر مقام پر میری والدہ کی نااہلیوں سے سمجھوتا کرتے رہے۔ وہ یقیناً ایک انتہائی شریف، نیک فطرت اور صلح جو آدمی تھے اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں نہ تو ان کی طرح سیدھا ہوں نہ سادا، سو مائی ڈیئر وائف...... سو سوری...... میں فی الوقت تم پر اپنے والدین کی زندگی سے جڑی یہ سچائی آشکار کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا...... ہاں جب کبھی ''ماحول سازگار'' ہوا تو میں ضرور......)''

وہ آنکھوں میں معنی خیز چمک اور لبوں پر پراسرار مسکراہٹ سجائے دل ہی دل مقابل براجمان رمشا سے مخاطب تھا جواب اس سے رات کے مینیو کے متعلق مشورہ طلب کر رہی تھی اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ہیر وکو اتنا گھنا اور میسنا بھی نہیں ہونا چاہیے مگر کیا کیا جائے کہ وہ تھا۔

بہرحال...... یوں یہ کہانی تو پہنچی اپنے اختتام کو، سو اب ہم بھی اجازت لیتے ہیں کہ کرنے والے اور بھی بہت سے کام التوا میں پڑے ہیں۔ اور جی؟ کیا فرمایا؟ جاتے جاتے یہ تو بتاتے جائیں کہ آخر ''ہم'' کون؟

''کمال ہے؟ تو کیا آپ اب تک یہ جان نہ پائے کہ ''ہم'' وہی کہ جس نے آپ کی خاطر یہ کہانی آپ تک پہنچائی ہے اور کون؟؟''

www.pklibrary.com

زارا منجرا

چڑیاں چگ گئیں کھیت

ابا کی وفات کے بعد تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ہمارے سروں سے سائبان چھین لیا ہو۔ رشتہ داروں نے پہلے تو ملنا ملانا کم کیا پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلے بھی ترک ہوگئے۔

ہم دونوں بہنوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ کتابوں کی جگہ سوئی دھاگے نے لے لی۔ اماں کے ساتھ مل کر ہم نے اتنی محنت کی کہ گھر کا دال دلیہ آرام سے چلنے لگا اور ابراہیم کو بھی تائیوں اور چچیوں کے لیے بلکنا نہ پڑتا۔

وقت اپنا راستہ ناپ کر بڑی سرعت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ان ہی لمحوں میں اماں کی نظر بیٹی کے بالوں میں اترتی چاندی پر پڑی اور اسے (اماں کو) نئے اندیشوں اور فکروں نے آلیا۔ قریبی اور دور پار کے رشتہ داروں کو ٹٹولنے پر جب مایوسی ہوئی تو اماں نے اپنے تئیں تگ و دو شروع کردی۔ کئی بے ڈھنگے رشتے آئے جو اماں نے مسترد کردیے اور جو ڈھنگ کا رشتہ آیا تو وہ کوئی مثبت جواب نہ دیتے، اسی رشتہ پریڈ میں دو سال گزر گئے۔

"اماں! میں اب کسی مہمان کے سامنے نہیں جاؤں گی، اس لیے تو مجھے ذلیل کرنے کا یہ تماشا بند کردے۔"

فوزیہ باجی کا انداز حتمیہ والا تھا اور میں بھی ان کی حمایت میں پیش پیش تھی۔

"تو کیا کروں، گھر بٹھالوں تمہیں؟ راتوں کی نیند چھن گئی ہے میری اور تم کہتی ہو میں نے تمہیں ذلیل کرنے کا تماشا لگایا ہے۔"

شاید حالات کی نزاکت اور عمر کا تقاضا تھا کہ اماں کا انداز بھی دن بہ دن چڑچڑا ہوتا جارہا تھا۔ جب بھی کوئی رشتہ آتا تو آس پاس والے پوچھ پوچھ کے ہماری ناک میں دم کردیتے۔ گھر کے ماحول میں عجیب سا تناؤ آگیا، ہم دونوں بہنوں کے مزاج میں بھی درشتی آگئی۔

☆☆☆

"براہ مہربانی اپنے اوٹ پٹانگ رشتے اپنے پاس رکھیں۔ آپ کی بھی دو دو بیٹیاں جوان ہورہی ہیں کل کو کام آئیں گے۔"

ہماری تائی کسی شادی شدہ آدمی کا رشتہ لے کر آئیں تو فوزیہ باجی نے کھری کھری سنادیں۔

"ہم اپنے گھر سے کھاتے ہیں، اپنا پہنتے ہیں کسی پر بوجھ نہیں ہم جو یوں آئے گئے رشتے ہمیں دکھائی پھر رہی ہیں۔ آپ اپنا یہ احسان عظیم اپنے پاس رکھیں اور تشریف لے جائیں۔" میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو میں نے بھی تمام لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے تائی جان کو باہر کی راہ دکھائی۔

"تم دونوں کی زبان درازی اور بدلحاظی کی وجہ سے دیکھنا اب سارے رشتے دار بھی ہم سے چھوٹ جائیں گے۔" تائی کے جاتے ہی اماں نے سر پکڑ لیا۔

"ہماری وجہ سے نہیں، ہمارے حالات کی وجہ سے پہلے ہی سب چھوڑ چکے ہیں ہمیں اور یہ جو بے ڈھنگے رشتے لے کر آئی تھیں نا ہمارے اوپر رحم کا ٹوکرا برسانے نہیں چاہیے ہمیں کسی کی ہمدردی۔"

ہم دونوں بہنوں نے بھی خوب دل کھول کے اپنی بھڑاس نکالی۔ حالات نے ہمیں بہت خودسر اور ضدی بنادیا تھا، اس طرح کئی رشتے ہماری ضد کی

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

بھینٹ چڑھ گئے۔ اماں نے ایک جگہ فوزیہ باجی کا رشتہ طے کر دیا۔ ہمیں کہا گیا کہ لڑکا خوب صورت اور ملازم پیشہ ہے مگر حقیقت کا ادراک تو تب ہوا جب شادی کے اگلے روز فوزیہ باجی اپنے دولہا کے ساتھ آئیں مجھے تو جیسے کسی نے حیرت کدے میں بند کر دیا ہو۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی جس کے تین بچے بھی تھے اور ان ہی کی پرورش کے لیے فوزیہ باجی کو ان کی دوسری ماں بنا کر بھیجا گیا تھا۔

☆☆☆

"اماں! میں اگر تیرے سر پر بوجھ تھی تو میرا گلا گھونٹ دیتی، مجھے زہر پلا دیتی مگر اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا میرے ساتھ؟ مجھے تو لگتا ہے تو ہماری سگی ماں ہی نہیں ہے"......

یونس (فوزیہ کے شوہر) کے جاتے ہی فوزیہ کے اندر پلتے غم اور شکوے کو زبان مل گئی۔ ہم دونوں بہنوں نے بدتمیزی کی ساری حدیں پار کرتے ہوئے اماں کو دھوکے باز اور پتا نہیں کیا کیا کہہ دیا۔ فوزیہ باجی پھر کبھی کبھار ہی آتیں اور اگر آتیں تو اماں سے بے اعتنائی برتتیں۔

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، تم لوگوں کے بھلے کے لیے کیا یہ سب۔ ہر طرح سے جان مار لی تھی جب کوئی بات نہ بنی تو میں نے حالات کے ساتھ سمجھوتا کرتے ہوئے یہ قدم اٹھایا اور میں اپنے فیصلے پر مطمئن ہوں۔ وہ ادھیڑ عمر ہے مگر بہت سمجھ دار اور ہمارے حالات کا بھی بخوبی اندازہ ہے اسے۔ یہ اس کی شرافت اور سمجھ داری ہے جو تم لوگوں کے اکھڑے رویوں کو بھی نظر انداز کیے ہوئے ہے......اور تم لوگ خدا کا شکر کرنے کے بجائے کفر کر رہی ہو۔" ہم دونوں بہنوں کو اماں اکثر سمجھاتی تھی مگر یہ سونے کے مول باتیں ہماری کھوکھلی عقل اور ناقص ذہنوں میں کب سمائی تھیں۔

☆☆☆

وقت کے تنکے گرتے جا رہے تھے، میرے کئی رشتے میری ضد کی نذر ہو گئے۔ "میں فوزیہ نہیں ہوں جسے تو دھوکے سے بیاہ دے گی۔" میں ہر بار ورشتی سے ہر رشتہ رد کر دیتی۔

"کبھی درزی کا تو کبھی حلوائی کا......کیوں ایسے رشتے بلا کر میرا مذاق بنا رہی ہے اماں؟" میری آواز بھرا گئی۔

"میرا بھی دل چاہتا تھا تم دونوں بہنوں کو کسی اچھی جگہ بیاہوں مگر حالات کا تقاضا یہی ہے اور ویسے بھی ہمارے جیسے لوگوں کے گھروں میں ان ہی رشتوں کا آنا غنیمت ہے۔ میری اوقات اتنی نہیں کہ خود سے بڑھ کر کوئی رشتہ دیکھوں۔ اس لیے تم بھی چپ چاپ مان جاؤ۔" اماں کے لہجے میں قطعیت تھی اور میری ضد اپنی جگہ قائم۔ میری خودسری نے اماں کی عقل و سمجھ کو مات دے دی۔

☆☆☆

اماں نے نجانے کہاں کہاں جوتیاں گھسائی ہوں گی اور آج اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ بھلا ہو ماسٹر بشیر کا ان کے تعاون سے ہی آج ابراہیم کو ڈاک خانے میں نوکری مل گئی تھی۔ اماں نے شکرانے کے نوافل ادا کیے۔

نوکری کو ایک سال ہوا تھا کہ ابراہیم نے لڑکی پسند کر لی اور اماں کو بتایا کہ جلد از جلد اس کے گھر رشتہ لے کر جائے۔ یہ بات سن کر اماں تو سرتاپا لرز گئی، میں الگ حیران۔

"اماں یہ تم نے کیا کیا؟ ابھی شازی کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوا اور تم نے ابراہیم کی بات پکی کر دی۔" فوزیہ باجی بھی بھنائی ہوئی تھی۔

"میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا مگر اس کی باتوں سے مجھے بغاوت کی بو آ رہی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کوئی غلط قدم اٹھائے۔ اسی لیے میں نے یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔" اماں کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اور ویسے بھی جب حالات بس میں نہ ہوں تو سمجھوتا کر لینا ہی بہتر ہے۔ کبھی کبھی حالات پر ہماری گرفت ہوتی ہے اور کبھی ہمیں خود کو حالات کے

www.pklibrary.com

سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ یہی زندگی کے اصول ہیں۔

اماں کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ لیکن اس کی باتوں میں بہت اثر اتھا۔

مجھے ان باتوں کے مفہوم تب سمجھ میں آئے، جب اماں نے خاموشی سے اگلے جہاں کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ ماں جائے کی نظروں میں میرے لیے ناگواری ہے۔ اب میرے باپ کے گھر کی زمین مجھ پر تنگ ہوگئی ہے، میں کسی چیز پر اپنا حق نہیں جتا سکتی۔ میں اپنے ہی گھر میں پرائی کر دی گئی ہوں۔ ابراہیم کی بیوی کے دل خراش جملوں کا ـــ کوئی جواب نہیں دے پاتی۔ میرا دل چاہتا ہے زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ جب ابراہیم کے بچے کہتے ہیں......

"پھوپھو کب تک ہمارے گھر میں رہے گی؟ یہ اپنے گھر کیوں نہیں جاتی؟"

بیتے دن روز روشن کی طرح میرے سامنے عیاں ہیں۔

"اماں کہا کرتی تھی، اپنا گھر چاہے تنکوں کا ہو، بھائی بھابیوں کی ٹھوکروں سے ہزار گنا بھلا۔"

اس کی ساری باتوں کے معنی و مفہوم مجھے اب سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ وہ ہمیں حالات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتی تھی مگر ہماری ضد نے اسے مات دے دی۔ فوزیہ کی شادی کو ہم نے دھوکا کہا۔ اماں کو بے نقط سنائیں لیکن آج جب وہ اپنے گھر میں بہت مطمئن ہے، وہ اپنے شوہر کے گھر میں کسی ملکہ سے کم نہیں۔ یہ سب اماں کی کوششوں کی بدولت ہے جو وہ دن رات کیا کرتی تھی۔ اس کی عقل اور تجربہ ہم سے زیادہ تھا مگر ہم نے اس کی کسی بات کو بھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔

"کاش! اس وقت میں نے بھی حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہوتا۔"

"جو لوگ حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے کا فن جانتے ہیں، زندگی انہیں کبھی مات نہیں دیتی اور نہ ہی پچھتاوے ان کا مقدر بنتے ہیں۔"

وہ یادوں کے سمندر میں ڈوب اور ابھر رہی تھی۔ آنکھوں سے بے رنگ پانی کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ آنسوؤں کے اس سیلاب میں صرف پچھتاوا تھا مگر اب پچھتانے کا کیا فائدہ تھا، اب تو چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔

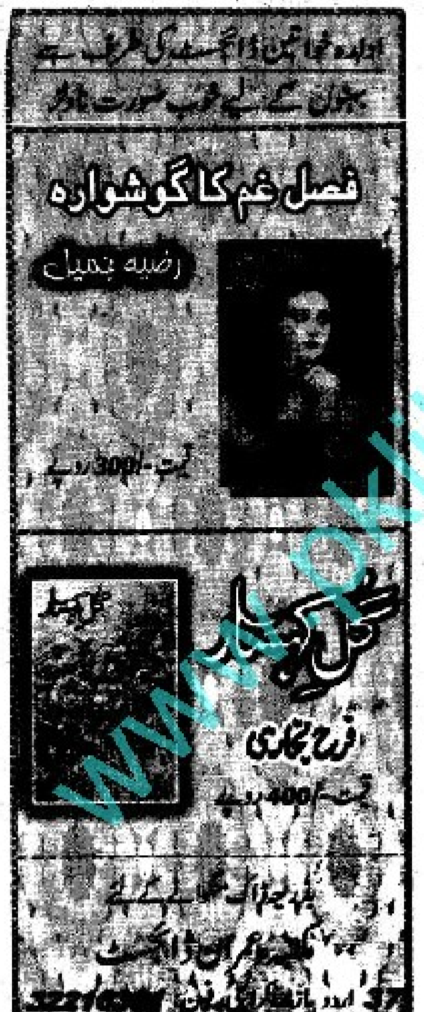

نگہت سیما

اک دیا رہے نہ دیا

وہ گیارہ سال بعد اس گھر میں واپس آئی تھی۔ اب بھی نہ آتی اگر چھوٹے واجی اسے منت کر کے نہ بلاتے کہ ان کی جان اس میں اٹکی ہوئی ہے۔ انہیں معافی چاہیے۔ انہیں اس سے بہت کچھ کہنا تھا۔ اور وہ آگئی۔ سامنے والے گھر کی بالکونی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے نجانے کیا کچھ سوچ ڈالا تھا۔

چار سال کی عمر میں عبدالکریم کاکا اسے یہاں لے کر آئے تھے 1948ء دسمبر میں۔ آغا منزل اس کے نانا آغا فرحان علی کا گھر تھا اس گھر میں اس کے دو ماموں وحید آغا اور سعید آغا بھی اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ آغا فرحان علی کے چھوٹے بھائی آغا ریحان علی بھی اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔

عبدالکریم کاکا نے بتایا کہ فسادات میں پورا خاندان ختم ہو گیا صرف عروج فاطمہ بچ گئی۔ یوں عروج فاطمہ اور عبدالکریم کاکا آغا منزل میں رہنے لگے۔

1959 میں حیدر سلطان آ گئے عبدالکریم کاکا نے اسے بتایا کہ یہ اس کے چاچو ہیں۔ آغا منزل میں رشتوں میں نفسانفسی تھی۔ سامنے کوٹھی میں رہنے والے گھرانے سے عروج فاطمہ کی دوستی ہو جاتی ہے۔ انیس اسے پسند کرتے ہیں زہرہ آپی اور دبیر بھائی اسے بہنوں کی طرح چاہتے تھے۔ اس کا رشتہ انیس سے طے ہو جاتا ہے۔ ریحان آغا اپنی بیٹی صبا کے لیے آغا جان سے کہتے ہیں۔

ریحان آغا کی دھمکی کے بعد آغا جان پریشان ہو کر عروج کو بلا کر کہتے ہیں کہ وہ عبدالکریم سے کہے کہ وہ حسن صاحب اور ان کی بیگم کو بلا کر لائے۔ وہ ان سے کہتے ہیں کہ انیس آ گیا ہے تو وہ آج ہی عروج اور انیس کا نکاح

مکمل ناول

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

پڑھوا دیتے ہیں۔ حیدر بھی آجاتے ہیں، عبدالکریم جس وقت حسن صاحب کو بلا کر لاتے ہیں تو حسن صاحب کو احساس ہوتا ہے۔ کہ آغا جان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ حیدر کو اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ حسن صاحب ڈاکٹر کو بلاتے ہیں وہ ان کی موت کی تصدیق کر دیتا ہے۔ حیدر چاچو کو انجکشن لگا کر سلا دیا جاتا ہے۔

ریحان آغا کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ وہ انیس اور عروج کی شادی ٹال دیتے ہیں۔ حیدر کو مینٹل ہاسپٹل پہنچا کر وہ عروج کو دھمکی دیتے ہیں کہ وہ خود انیس سے شادی سے انکار کر دے۔

آغا جان کی برسی کے بعد وہ حسن صاحب اور ان کی بیگم سے کہتے ہیں کہ عروج بچپن سے ان کے بیٹے حسنین سے منسوب ہے اور وہ چاہیں تو ان کی بیٹی صبا سے انیس کی شادی ہو سکتی ہے۔ وہ سوچنے کا کہہ کر چلے جاتے ہیں۔

عبدالکریم کاکا اور عروج چھپ کر حیدر کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں واپسی میں انیس سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ساری صورت حال جان کر کہتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کل آئے گا۔ اگلے دن جنگ ہو جاتی ہے۔ انیس واپس چلا جاتا ہے۔ صبا بتاتی ہے کہ انیس جنگ میں مر گیا ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

”کیا میری سیٹ بک ہو گئی ہے، کب جانا ہے مجھے؟“

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

”نہیں، لیکن جلدی بھجوا دوں گا تمہیں، ہفتہ دس دن تک۔“

”اچھا۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”اور اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا نرگس بھابی آگئی ہیں؟“

”نہیں۔ وہ تو ابھی نہیں آئیں، دراصل ماں کے بعد چھوٹے بہن بھائی اکیلے رہ گئے ہیں تو انہیں ہی سیٹل کرنا ہے نہیں۔“

”تو پھر میں کہاں رہوں گی؟“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”اپنے گھر......“

اس نے ذرا سا رخ اس کی طرف کیا اور لمحہ بھر اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔

اور اگر وہ میکی سے طلاق لے لے اور عروج کے ساتھ...... لیکن میکی تو اسے سڑک پر لے آئے گی...... اوہ! نہیں...... نرگس بھابی اور مسعود ٹھیک تو کہہ رہے تھے اسے پاکستان میں ہی رکھو اور میکی کو یہاں...... اور خود بھی کبھار پاکستان کے چکر لگاتے رہا کرو۔ دونوں کو برابر کے حقوق دو۔“ یا پھر صرف عروج ایسی ہے، پزل گرل۔“

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”دراصل میکی اپنی مدر سے بہت اٹیچ تھی اس لیے ابھی تک بہت اپ سیٹ تھی تو میں نے کہا کہ ہفتہ بھر کے لیے اپنی بہن کے پاس ڈربی چلی جائے، دل بہل جائے گا۔ دو ہی بہنیں ہیں اور دونوں کی آپس میں بہت بنتی ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تمہیں ان لڑکیوں کے ساتھ مشکل ہو رہی ہو گی۔ میں تو صبح ہی آنا چاہتا تھا لیکن ایسا کاموں میں پھنسا کہ...... بس ابھی فارغ ہوا اور تمہیں لینے چل دیا۔“ اس نے ایک بے حد گہری نظر اس پر ڈالی۔

”لیکن میں ٹھیک تھی۔ ادھر کچھ مشکل نہیں تھی۔ مجھے سیٹ مل جاتی تو......“

وہ بے حد گھبرا گئی تھی۔

”اتنا گھبرا کیوں رہی ہو، میری بیوی ہو تم۔ میں تمہیں بھگا کر تو نہیں لے جا رہا۔ میکی کے آنے تک اطمینان سے میرے پاس رہو۔“ وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوا تھا۔

”شاید ساری ایشیائی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں

وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا اور گود میں دھرے اس کے ہاتھ پسینے سے بھیگتے جا رہے تھے۔ تو یہ دن تو آنا ہی تھا

www.pklibrary.com

زندگی میں، جب اس نے نکاح نامے پر دستخط کیے تھے تب سے جانتی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور دل...... کو جیسے کسی نے آہنی شکنجے میں دے دیا تھا۔ وہ بیش بہا آنکھیں جن میں اس کے لیے محبتوں کے سمندر موجزن ہوتے تھے، تصور میں جیسے اس سے گلہ کر رہی تھیں۔

"کل رات بابا جان سے بات ہوئی تھی، ادھر پاکستان میں سب ٹھیک ہیں۔ حیدر بھائی بھی اور کریم کاکا بھی۔"

"اور...... اور کچھ کہا تھا انہوں نے چاچی کے متعلق؟" وہ ان کا نام سن کر بے چین ہوئی تھی۔

"نہیں اور تو کچھ نہیں کہا تھا، بس ثقلین کا بتایا تھا کہ صاحبزادی یاسمین سے اس کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔"

وہ چاہتا تھا کہ عروج اس سے بے تکلف ہو جائے سو وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا لیکن اس کا ذہن کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہو رہا تھا۔ کبھی وہ انیس الحسن کے متعلق سوچنے لگتی، کبھی چاچی کے متعلق، کبھی اسے اختر بانو اور کرن کماری کا خیال آ جاتا۔ زندگی نے اس کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا تھا، بالکل بھی نہیں۔ تو کیا خراج...... تو کیا وہ وہ کسی معجزے کی منتظر تھی۔ اس نے خود سے پوچھا اور بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو پلکوں تک روکنے کی کوشش کی۔

"چلیں آ گیا ہمارا گھر۔" حسنین نے کہا تو وہ چونکی۔ گاڑی ایک بڑی بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔

"آ جاؤ۔" حسنین گاڑی سے اتر کر ڈگی سے اس کا اٹیچی کیس نکالنے لگا تھا۔ وہ بنا کچھ کہے خاموشی سے حسنین کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے فلیٹ میں آ گئی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک لگژری فلیٹ تھا۔ لیونگ روم کا فرنیچر اور قالین خاصا قیمتی تھا۔ حسنین نے اس کا اٹیچی کیس لیونگ میں ہی چھوڑ دیا تھا اور اسے لے کر بیڈ روم میں آ گیا تھا۔

"یہ رہا بیڈ روم...... تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ کچھ دیر آرام کر لو۔"

آج کا دن سچ میں تھکا دینے والا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"کچن میں کافی کا سامان ہوگا۔ پینا چاہو تو اپنے لیے بنا لینا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے، گھنٹے تک آ جاؤں گا۔ کچھ دیر بھی ہو جائے تو گھبرانا مت۔ میں لاک کر کے جاؤں گا اور واپسی پر آتے ہوئے ڈنر کے لیے فش اینڈ چپس لے آؤں گا۔ سونا چاہو تو سو جانا...... بلکہ بے فکر ہو کر سو جاؤ پھر......" وہ ہولے سے ہنسا اور بائیں آنکھ کا کونا دبایا۔

"اچھا ہے نا، نیند پوری کر لو۔"

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کب یوں ہی بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ شاید کرن کماری سچ ہی کہتی تھی کہ زمین پر پرانے میٹرس پر سو سو کر کمر تختہ ہو چکی ہے۔ سو آرام دہ بیڈ پر وہ بہت گہری نیند سو گئی تھی۔

وہ بہت گہری نیند میں تھی جب کسی نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا تھا۔

"ہے...... اٹھو کون ہو تم اور یہاں میرے بیڈ روم میں کیسے آئی ہو؟"

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے سامنے کھڑی وہ عورت کون ہے۔ پھر جیسے اس کے حواس بیدار ہوئے۔ میگی دایاں ہاتھ کمر پر رکھے اسے اپنی نیلی، سرد، بے مہر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی...... وہ میگی تھی۔ اس نے پہچان لیا تھا۔

"تم یہاں...... یہاں میرے اس بیڈ روم میں کیسے...... کس طرح؟"

"وہ...... میں...... حسنین کے ساتھ آئی تھی۔"

اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ......" اس نے گالی دی۔ "وہ لایا ہے تمہیں...... عیاشی کے لیے......"

"تو...... تو......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ...... میں......"

میگی نے آنکھیں میچ کر اسے دیکھا۔

"تم...... وہ ہوناں...... وہی جو اس روز نرگس کے ساتھ تھیں۔ حسنی کی دور پار کی رشتہ دار۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"اور تم...... تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہاں میرے بیڈ پر سونے کی...... نکلو...... ابھی نکلو یہاں سے۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے بیڈ سے اٹھایا تھا۔

"یہ...... یہ میرا گھر ہے اور وہ میری اجازت کے بغیر تمہیں یہاں کیسے لا سکتا ہے۔"

وہ اسے تقریباً دھکے دیتی ہوئی مین روڈ تک لائی تھی اور پھر اسے باہر نکال کر دروازہ زور سے بند کیا تھا۔ وہ حیران سی ساکت کھڑی تھی۔ تب ہی دروازہ کھول کر اس نے اس کا اٹیچی کیس اور شولڈر بیگ بھی باہر پھینکا تھا۔ وہ یوں ہی خالی الذہن سی اپنا اٹیچی گھسیٹتی چلنے لگی تھی۔

وہ کہاں جا رہی تھی، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ بس چل رہی تھی۔ چلتے چلتے تھک کر وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہی پھر جیسے اس کے حواس کام کرنے لگے تھے۔ وہ سوچنے لگی تھی، اس سب کے متعلق جو کچھ دیر پہلے ہوا تھا۔ حسنین اسے گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ سو گئی تھی اور میگی جو حسنین کے مطابق ڈربی گئی ہوئی تھی، اچانک واپس آ گئی تھی اور اپنی چابی سے لاک کھول کر اندر آ گئی تھی۔ شاید میگی کا ردعمل صحیح تھا لیکن وہ کیا کرے، کہاں جائے۔

رات ہو گئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس جل اٹھی تھیں۔ وہ اگر پاکستان میں یوں فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوتی تو کئی لوگ رک کر پوچھتے کہ وہ اس طرح سامان کے ساتھ یوں فٹ پاتھ پر کیوں بیٹھی ہے، کہاں جانا ہے اسے۔ لیکن یہ پاکستان نہیں تھا، کسی نے رک کر اس سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہے۔ نرگس بھابھی یہاں نہیں تھیں۔

اختر بانو اور گرین بلڈنگ...... وہ وہاں جا سکتی تھی لیکن کیسے...... اسے تو یہ تک پتا نہیں تھا کہ گرین بلڈنگ کہاں اور کس علاقے میں تھی اگر وہ کوئی ٹیکسی روک بھی لیتی تو اسے کیا پتا بتاتی...... اور اختر بانو کا گھر......

پارک سے نکل کر روڈ کراس کرکے دائیں طرف...... لیکن پارک کس علاقے میں تھے، وہ نہیں جانتی تھی۔ حسنین اسے گرین بلڈنگ میں چھوڑ گیا تھا اور وہ ہی اسے اب واپس لایا تھا تو...... تو کیا وہ یہاں ہی بیٹھی رہے گی اور کیا اب وہ...... ایک دم اسے یاد آیا کہ عبدالکریم نے اسے ایک ایڈریس دیا تھا کہ......

اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے بیگ سے چیزیں نکال نکال کر گود میں پھینکنے لگی تھی لیکن پریشانی میں اسے وہ چھوٹا سا کاغذ مل ہی نہیں رہا تھا۔ دوبارہ بیگ کھنگالنے کے بعد جب وہ مایوس ہو چکی تھی تو وہ ننھا سا پرزہ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

"فیروز احمد......" اس نے دو تین بار پڑھا۔ ایڈریس، فون نمبر سب لکھا تھا۔ اس کاغذ کے ننھے سے پرزے کو کسی قیمتی متاع کی طرح مٹھی میں دبائے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسے اب کسی ٹیلی فون بوتھ کی تلاش تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی سامان گھسیٹتی جا رہی تھی۔ ابھی تک اسے کوئی ٹیلی فون بوتھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ "یا اللہ میری مدد فرما۔ اگر رات زیادہ ہو گئی تو میں کیا کروں گی۔ کہاں جاؤں گی۔ یا اللہ......" اس نے دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ اپنے بندے کی پکار نہ سنتا۔ اس نے روڈ پر ایک بچے کی انگلی پکڑے جاتی خاتون کو دیکھا تو بے اختیار پکارا۔

"پلیز کیا آپ مجھے کسی ٹیلی فون بوتھ کے متعلق

www.pklibrary.com

جاتی تھی۔

خاتون نے رک کر اسے دیکھا اور سڑک کے پار اشارہ کیا۔ "وہ رہا۔" اس نے سر اٹھا کر سڑک کے پار دیکھا اور پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

"اختر بانو...... اختر بانو......"

وہ بلند آواز میں پکار رہی تھی اور اختر بانو نے نہ صرف اس کی پکار سنی تھی بلکہ اسے دیکھ بھی لیا تھا۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں نے بس ایک نظر اسے دیکھا تھا اور اپنے راستے پر ہو لیے تھے۔ اختر بانو تیزی سے سڑک کراس کر کے اس کی طرف آئی تھی۔

"اختر...... اختر......" وہ اٹیچی کا ہینڈل چھوڑ کر یک دم اس کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ اتنی دیر کی ٹینشن اب آنسوؤں کی صورت نکل رہی تھی۔

"ریلیکس...... ریلیکس عروج فاطمہ!"

اختر بانو ہولے ہولے اسے تھپک رہی تھی۔

ایک دو درمیانی عمر کے گورے اسے روتا دیکھ کر رکے تھے۔ سوالیہ نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا تھا اور پھر کوئی جواب نہ پا کر کندھے اچکاتے ہوئے اپنی راہ ہو لیے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہے لیکن اختر بانو کو دیکھتے ہی اسے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ مگر اس نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا۔

"اگر تم نہ آتیں اختر! تو میں کیا کرتی۔ کہاں جاتی۔ پتا نہیں فیروز بھائی سے میرا رابطہ ہوتا بھی یا نہیں۔" ساری بات بتا کر اس نے اشک آلود نظروں سے اختر بانو کو دیکھا۔

"اللہ اپنے بندوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا عروج فاطمہ! اور اللہ نے ہی مجھے بھیجا تھا۔ میرا تو آج آف تھا لیکن میری دوست کی طبیعت خراب تھی۔ اس نے مجھے فون کیا کہ میں آج اس کی جگہ ڈیوٹی دے دوں تو اب میں ڈیوٹی دے کر واپس جا رہی تھی۔"

"بہت سی باتوں کا ہمیں علم نہیں ہوتا عروج فاطمہ! کچھ چیزیں ہمارے لیے ہو رہی ہوتی ہیں۔ میرا تم سے پارک میں ملنا، گھر لے جا کر ڈیڈ اور مام سے ملوانا اور پھر آج ریسٹورنٹ میں ڈیوٹی دینے آنا...... یہ سب پہلے سے طے تھا۔"

اور اس روز اس نے جانا تھا کہ اختر بانو ایک شوخ و شریر لڑکی نہیں تھی بلکہ ایک بہت میچور اور اللہ پر پختہ یقین رکھنے والی لڑکی تھی۔

"پتا ہے ڈیڈ نے تمہارے جانے کے بعد کوئی پچیس دفعہ تمہیں یاد کیا اور تمہارے لیے دکھی ہوئے۔"

اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچ کر اختر بانو ہولے سے ہنسی تھی۔

"اور اب وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر بہت زیادہ حیران اور بہت زیادہ خوش ہوں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا تھا۔ صرف وقار علی خان ہی نہیں ٹیپو سلطان اور سلطانہ بانو کی بھی یہی کیفیت تھی۔

"تم یہ سمجھو عروج فاطمہ! کہ تم کسی غیر کے نہیں اپنے باپ کے گھر ہو۔"

انہوں نے اختر بانو سے مختصراً ساری بات سن کر اسے تسلی دی تھی اور اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"پلیز...... آپ مجھے کسی طرح پاکستان بھجوا دیں۔ مجھے اپنے چاچی کے پاس جانا ہے۔"

"ضرور، جیسا آپ چاہو گی بیٹا! ویسا ہی ہوگا۔ رو مت اور پریشان مت ہو۔"

سلطانہ بانو نے اسے گلے لگا کر تسلی دی تھی لیکن جیسا انسان چاہتا ہے ضروری تو نہیں کہ ویسا ہی ہو اور عروج فاطمہ نے بھی جو چاہا تھا ویسا نہیں ہو سکا تھا۔ کیونکہ اس کا پاسپورٹ تو حسنین کے پاس تھا۔

"اور حسنین کہاں رہتا ہے اس کا کوئی فون نمبر ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں پہلے فون پر بات کرتا ہوں اس سے اور پھر تمہارا پاسپورٹ لے آتا ہوں خود جا کر۔ باقی کام تو بعد کا ہے۔"

نواب زادہ وقار علی خان نے اگلی صبح پوچھا تھا۔

اور حسنین کہاں رہتا تھا، اس کا گھر کا ایڈریس اور فون نمبر...... وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اسے بھلا کیا پتا...... ہاں دادی جی نے آتے ہوئے احتیاطاً اسے

www.pklibrary.com

حسنین کا ایڈریس اور فون نمبر دیا تھا اور وہ کاغذ اس نے اپنے شولڈر بیگ میں رکھا تھا۔

اور اس نے بیگ کی ایک ایک چیز، ایک ایک کاغذ باہر نکال کر دیکھا لیکن شاید جب وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی فیروز احمد کا ایڈریس اور نمبر ڈھونڈ رہی تھی، حسنین کے پتے والا کاغذ وہیں کہیں ہی گر گیا ہوگا۔

فیروز کا ایڈریس ڈھونڈتے ہوئے وہ اس کی نظر سے گزرا تو تھا۔

اور فیروز احمد...... ہاں فیروز احمد کا فون نمبر...... وہ مل جائے تو وہ عبدالکریم کاکا سے حسنین کا فون نمبر اور پتا منگوا لیتی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے بیگ کی سب چیزیں نکال کر بیگ کو اچھی طرح جھاڑا لیکن فیروز کے نمبر والا کاغذ نہیں ملا۔ جب وہ اختر بانو کے گلے لگی رو رہی تھی تو شاید مٹھی میں دبا کاغذ کا وہ پرزہ گر گیا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟''

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

فیروز احمد کا پتا اور نمبر بھی نہیں ملا تھا اور اب اس اجنبی ملک میں وہ بالکل بے دست و پا تھی۔

''پاکستانی سفارت خانے میں ایک دو بندے ہیں جاننے والے، ان سے بات کر کے دیکھتا ہوں کہ پاسپورٹ کی گم شدگی کی صورت میں کیا کیا جا سکتا ہے۔''

وقار علی نے اسے تسلی دی تھی۔

''کیا تمہاری وہ نرگس بھابی انڈیا سے آ گئی ہیں۔'' اختر بانو کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

''وہ حسنین سے تمہارا پاسپورٹ لا سکتی ہیں۔''

''ہاں، وہ تو ہے لیکن وہ ابھی تک انڈیا میں ہی ہیں...... پتا نہیں کب آئیں گی۔''

''ہاں تو جب بھی آئیں، تم کون سا فٹ پاتھ پر بیٹھی ہو۔ اپنے ابا میاں کے گھر ہی ہو نا۔'' اختر بانو نے اپنے مخصوص شوخ انداز میں کہا۔

''اور ڈیڈ بھی تو اپنے اس سفارت خانے والے دوست سے بات کریں گے نا۔ تم مجھے اپنی نرگس بھابی کا فون نمبر دے دینا، میں وقتاً فوقتاً ٹرائی کرتی رہوں گی۔'' اس نے سر ہلا دیا تھا کہ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ وقار علی کے دوست چھٹی پر پاکستان گئے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے ایک اور شخص سے بھی بات کی ہے۔ جلدی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور دعائیں مانگتے مانگتے وہ تھک گئی تھی۔ لیکن کہیں کوئی امید، کوئی آس نظر نہیں آئی تھی۔ یہاں اس گھر میں سب ہی اس کا خیال رکھتے تھے، محبت کرتے تھے، عزت دیتے تھے۔ لیکن وہ ساری زندگی یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔

اسے پاکستان جانا تھا اپنے چاچی کے پاس۔

اس نے خود بھی دو تین بار نرگس بھابی کو فون کیا تھا لیکن کسی نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر اختر بانو ایک بار نرگس بھابی کے فلیٹ سے بھی ہو آئی تھی لیکن فلیٹ لاک تھا۔

اسے پاکستان سے آئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ پتا نہیں اس کا ویزا کتنا تھا۔ داجی نے تو اسے بتایا تھا کہ تین ماہ بعد اسے واپس آنا تھا پھر اب پتا نہیں کیا ہوگا۔ وہ بے حد دل گرفتہ سی سلطانہ بانو کے پاس لاؤنج میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ کیوں نہ گرین بلڈنگ جا کر لینڈ لیڈی سے پوچھے کیا خبر اس کے پاس حسنین کا پتا ہو اور جب یہ بات اس نے سلطانہ بانو سے کی تو انہوں نے اس کی تائید کی۔

''کیوں نہیں، ضرور جاؤ۔ بانو آ جائے تو اس کے ساتھ چلی جانا۔''

اور تب ہی اختر بانو شور مچاتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔

''عروج...... عروج کہاں ہو بھئی؟ دیکھو کون آیا ہے۔''

اور اس کے پیچھے آتی نرگس کو دیکھ کر وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی تھی اور کتنی ہی دیر تک ان کے گلے لگے روتی رہی تھی۔

www.pklibrary.com

"لگتا ہے عروج فاطمہ! آپ کے اندر سمندر رہا گئے ہیں کہ اتنا رو رو کر بھی آپ کے آنسو خشک نہیں ہوتے۔" اختر بانو نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سلطانہ بانو کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

"فکر نہ کرو عروج! میں کل ہی حسنین سے مل کر تمہارا پاسپورٹ لے لیتی ہوں۔"

نرگس نے اس کے کندھوں پر تھپکی دیتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔ اختر بانو نے اسے ساری بات بتادی تھی۔

"ابھی تو مجھے تم سے ملنے کی جلدی تھی، اس لیے اختر بانو کے ساتھ ہی دوڑی چلی آئی۔ دو دن پہلے ہی میں انڈیا سے آئی ہوں۔ ابھی تو جاب اسٹارٹ نہیں کی۔ مسعود ان دنوں مانچسٹر میں ہوتا ہے۔ اسے وہاں اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس لیے تمہارا اس سے بھی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ مسعود مانچسٹر میں ہی میری جاب کے لیے کوشش کر رہا ہے لیکن جانے سے پہلے تمہارا کام کر دوں گی۔ ہاں، تمہارے دو خط بھی آئے ہوئے تھے۔ مسعود نے بتایا تھا کہ اس نے لیٹر بکس سے نکال کر ٹیبل کی دراز میں رکھے تھے لیکن مجھے جلدی میں ایک ہی ملا۔ دوبارہ آؤں گی تو لے آؤں گی۔"

اور نرگس بھابی کے جاتے ہی اس نے بڑی بے تابی سے خط کھولا تھا۔ عبدالکریم نے لکھا تھا کہ حیدر بھیا پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ بار بار تمہارا پوچھتے ہیں۔ ایک روز میں پارک میں لے جانے کے بہانے ڈاکٹر صاحب کی طرف لے گیا تھا۔ انہوں نے ایک دوا اور بھی بند کر دی اور امید دلائی ہے کہ اب جلد ہی مکمل طور پر ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایک روز آپ کا پوچھ رہے تھے تو میں نے بتایا بڑے صاحب نے آپ کو انگلینڈ بھیج دیا ہے تو ان سے خوب لڑے، اونچا اونچا بولے۔ کہتے تھے، ابھی میری بہو کو لے کر آؤ۔ نہیں تو مار دوں گا سب کو۔ میں بڑی مشکل سے انہیں کمرے میں لایا اور نیند کی دوائی دی۔

میرا دل کہتا ہے بٹیا کہ جب آپ آجائیں گی تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے اور ہاں، میں حسن ولیج گیا تھا۔ انیس بھیا بھی ولایت سے آگئے ہیں اور اب تو بالکل ٹھیک ہیں وہ۔ اماں جی نے بتایا تھا مجھے، خود تو میری ملاقات نہیں ہوئی، وہ ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے۔ میں نے آپ کی امانت اماں جی کے حوالے کر کے ساری بات بھی بتادی تھی، بہت دکھی تھیں کہ آپ ان کے گھر کا نصیب نہ بن سکیں اور آپ کو بہت دعائیں دیتی تھیں اور کہتی تھیں زیور فروخت کرنے کی کیا ضرورت ہے، حیدر کوئی پرایا بچہ تو نہیں ہے، اپنا ہی ہے۔ جب ضرورت ہو لے لینا لیکن مجھے تو ضرورت ہی نہیں پڑی ابھی تک۔ کچن کا سامان سب بڑے صاحب نے بھجوا دیا تھا اور دوائیاں وغیرہ تو لے آتا ہوں۔ ابھی آپ کے دیے ہوئے پیسے پڑے ہیں۔"

چاچی کے متعلق عبدالکریم نے اچھی خبر دی تھی۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں کتنی دیر تک اس کے آنسو خط کو بھگوتے رہے تھے۔ کیا تھا جو دل کو زخمی کرتا تھا، رہ رہ کر دل میں ٹیسیں سی اٹھتی تھیں اور جب انیس الحسن کو پتا چلے گا کہ میں...... اور کیا سوچتا ہو گا وہ کہ میری محبت اتنی کمزور تھی۔

کاش میں کبھی اسے بتا سکتی کہ میں نے کیسے اور کیوں مات کھائی ہے اور کاش میں کبھی اسے اپنا دل چیر کر دکھا سکتی کہ میں نے بھی اس سے بے حد، بے حساب محبت کی ہے اور کیا کبھی اس کی زندگی میں ایسا لمحہ آ سکتا ہے کہ وہ انیس الحسن کے روبرو اپنی محبت کا اظہار کر سکے۔ پھر اسے اپنی ہی خوش فہمی پر ہنسی آگئی اور رونا بھی۔

اسے تو بس اب پاکستان جانا تھا اپنے چاچی کے لیے اور صرف ان کے لیے ہی اسے زندگی کی چاہ تھی۔ وہ عبدالکریم کاکا کو لکھ دے گی کہ وہ اس کے پاکستان آنے کے متعلق کسی کو نہ بتائیں اور چپکے سے چاچی کو اس کے پاس لے آئیں۔ وہ وہاں قصور میں ہی چھوٹا سا کوئی گھر لے کر رہنے لگیں گے۔

وہ سوچتی رہتی، خواب بنتی رہتی۔ دعائیں کرتی

www.pklibrary.com

رہتی اور پھر اس کی کچھ دعائیں قبول ہوگئیں۔

ہفتہ بھر بعد ہی نرگس بھابی اس کا پاسپورٹ لے آئی تھیں۔

"تمہارے حوالے سے کافی پریشان رہا بے چارہ۔ پولیس میں بھی رپورٹ درج نہیں کروا سکتا تھا کہ خود پکڑا جاتا۔ اس روز میکی نے اس کی خوب مٹی پلید کی تھی۔ دراصل میکی نے جب اپنی بہن کو فون کیا کہ وہ ڈربی آرہی ہے اس کے پاس تو بہن نے بتایا کہ وہ لوگ تو خود اسکاٹ لینڈ جا رہے ہیں چندرہ دنوں کے لیے تو میکی کسی دوست کے ساتھ پہلے تو فلم دیکھنے چلی گئی پھر اس کے ساتھ ہی ڈنر کر کے واپس آئی تو تمہیں اپنے بیڈ پر سوتے دیکھا اور...... اگر حسنین کو ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ ڈربی نہیں گئی تو وہ کبھی بھی تمہیں لے کر نہ جاتا۔ دونوں کے پاس فلیٹ کی چابی ہوتی ہے۔" نرگس نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

"وہ تو کسی صورت تمہارا پاسپورٹ نہیں دے رہا تھا اور تمہارا پتا پوچھ رہا تھا۔ میں نے بھی خوب جھوٹ بولے اور دھمکی دی کہ اگر اس نے تمہارا پاسپورٹ نہ دیا اور تمہیں طلاق نہ دی تو میں میکی کو اس کی شادی کا بتادوں گی اور یہ کہ تم اپنے فادر کے کسی دوست کے گھر میں ہو جو اتفاقاً تمہیں مل گئے تھے اور یہاں سفارت خانے میں بہت بڑے افسر ہیں اور وہ تو اتنے غصے میں ہیں کہ تم پر کیس کرنے والے تھے، میں نے بمشکل روکا۔"

اختر بانو ہنسنے لگی تھی۔

"اور آپ کے اتنے ڈھیر سارے جھوٹوں کا کیا فائدہ ہوا پاسپورٹ کے علاوہ۔"

"حسنین، عروج کو طلاق دینے پر تیار ہوگیا ہے بلکہ یوں سمجھو، اس نے طلاق دے ہی دی ہے۔ بس کاغذی کارروائی کرنی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ یہاں اس کا ایک پاکستانی وکیل دوست ہے، اس سے مشورہ کرے گا۔"

اور عروج کو یوں لگا تھا جیسے وہ ان دیکھی بھاری زنجیریں جن میں حسنین سے شادی کے بعد وہ خود کو جکڑا ہوا پاتی تھی، خود بخود ہی ٹوٹ کر گر گئی ہوں۔

اسے اپنا آپ ایک دم بہت ہلکا پھلکا لگا تھا۔

"اور ہاں سنو، اپنے انیس الحسن سے فوراً رابطہ کر کے اسے سب بتادو۔"

اس نے اختر بانو اور سلطانہ بانو کے کچن میں جانے کے بعد کہا جو نرگس کو کھانے کے لیے روک کر خود کھانے کا اہتمام کرنے چلی گئی تھیں۔

"وہ بھلا اب مجھ سے کیوں شادی کرے گا، ایک طلاق یافتہ عورت سے۔"

اس کے اندر امید کی ایک لو لمحہ بھر کے لیے ٹمٹما کر بجھ گئی تھی۔

"کیوں نہیں کرے گا میری جان! وہ اگر تم سے محبت کرتا ہے تو ضرور کرے گا اور اگر نہیں کرتا تو سمجھو اس نے کبھی تم سے محبت ہی نہیں کی۔"

نرگس نے ہولے سے اس کا رخسار تھپتھپایا تھا۔

محبت...... اسے انیس الحسن کی محبت پر تو کبھی شک نہیں ہوا تھا۔ یہ محبت چند دن کی تو نہیں تھی۔ یہ تو بچپن سے ہی دونوں کے دلوں پر قبضہ کیے ہوئے تھی۔

ایک یقین نے اس کے اندر روشنی بکھیر دی تھی۔

انیس الحسن کی محبت کا یقین......

"سنو، میری جاب ہوگئی ہے مانچسٹر میں...... میں اگلے ہفتے تک چلی جاؤں گی اور جانے سے پہلے تم سے ملنے آؤں گی اور تمہارے لیے میں نے کچھ رقم بھی رکھی ہوئی تھی تمہارے ٹکٹ کے لیے۔ وہ بھی لے آؤں گی۔"

"نہیں...... نہیں نرگس بھابی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس کچھ گولڈ ہے اور کچھ رقم بھی ہے۔ آپ نے جو یہ احسان مجھ پر کیا ہے ساری زندگی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔"

"کیسا احسان؟" نرگس اس کی بات پر خفا ہوئی تھیں۔ "میں نے جو کچھ کیا اپنی چھوٹی بہن کے لیے کیا ہے۔ لیکن شاید تم مجھے اپنی بڑی بہن نہیں سمجھتیں۔"

"نہیں...... نہیں نرگس بھابی! ایسا نہیں ہے۔"

وہ یک دم ان کے گلے لگ گئی تھی۔

"آپ، اختر بانو اور اس کی فیملی، حسن پیلس والے..... آپ سب سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے لیکن آپ سب میرے سب سے زیادہ اپنے ہیں۔ میرے لیے اللہ کا انعام۔ میں جب تھک جاتی ہوں، ٹوٹنے لگتی ہوں تو اللہ آپ جیسے لوگوں کو میرا حوصلہ، میری ہمت بنا کر بھیج دیتا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"نہیں..... اب رونے کا نہیں بابا۔" نرگس نے ایک انڈین موری کے کسی کردار کا جملہ بولا اور ہنس دی۔

"ہاں یہ تمہارا خط مسعود نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز کے بجائے اپنی رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا تھا۔" اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے عبدالکریم کا خط نکال کر اسے دیا تھا۔

"اور ہاں سنو، اپنے عبدالکریم کاکا کو خط لکھو گی نا تو اسے بتا دینا اپنی طلاق کے متعلق۔ وہ تمہارے انیس الحسن کو سب بتا دے گا۔"

"لیکن ابھی......"

اس نے کچھ کہنا چاہا تو نرگس نے بات کاٹی۔

"تم بے فکر رہو...... نرگس کچے کام نہیں کرتی۔ تمہاری طلاق کے پیپرز لے کر ہی مانچسٹر جاؤں گی۔"

اور اسے نرگس پر یقین تھا۔ وہ مسکرا دی اور کھانا کھاتے ہوئے بھی مسکراتی رہی۔ آج ہر چیز اسے اچھی لگ رہی تھی اور اس نے سلطانہ آنٹی اور اختر بانو کے بنائے کھانے کی دل کھول کر تعریف بھی کی تھی۔ اختر بانو اور نرگس اسے چھیڑتی رہیں۔

"کالے دیو سے نجات کا مژدہ کیا ملا ہماری شہزادی کے تو چہرے کے رنگ ہی بدل گئے ہیں۔ ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ آنکھوں میں آسمان کے سارے ستارے اتر آئے ہیں۔"

اختر بانو ایسی ہی باتیں کرتی تھی اور پھر اپنی ہی باتوں پر خوب ہنستی تھی۔

"دیکھو مجھے اپنی شادی پر ضرور بلانا، میں پاکستان آؤں گی۔" نرگس نے کہا تو اختر بانو بول پڑی۔

"اور مجھے تو ویسے بھی پاکستان جانا ہے، تمہاری شادی پر ہی پاکستان دیکھ لوں گی۔"

نرگس چلی گئی تو اس نے اطمینان سے اپنے کمرے میں آ کر عبدالکریم کا خط کھولا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"بٹیا! بہت دن ہو گئے، تمہیں خط بھجوایا تھا لیکن تم نے جواب نہیں دیا۔ اللہ کرے تم خیریت سے ہو۔ فیروز کے ابا کو کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی تمہارا خط آئے، ظفر جنرل اسٹور پر فون کر کے پیغام بھیج دیں۔ تمہیں بتایا تھا نا شاید کہ ظفر ادھر قصور کا ہی رہنے والا ہے اور فیروز کے ابا سے کافی اچھی دعا سلام ہے۔ باہر نکلتا تھا تو روز ظفر سے پوچھتا تھا۔ آج قصور آیا ہوں تو فیروز کے چھوٹے بھائی سے خط لکھوا رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں ظفر سے بات کر کے تمہیں ظفر جنرل اسٹور کا ہی پتا لکھوا دوں۔ خط پہنچتے ہی مجھے مل جایا کرے گا۔

حیدر بھیا کافی ٹھیک ہیں۔ پتا نہیں دن بھر کیا حساب کتاب کرتے اور لکھتے رہتے ہیں اور کبھی یک دم رونے لگتے ہیں اور آپ کو آوازیں دیتے ہیں۔ رب سوہنا اچھا ہی کرے گا بس آپ ایک بار واپس آ جاؤ تو ہم آستانہ منزل سے چلے جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا بٹیا؟"

عبدالکریم نے اس کے دل کی بات کہی تھی، اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ادھر حسن پیلس کو سجایا جا رہا ہے، لائٹنگ ہو رہی ہے۔ میں ایک بار ادھر گیا تھا، گھر میں کوئی نہ تھا سب شاپنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اماں جان بھی آرام کر رہی تھیں، واپس آیا تو گیٹ پر صبا بی بی مل گئیں۔

کہنے لگیں بڑے حسن پیلس کے چکر لگاتے ہو کیا کسی کی پیغام رسانی کرتے ہو۔ یہ صبا بی بی بھی عجیب ہی باتیں کرتی ہیں، کیا کہنا بتا دیا کہ یوں ہی چلا گیا تھا۔ روشنیاں دیکھ کر کیا شادی ہے کسی کی یا کوئی

اور فنکشن اور صبا بی بی نے کہا کہ حیرت ہے تمہیں نہیں پتا۔ انیس الحسن کی شادی ہے، کسی کرنل جنرل کی بیٹی ہے۔ بس بیٹا! پتا نہیں کیوں میرا دل تو جیسے ڈوب سا گیا۔ یہ دل بھی بڑا خوش فہم ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا خوش فہمیاں پال لیتا ہے حالانکہ ہم تو اپنی کشتیاں پہلے ہی جلا چکے تھے۔ پھر بھی سارا دن گھر سے باہر نہیں نکلا اور آج صبح ہی قصور آ گیا ہوں۔ شام سے پہلے چلا جاؤں گا۔

حیدر بھیا کا خیال نہ ہو تو وہ چار روز رک جاؤں لیکن کیا کروں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ جتنی دیر ادھر رہتا ہوں ان کے لیے بے چین ہی رہتا ہوں حالانکہ رشیدہ بوا کو تاکید کر کے آتا ہوں کہ ان کے کھانے کا خیال رکھے۔"

وہ کتنی ہی دیر خط ہاتھوں میں لیے ساکت بیٹھی رہی۔ اس کی خوشی اور مسرت کے لمحے کتنے مختصر تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اندر جو پھول کھلے تھے، اب مرجھا گئے تھے اور اسے انیس الحسن سے کوئی شکوہ نہیں تھا اور نہ ہی اس کی محبت پر شک تھا۔ یقیناً وہ بھی اس کی طرح اپنے ماں باپ کے سامنے مجبور ہو گیا ہو گا اور پھر وہ کس کے لیے انتظار کرتا۔ وہ تو پہلے ہی حسنین سے نکاح کر کے لندن آ چکی تھی۔

آج وہ روئی نہیں تھی بس اس کے اندر جیسے برف گرتی رہی اور وہ خشک آنکھوں کے ساتھ عبد الکریم کا خط پھر سے پڑھنے لگی اور جب وہ تیسری بار خط پڑھ رہی تھی تو یہ برف ہولے ہولے پگھلنے لگی تھی۔

اسے پاکستان جانا تھا۔ اپنے چاچی کے لیے جو اسے بلاتے تھے اور اس کے لیے روتے تھے۔ اس نے ٹیبل سے لیٹر پیڈ اور قلم اٹھایا اور عبدالکریم کو خط لکھنے لگی تاکہ وہ کچھ زیور فروخت کر کے قصور میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیں۔ اس نے عبدالکریم کاکا کو خط تو لکھ دیا تھا لیکن یہ خط بھی پوسٹ نہ کر سکی تھی۔

وہ رات دیر سے سوئی تھی اور صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اختر بانو اس کے جاگنے سے پہلے ہی یونیورسٹی جا چکی تھی۔ اس لیے وہ خط پوسٹ کرنے کے لیے نہیں دے سکی تھی۔ چلو آج دے دوں گی، اس نے سوچا تھا۔ سارا دن وہ اداس اداس سی سلطانہ آنٹی کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کرواتی رہی اور اداسی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ ہر روز تو نہیں لیکن کبھی کبھی وہ بھی اختر بانو کی طرح بہت باتیں کرتی تھیں۔

اپنے ماضی کی
اپنی شان و شوکت کی
حویلیوں کی، اپنی گم شدہ روایات کی

شاید اس طرح اپنے وطن اپنی روایات سے کٹ کر رہنے والے سب ہی لوگ بہت باتونی ہوتے ہیں۔ اپنے ماضی کو یاد کر کے شاید ان کی روح کو سکون ملتا ہو۔

دن بھر کے کاموں سے فارغ ہو کر آج وہ فیملی روم میں سلطانہ آنٹی کے پاس بیٹھنے کے بجائے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی اور اس روز جب وہ پہلی بار حسن پیلس گئی تھی تب سے لے کر اب تک کی ہر بات سوچ لی تھی۔ ایک کے بعد ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آتے رہے تھے اور آنسو اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر تکیہ بھگوتے رہے تھے۔ ان مناظر کو دیکھتے دیکھتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی پھر اس کی آنکھ اختر بانو کے جگانے پر ہی کھلی تھی۔

"اٹھو یار عروج! آج میں نے ریسٹورنٹ سے چھٹی کی ہے، کہیں گھومنے چلتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تو اختر بانو نے بغور اسے دیکھا۔

"تم روتی رہی ہو عروج؟"

"نہیں تو...... بس سر میں درد ہے۔"

وہ اسے انیس الحسن کے متعلق نہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اس نے سوچا تھا وہ پاکستان جا کر انہیں خط لکھ دے گی۔

"اوہ! تم سر درد کی ٹیبلٹ لے لو۔ میں چائے بناتی ہوں تمہارے لیے۔ نرگس کو بھی راستے سے پک کرنا ہے تھوڑی دیر سے نکل جائیں گے، تب تک

www.pklibrary.com

تمہارے سر کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا نرگس بھابی سے تمہاری بات ہوئی۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں آج ایک یونیورسٹی فیلو کے ساتھ ان کی طرف گئی تھی۔ انہوں نے اس روز کہا تھا کہ انہیں اپنا سامان سیل کرنا ہے کیونکہ مانچسٹر میں ان کے شوہر نے فرنشڈ گھر لیا ہے تو میری اس دوست کو کچھ سامان چاہیے تھا، اپنے اپارٹمنٹ کے لیے۔ وہ پہلے کسی کے ساتھ رہتی تھی اب اپنا الگ اپارٹمنٹ لیا ہے۔ کافی چیزیں اس نے پسند کر لی ہیں۔ کل شاید اٹھوا لے...... اور ہاں تمہارا ایک اور خط بھی آیا ہوا تھا، نرگس نے مجھے دیا ہے۔"

اسے کمرے سے نکلتے نکلتے یاد آیا اور اس نے کوٹ کی جیب سے خط نکال کر اسے دیا۔

"اب تم خط پڑھو میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

اختر بانو چلی گئی تو اس نے خط کھولا۔ عبدالکریم نے لکھا تھا۔

"اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں۔ دو تین خط لکھوا چکا ہوں لیکن کسی بھی خط کا آپ نے جواب نہیں دیا۔ دن رات سجدے میں گر گر کر آپ کی خیریت کی دعائیں مانگتا ہوں۔ دو تین دن بعد قصور فون کروا کے پتا کرتا ہوں کہ کوئی خط تو نہیں آیا...... پھر سنا حسنین میاں نے بڑے صاحب کو فون کر کے بتایا میرے منہ میں خاک عروج فاطمہ کسی گورے کے ساتھ بھاگ گئی ہیں۔ کیا کہوں یہاں دن رات نیچے تینوں پورشنوں میں یہی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔

بڑے صاحب سے پوچھا لیکن انہوں نے جھڑک دیا۔ میرے دل کو تو پتنگے لگے ہیں۔ فیروز کو خط لکھوا رہا ہوں کہ تمہارے پتے پر جا کر تمہاری خیریت معلوم کر کے گھر خط لکھے۔ یہی پتا لکھوایا ہے۔

میرا خط ملتے ہی اپنی خیریت کی خبر لکھو۔ یہ خط ظفر بابو سے لکھوا رہا ہوں کہ پتا نہیں کب قصور جانا ہو اور ظفر بابو سے کہا ہے کہ اپنا پتا بھی لکھ دیں، اب تم اسی ظفر بابو کے اسٹور والے پتے پر خط لکھنا۔ مجھے جلدی مل جایا کرے گا۔ حیدر بھیا کو اکیلا چھوڑ کر روز روز قصور بھی تو نہیں جایا جاتا...... دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

صفحے کے ایک طرف بس اتنا ہی لکھا تھا اس نے صفحہ الٹا۔

"یہ خط ظفر سے لکھوایا تھا لیکن تمہارا لندن والا پتا تو قصور میں ہی رہ گیا تھا۔

غضب ہو گیا، کیسے کہوں بٹیا! کس منہ سے بتاؤں کہ...... فیروز کے ابا کا انتقال ہو گیا تھا۔ رشید بوا سے حیدر بھیا کا خیال رکھنے کا کہہ گیا تھا۔ خیال تھا شام تک جنازہ پڑھ کر آ جاؤں گا۔ بڑی کوتاہی ہوئی بٹیا! جنازہ رات دیر سے ہوا۔ فیروز کے چھوٹے بھائی کو کراچی سے آنا تھا اور جنازے کے بعد مجھے کوئی سواری ہی نہیں ملی۔

اگلی صبح منہ اندھیرے ہی نکل آیا تھا۔ حیدر بھیا کہیں نہیں تھے۔ پاگلوں کی طرح ہر جگہ ڈھونڈتا پھرا لیکن وہ کہیں ہوتے تو ملتے نا۔ ہفتہ بھر بعد بڑے صاحب نے اخبار میں ایک لاوارث لاش کی تصویر دکھائی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تصویر میں تو پہچانے نہیں جا رہے تھے لیکن بڑے صاحب نے بتایا کہ وہ مردہ خانے میں جا کر لاش دیکھ آئے تھے۔ لاش گھر لانے کے قابل نہ تھی، ادھر ہی کفن دفن کا انتظام کر دیا تھا۔

ہائے میرے حیدر بھیا......! یہ سب لکھنے سے پہلے میرے اللہ میں مر کیوں نہیں گیا۔ بٹیا مجھے معاف کر دینا۔ میں حیدر بھیا کا خیال نہیں رکھ سکا۔ آپ تو معاف کر دو گی بٹیا! لیکن میں تو کبھی معاف نہ کر سکوں گا خود کو۔ سینے میں جو سانس اٹکی ہے وہ بس آپ کی خیریت کی خبر سننے کے لیے۔ ایک بار خیریت کی خبر مل جائے پھر جی کر کیا کروں گا۔ میرے حیدر بھیا...... میرے شہزادے......

بڑے صاحب نے کہا...... اب حیدر بھیا تو ہیں نہیں۔ قصور جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ قصور آ گیا ہوں لیکن پتا نہیں کیوں یقین نہیں آتا۔ دل کہتا ہے کہ جیسے پہلے مل گئے تھے اب بھی مل جائیں گے۔ لیکن......"

www.pklibrary.com

وہ خط ہاتھوں میں پکڑے ساکت بیٹھی تھی کہ اختر بانو چائے کا کپ لے کر اندر آئی۔ کپ ٹیبل پر رکھ کر اس نے مہلت دینے کے لیے اس کی طرف دیکھا تو چونک پڑی ویران آنکھیں جیسے پتھر کی ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا عروج؟" اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"ہاں...... کیا ہوا؟" عروج نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اس کی نظریں ہاتھ میں پکڑے خط پر پڑیں تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔

"اختر بانو...... میرے چاچی...... میرے چاچی چلے گئے...... میرا کوئی نہیں رہا...... میں اکیلی رہ گئی......" وہ تڑپ تڑپ کر مچل مچل کر رو رہی تھی اور اس کے رونے کی آواز سن کر سلطانہ بانو، نواب زادہ وقار علی، ٹیپو سلطان سب ہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ اسے سنبھال رہے تھے، تسلی دے رہے تھے لیکن اس کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کا کوئی نہیں رہا تھا، وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔

اس کا تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

نہ محبت بچی تھی نہ رشتے۔

کہنے کو تو اس کے سگے ماموں تھے، ممانیاں تھیں، کزنز تھے لیکن وہ جانتی تھی اس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ چاچی کے بعد اب بالکل اکیلی ہے، تنہا۔ اس کا غم بے کراں تھا۔

سب جانتے تھے کہ تسلی کے چند لفظوں سے یہ غم ختم ہونے والا نہیں ہے۔ یہ دل چیر دینے والا دکھ ہے پھر بھی سلطانہ بانو نے اسے گلے لگا کر تسلی دی تھی۔ ٹیپو سلطان اور اختر بانو اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے بیٹھے تھے اور نواب زادہ وقار علی خان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہم ہیں نا عروج فاطمہ! آپ کے اپنے، آپ خود کو اکیلا مت سمجھیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا ناں، آپ سمجھو آپ اپنے ابا میاں کے گھر پر ہو۔ یہ اختر بانو آپ کی بہن، یہ ٹیپو سلطان آپ کا بھائی اور یہ سلطانہ بانو آپ کی آنٹی آج سے آپ کی ماں ہیں۔ حیدر بہت باادب، بہت پیارا بچہ تھا۔ بہت دکھ ہے ہمیں اس کی موت کا، اللہ اس کی مغفرت کرے۔ جتنی بار بھی ملاقات ہوئی، دل اس سے مل کر خوش ہوا۔"

ہولے ہولے اس کا رونا تڑپنا کم ہوا لیکن آنسو تھے جو بہے جاتے تھے اور رکتے نہ تھے۔ اس روز انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اسے اکیلا نہ چھوڑا تھا۔ نرگس کو بھی اختر بانو نے فون کر کے بتا دیا تھا اور وہ شام تک آ گئی تھیں۔ ایک بار پھر وہ ان کے گلے لگ کر چیخ چیخ کر روئی تھی۔

نرگس واپس نہیں گئی تھیں اور رات کو اس کے کمرے میں ہی سوئی تھیں اور سونے سے پہلے دیر تک اسے سمجھاتی رہی تھیں۔

"لیکن میں اب پاکستان جا کر کیا کروں گی نرگس بھابی! وہاں اب میرا کون ہے۔"

"کیوں تمہاری محبت، تمہارا انیس الحسن نہیں ہے وہاں۔"

"عبدالکریم کاکا نے لکھا تھا اس کی شادی ہو گئی ہے۔" وہ بے حد دل گرفتہ اور مایوس تھی۔

"اوہ!" نرگس کچھ دیر خاموش رہی تھیں پھر تسلی کے لیے اس کا بازو تھپتھپایا تھا۔

"شاید وہ بھی تمہاری طرح مجبور ہو گیا ہو گا لیکن وقت بہت بڑا مرہم ہے عروج! سب زخم ہولے ہولے بھر جاتے ہیں۔ ہر اندھیری رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔ تمہاری زندگی کی صبح بھی ضرور ہو گی میری جان! وہ محبت جو تم نے انیس الحسن سے کی اور انیس الحسن نے تم سے کی، وہ محبت ہمیشہ زندہ رہے گی تمہارے دل میں...... انیس الحسن کے یا تمہارے شادی کر لینے سے وہ محبت ختم نہیں ہوئی۔"

نرگس کا اپنا ہی فلسفہ تھا۔

"لیکن زندگی محبت کے سہارے نہیں گزرتی۔ تم پاکستان نہیں جانا چاہتیں تو مت جاؤ۔ اختر بانو کے بابا کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ وہ تمہیں یہاں ہی سیٹل کر دیں گے...... کر سکتے ہیں۔

اپنوں کے بچھڑ جانے کا دکھ اتنی آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ زخموں پر کھرنڈ لگتے لگتے وقت لگتا ہے۔ تمہیں بھی سنبھلنے میں، اس غم کو سہنے میں وقت لگے گا۔ جب سنبھل جاؤ تو پڑھو اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرلو، جاب کرلو، اپنی زندگی جیو۔ زندگی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اسے ضائع مت کرو۔" وہ چپ چاپ نرگس کی باتیں سنتی رہی تھی۔

"اور حسنین کی طرف سے بے فکر ہوجاؤ، اس کا اب تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔ میں مانچسٹر جانے سے پہلے حسنین سے ملوں گی۔"

اور پھر اس نے اپنی بات نبھائی تھی۔ مانچسٹر جانے سے پہلے وہ ایک سادہ پیپر پر لکھوا لائی تھی۔ حسنین نے لکھ دیا تھا کہ "میں اپنی بیوی عروج فاطمہ کو بقائمی ہوش وحواس اپنی مرضی سے طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔"

نرگس نے اسے بتایا تھا کہ اس نے اپنے اس پاکستانی وکیل دوست کے توسط سے تمہاری طلاق کے پیپرز پاکستان بھجوا دیے ہیں۔

"تمہارا دکھ بہت بڑا ہے عروج فاطمہ! میں جانتی ہوں لیکن اس دکھ کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنے کی کوشش کرنا۔ ان شاء اللہ زندگی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر تمہارے لیے پھول تھامے ضرور کھڑی ہوگی۔" نرگس نے جانے سے پہلے اسے تسلی دی تھی۔

اسے سنبھلنے میں بہت وقت لگا تھا لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ سنبھل گئی تھی۔ اس نے عبدالکریم کاکا کو خط نہیں لکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے اب بھی پاکستان نہیں جانا تھا۔ نواب زادہ وقار علی خان نے اس کے لیے اسٹوڈنٹ ویزا حاصل کرلیا تھا اور اس نے ایک ڈپلومہ کورس میں ایڈمیشن بھی لے لیا تھا اور نواب زادہ وقار علی نے اس کے لیے برٹش پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش بھی شروع کردی تھی۔

"میں نے کرنل ولسن سے بات کی ہے۔ تمہارے ابا میاں سے بہت اچھے تعلقات تھے کرنل ولسن کے۔ اس نے اس سلسلے میں پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

وقار علی خان نے اسے بتایا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ کرنل ولسن نے ہر طرح سے مدد کی تھی اور ایک روز اسے برٹش پاسپورٹ مل گیا تھا۔ وہ اب بے خطر یہاں رہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد جاب بھی کرلی تھی۔ کچھ عرصہ لندن میں جاب کرنے کے بعد وہ مانچسٹر چلی گئی تھی۔ یہاں اسے پہلے سے اچھی اور بہتر جاب ملی تھی۔ مانچسٹر میں اس کی رہائش کا بندوبست نرگس نے دو پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ کردیا تھا جو اسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتی تھیں جس میں نرگس رہتی تھیں۔

وہ ایک ماہ بعد ویک اینڈ پر لندن جاتی تھی، وہ سب بے حد خوش ہوتے تھے۔ سلطانہ بانو اس کے آنے پر اس کے پسندیدہ کھانے بناتی تھیں۔ وہ اب اس گھر کا ایک فرد تھی۔ ٹیپو سلطان، اختر بانو سب ہی اس کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔

☆☆☆

زندگی کا ایک باب ختم ہوگیا تھا اور ایک نیا باب شروع ہوگیا تھا۔ اس نے جینا سیکھ لیا تھا لیکن کیا واقعی وہ جی رہی تھی یا محض زندگی گزار رہی تھی۔ اس لیے کہ ابھی سانسوں کا سلسلہ چل رہا تھا اور جب تک باغ رضواں میں اس کی زندگی کے درخت کا پتا ٹوٹ نہیں جاتا اسے یوں ہی ایسی ہی زندگی گزارنی تھی۔ جس میں نہ کوئی رنگ تھا، نہ خوشی، نہ کوئی روشنی، نہ کوئی امید۔ بس بے مقصد جیے جاؤ اور بے مقصد زندگی گزارنا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ کوئی اس سے پوچھتا۔

دن ایک روبوٹ کی طرح کام کرتے ہوئے گزر جاتا۔ لیکن رات کو بستر پر لیٹتے ہی جیسے وہ ماضی میں چلی جاتی، کبھی چاچی کا دکھ تکیہ بھگو دیتا اور کبھی انیس الحسن کی سرگوشیاں اندر پھول کھلا دیتیں لیکن صبح پھر وہی معمولات

زندگی بار معلوم ہوتی...... ایسی زندگی جس میں چاچی نہیں تھے۔ انیس الحسن نہیں تھا گزارنا کتنا مشکل

www.pklibrary.com

تھا پھر بھی اس نے زندگی کے دس سال ایسے ہی گزار دیے تھے۔ اس دوران اختر بانو کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ صاحب زادہ مزمل حسین سے۔ مزمل اختر بانو کا یونیورسٹی فیلو تھا، اس نے اختر بانو سے پسندیدگی کا اظہار کیا تو اختر بانو نے اسے گھر کا پتا دے دیا کہ سیدھا راستہ وہ ہے۔ یوں اختر بانو کی صاحب زادہ مزمل سے شادی ہو گئی۔

مزمل کی فیملی کراچی میں تھی اور اختر بانو بہت خوش تھی کہ اس کا سسرال پاکستان میں ہے اور سلطانہ بانو خوش تھیں کہ خاندانی لوگوں میں شادی ہوئی۔ شادی لندن میں ہی ہوئی تھی۔ مزمل کی والدہ، والد اور ایک بھائی پاکستان سے شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔

ولیمے کی تقریب پاکستان میں ہوئی تھی۔ اختر بانو اور مزمل صرف دس دن پاکستان میں رہے تھے لیکن وہ پاکستان کی اور کراچی کی اور وہاں کے لوگوں کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھی۔

''ہائے کتنے پیارے لوگ ہیں تمہارے پاکستان کے، کتنی محبت کرنے والے حسین لوگ۔''

اور وہ اختر بانو کی باتوں پر مسکرا دیتی۔ اسے پاکستان سے غائبانہ عشق تھا اور اللہ نے اس کا نصیب پاکستان میں ہی جوڑ دیا تھا۔

اختر بانو جب بھی میکے آتی اس سے ضرور کہتی کہ وہ بھی آ جائے لیکن وہ اب تھکنے لگی تھی۔ مانچسٹر سے لندن تک کا پانچ چھ گھنٹے کا سفر بھی اسے تھکا دیتا اور وہ دو دو تین مہینے نہ جا پاتی تھی۔ سلطانہ بانو کے فون آتے، ٹیپو سلطان ناراض ہو جاتا۔ وقار علی فکر مند ہو جاتے تو وہ کسی ویک اینڈ پر چلی جاتی۔

''شاید بے مقصد زندگی آدمی کو یوں ہی تھکا دیتی ہے۔'' وہ سوچتی۔

''تو مقصد ڈھونڈو نا یار، کوئی اچھا سا بندہ دیکھ کر شادی کر لو۔ زندگی کو خود ہی مقصد مل جائے گا۔''

ایک ہی بلڈنگ میں ہونے کی وجہ سے نرگس وقت بے وقت اس کے پاس آ جاتی تھیں۔ اسے نرگس بھابی کا بڑا آسرا تھا لیکن آج کل وہ بالکل اختر بانو کی طرح باتیں کرنے لگی تھیں۔

''میرے دل میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے نرگس بھابی!''

''ارے جان! تم شادی تو کرو، گنجائش خود ہی نکل آئے گی۔''

''نہیں، پلیز نہیں...... حسنین سے نکاح میری مجبوری تھی لیکن اب ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ میں انیس الحسن کی محبت اور اس کی یادوں کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔''

''لیکن صرف یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزرتی میری جان! زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اور میں چاہتی ہوں اس وقت سے پہلے ہی تمہیں کوئی مضبوط سہارا مل جائے۔ میں اور مسعود ہمیشہ یہاں نہیں رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کل کو ہم اپنے وطن لوٹ جائیں۔ اختر بانو کی شادی ہو چکی، کل کو دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔ انکل وقار اور آنٹی کب تک بیٹھیں گے۔ ایک روز تم اکیلی ہو جاؤ گی، وہ وقت آنے سے پہلے ہی اپنے لیے کچھ سوچ لو بجو! تم ابھی صرف تیس سال کی ہو...... ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مسعود کے دوست کا چھوٹا بھائی ہے، تمہارا ہی ہم عمر ہوگا۔''

اور وہ نرگس بھابی کی باتوں سے گھبرا کر پورے دو ہفتے کی چھٹی لے کر لندن آ گئی تھی۔ سب ہی اس کی چھٹی کا سن کر خوش ہوئے تھے کہ اس بار وہ پورے تین ماہ بعد آئی تھی۔ ٹیپو سلطان نے تو فوراً ہی اختر بانو کو بھی فون کھڑکا ڈالا تھا کہ وہ بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے صاحب بہادر کو اکیلا چھوڑ کر آ جائے لیکن اختر بانو کی رشتے کی ایک نند پاکستان سے آئی ہوئی تھیں، اس لیے وہ کچھ مصروف تھی اور اس نے چند دنوں بعد آنے کا کہا تھا۔ سلطانہ بانو کی طبیعت کچھ خراب تھی، بی پی بہت ہائی رہنے لگا تھا ان کا۔

''بس جب تک میں یہاں ہوں آپ نے کچھ

www.pklibrary.com

نہیں کرنا اور کچن میں بھی جھانکنا تک نہیں ہے۔"

اس نے پورا گھر سنبھال لیا تھا۔

اور سلطانہ بانو اسے کام کرتے ہوئے بہت گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچتیں کہ اگر اظہار مان جائے تو بھلا عروج فاطمہ سے بڑھ کر بہتر لڑکی انہیں کہاں مل سکتی ہے لیکن اظہار کی تو پڑھائی ہی ختم نہیں ہوتی۔ یہ کورس، وہ کورس، فلاں ڈگری۔ کیا بوڑھے ہو کر سہرا باندھے گا۔ آج ہی بات کروں گی اس سے۔"

اور اظہار جو ان دنوں سلطانہ بانو کی طبیعت کی خرابی کا سن کر دو ہفتے کی چھٹی لے کر آئے ہوئے تھے وہ بھی اسے پورے گھر کو سنبھالتے ماما کا، ڈیڈ کا، ٹیپو سلطان کا خیال رکھتے دیکھ کر سوچتے کہ زندگی کے ساتھی کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا، وہ مکمل تو اس پر پوری نہیں اتری تھی تاہم وہ ایک بہترین شریک سفر ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ سلطانہ بانو کے کمرے کی طرف آئے تھے کہ وہ ان سے پوچھ سکیں کہ اختر بانو کب آ رہی ہیں اتنا تو وہ جانتے تھے کہ آج کل میں ہی سلطانہ بانو ان کی پاکستان سے آنے والی نند کی دعوت کرنا چاہتی ہیں جو اپنے میڈیکل چیک اپ کے لیے لندن آئی ہوئی تھیں۔

اظہار علی خان' سلطانہ بانو کے ادھ کھلے دروازے کے سامنے ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ سلطانہ بانو کے بیڈ کے پاس کرسی بچھائے بیٹھی ان کا بازو دبا رہی تھی، اس کی پشت دروازے کی طرف تھی اور سیاہ گھنیرے بال پشت پر بکھرے تھے۔ بے اختیار ان ریشمی زلفوں کو چھو لینے کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوئی تو لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"اماں جان! میں شادی نہیں کر سکتی۔"

اس کی آواز سن کر وہ ارادی طور پر رک گئے تھے شاید سلطانہ بانو اور اس کے درمیان شادی کے موضوع پر ہی گفتگو ہو رہی تھی۔

"تمہیں اتنی پہاڑ سی زندگی کیسے گزارو گی؟"

سلطانہ بانو کے لہجے میں تشویش تھی۔

"گزر جائے گی اماں جان! آپ ہیں، اختر بانو ہیں۔ نرگس بھابی ہیں نا۔"

"لیکن بیٹی!" سلطانہ بانو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے ان کی بات کاٹ دی۔

"میں کسی کے ساتھ بد دیانتی اور بے ایمانی نہیں کر سکتی۔ انیس الحسن کا انتخاب میرے لیے آغا جان نے کیا تھا، میں اس کا خیال دل سے نہیں نکال سکتی اور کسی اور کا خیال دل میں چھپا کر کسی دوسرے کا گھر بسانا کیا بے ایمانی نہیں ہے اماں جان! میں کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی اور میں بے وفائی بھی نہیں کر سکتی۔"

اس نے بہت سوچ کر بہت احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کیا تھا کہ وہ سلطانہ بانو سے صاف صاف یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ انیس الحسن کی محبت تو آج بھی روز اول کی طرح اس کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔

ایسی وفا، ایسی محبت......

انہوں نے دل ہی دل میں عروج فاطمہ کو سراہا اور واپس جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ سلطانہ بانو کی نظر ان پر پڑ گئی۔

"ارے میاں! کہاں چلے ہو؟"

"کہیں نہیں اماں جان! کچن میں آیا تھا پانی پینے۔"

"تو میاں! اپنے کمرے میں جاتے ہوئے ذرا اسٹڈی میں بھی جھانک کر اپنے باوا جان کو یاد دلا دینا کہ اختر بانو، مزمل اور بانو کی نند آج ڈنر پر آ رہے ہیں۔ کہیں دوستوں کی طرف ہی نہ نکل جائیں، دس بار ایک بات بتانی پڑتی ہے اور میاں! تم بھی گھر پر ہی رہنا۔"

"جی بہتر۔" انہوں نے سر اٹھا کر سلطانہ بانو کی طرف دیکھا تو نظر عروج فاطمہ پر پڑی جو مڑ کر انہیں دیکھ رہی تھی اور اس کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی اور اس لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ کتنی بھلی لگتی ہے۔ انہیں احساس زیاں سا ہوا۔

www.pklibrary.com

اور ڈنر پر صاحب زادی یاسمین نے کھانا سرو کرتی عروج فاطمہ کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ پتا نہیں انہیں کیوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں؟ یاد نہیں آ رہا تھا تب وہ بے اختیار ہی کہہ بیٹھی تھیں۔

''ایسا لگتا ہے آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے، لیکن کہاں یاد نہیں آ رہا۔ کیا آپ بھی پاکستان گئی ہیں؟''

''جی، میں پاکستانی ہی ہوں۔ یہاں آئے ہوئے تو مجھے تقریباً دس ساڑھے دس سال ہوئے ہیں۔''

عروج کو بھی صاحب زادی یاسمین کا نام سنا سنا سا لگا تھا جب اختر بانو نے تعارف کروایا تھا کہ یہ مزمل کی ماموں زاد بہن ہیں صاحب زادی یاسمین اور اتفاق ملاحظہ ہو کہ ان کے والد نواب علی رضا بھی ہمارے ڈیڈ کے دوست نکل آئے تو ثابت ہوا کہ دنیا گول ہے۔

''تو پھر ضرور آپ کا تعلق لاہور یا کراچی سے ہوگا کہ لاہور تو میرا گھر ہے اور کراچی عزیزوں کے ہاں جانا لگا رہتا ہے تو یقیناً ان ہی دو شہروں میں کہیں دیکھا ہوگا۔''

''جی، میں لاہور میں ہی رہتی تھی۔'' عروج نے کبابوں کی ڈش ان کی طرف بڑھائی۔ ''یہ کباب تو لیں۔''

''تھینکس۔'' صاحب زادی یاسمین نے کباب اپنی پلیٹ میں رکھا اور ان کی نظریں عروج فاطمہ کی نظروں سے ملیں جو مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کھور سیاہ آنکھیں جن میں اداسی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ اداس سحر طاری کرتی آنکھیں کہاں دیکھی تھیں۔ ان کے ذہن میں جیسے کلک ہوا تھا۔

''آغا منزل...... ہاں آغا منزل...... سونیا اور شنیا کی شادی میں دیکھا تھا انہوں نے اسے اور ثقلین سے شادی کے بعد کتنی ہی بار انہوں نے ثقلین سے اس کے متعلق پوچھا تھا کہ ان کی اماں جان نے انہیں بہت تاکید کی تھی کہ ڈپٹی صاحب کی بیٹی کا بہت خیال رکھنا۔ تقسیم نے بہت گھاؤ لگائے ہیں اسے، بہت افسردہ اور دکھی نظر آتی ہے لیکن ثقلین نے اسے بتایا کہ وہ شادی کے بعد لندن چلی گئی ہے۔

اور پھر وہ زیادہ عرصہ آغا منزل میں رہی بھی نہیں تھیں بلکہ اپنے بنگلے میں جو ان کے بابا جان نے انہیں گلبرگ میں لے کر دیا تھا منتقل ہوگئی تھیں۔ لیکن شادی کے دوسرے سال جب وہ ثقلین کے ساتھ لندن آئی تھیں تو حسنین نے انہیں اور ہی کہانی سنائی تھی اور اب یہاں......

انہوں نے ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ اسے پہچان چکی ہیں تاہم جب وہ قہوہ بنانے کچن میں گئی تھی تو اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے اختیار پوچھ بیٹھی تھیں۔

عروج فاطمہ سے آپ کی کوئی قریبی رشتہ داری ہے کیا؟''

''میرے دوست کی صاحب زادی ہیں۔ وہ میرے بہت اچھے، بہت عزیز دوست تھے احمد سلطان۔ برصغیر کی تقسیم کے دوران پورا خاندان مارا گیا تھا اور یہ ہمیں اختر بانو سے بڑھ کر عزیز ہیں۔''

نواب زادہ وقار علی خان نے بات ختم کر دی تھی۔

لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی صاحب زادی یاسمین نے پاکستان واپس جاتے ہی ثقلین سے ذکر کیا تھا اور ثقلین بے چین ہو گیا تھا۔

''پلیز ابھی اپنی بھابی جان کو فون کر کے اس کا فون نمبر اور پتا لے کر دیں۔''

اور وہ چھٹیاں گزار کر واپس مانچسٹر آئی ہی تھی کہ ثقلین کا فون سن کر حیران رہ گئی۔

''آپ...... سوری مجھے کسی سے بات نہیں کرنی...... کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں میرا آپ سے۔''

''تم جو بھی کہو، تمہیں کہنے کا حق ہے عروج! لیکن...... پلیز عروج! فون بند مت کرنا۔ ہم سب

www.pklibrary.com

بہت شرمندہ ہیں۔ بابا جان بہت تکلیف میں ہیں، ایک بار ان سے بات کرلو۔"

اور اس نے فون بند کردیا تھا۔ اب ان کی شرمندگی سے اس کے کھوئے رشتے واپس نہیں آسکتے تھے لیکن ان چھ ماہ میں داجی کے اتنے فون آئے کہ وہ پریشان ہوگئی تھی۔

"میں نے آپ کو معاف کیا داجی! ہر اس زیادتی کے لیے جو آپ نے مجھ سے کی۔ اللہ بھی آپ کو معاف کرے۔"

"اللہ ہی نے تو معاف نہیں کیا۔" وہ سسکے تھے۔

"ایک بار آجاؤ، میں آسکتا تو خود آجاتا۔"

اور وہ ہار گئی تھی۔ نواب وقار علی نے بھی کہا تھا۔

"معاف کرنے والوں کو اللہ بھی پسند کرتا ہے۔ تم بھی معاف کردو انہیں۔"

اور سب ہی اسے نم آنکھوں کے ساتھ ایئر پورٹ پر چھوڑنے آئے تھے۔ وہ یونیورسٹی کی طالب [illegible] آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

"ہمیں بھول نہیں جانا عروج آپی۔"

اور کیا وہ ان محبتوں کا قرض بھی ادا کرسکے گی۔ اختر بانو کے گلے لگتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ "شاید نہیں۔"

"جلدی آنا۔" نرگس بھابی تو صبح سے رو رہی تھیں اور اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکتے ہوئے انہوں نے اسے الوداع کیا تھا۔

ثقلین اسے لینے ایئر پورٹ پر آیا ہوا تھا۔ گیارہ سالوں میں اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہاں پہلے کے مقابلے میں وہ کچھ زیادہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

فلائٹ دو گھنٹے لیٹ تھی اور رات کا ایک بج رہا تھا جب وہ آغا منزل میں داخل ہوئے تھے۔ ثقلین سیدھا اسے پورشن میں لے کر آیا تھا۔

صبا وہاں بیٹھی تھی۔ یہ وہ صبا تو نہیں تھی۔ شوخ سی بہت مغرور سی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ رنگت بے حد زرد تھی۔ اپنے کالج کی بیوٹی کوئین کہلانے والی صبا ریحان گیارہ سالوں میں اتنی بدل جائے گی اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"بابا جان صبح سے ہیجان میں مبتلا تھے۔ بہت طبیعت خراب ہورہی تھی ان کی، گھنٹہ بھر پہلے ہی میں نے نیند کا انجکشن لگایا ہے انہیں۔" اس کے گلے لگتے ہوئے اس نے بتایا۔

"اب صبح تک سوتے رہیں گے وہ تو ان سے تمہاری صبح ہی ملاقات ہوسکے گی۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گئی تھی۔ اسے سب کچھ بہت اجنبی لگ رہا تھا، جب وہ یہاں رہتی تھی تب بھی داجی والے پورشن میں بہت کم آتی تھی۔

"میں کھانا لگاتی ہوں، کھا کر تم بھی آرام کرلو۔ باقی سب سے بھی صبح ہی ملاقات ہوسکے گی۔"

"کھانا تو میں نے جہاز میں کھالیا تھا۔ کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا بس ایک کپ اسٹرانگ سی چائے اگر مل جائے تو......"

"ٹھیک ہے۔" صبا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گا صبا! میرے لیے بھی چائے بنا دینا۔" ثقلین نے بھی کھانے سے منع کردیا تھا۔

"عروج تم چاہو تو جا کر کمرے میں آرام کرو۔ میں وہاں ہی چائے لے آتی ہوں۔ میں نے اپنا اور مونا والا کمرا تمہارے لیے......"

"نہیں، اگر اوپر میرا اپنا کمرہ خالی ہے تو میں وہاں ہی رہوں گی۔"

اس نے صبا کی بات کاٹی تو صبا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ثقلین نے اشارے سے منع کردیا۔

"اوکے، چائے پی لو تو میں تمہیں اوپر چھوڑ آتا ہوں۔"

اور پھر چائے پی کر ثقلین اسے اوپر چھوڑنے آیا تھا۔

"کیا آپ اب یہاں ہی رہتے ہیں، میں نے تو سنا تھا شادی کے بعد آپ صاحب زادی یاسمین

www.pdklibrary.com

کے گلبرگ والے بنگلے میں چلے گئے تھے۔"

"میں یہاں رہنا تو چاہتا ہوں لیکن یاسمین کا دل گھبراتا ہے، یہاں۔ آج کل وہ کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی گئی ہوئی ہیں تو میں ادھر آیا ہوں، بہت سی باتیں کرنے والی، سننے والی ہیں تو ان شاء اللہ صبح کریں گے۔"

اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور چلا گیا تھا۔ یک دم ہی بالکونی کی ریلنگ پر دو کبوتر آ کر بیٹھے تو ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے چونک کر اس نے سامنے دیکھا۔ دھوپ اب ستونوں سے لپٹی نیچے بالکونی کے فرش پر بکھری تھی۔

وہ کتنی دیر ہو گئی تھی اسے شاید نیچے داجی جاگ گئے ہوں اور اس کا انتظار کر رہے ہوں۔

وہ یک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی اور کمرے کی طرف مڑتے ہوئے اس کی نظریں نیچے لان پر پڑی تھیں۔ اس کے کمرے کی بالکونی سے لان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور اس کی نظریں جیسے وہاں ہی ساکت ہو گئیں۔

"نہیں......" اس نے آنکھیں مل کر دیکھا، کیا یہ اس کا الوژن ہے۔ نہیں یہ واہمہ تو نہیں تھا۔ یہ حیدر سلطان ہی تھے، ہاتھ پیچھے باندھے، ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے۔

"چا...... جی...... چاجی......"

وہ پاگلوں کی طرح بالکونی سے کمرے اور کمرے سے سیڑھیوں کی طرف بھاگی تھی اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتی تیزی سے لاؤنج کا دروازہ کھولتی برآمدے کی سیڑھیاں پھلانگتی لان میں آئی تھی اور دوڑ کر حیدر سلطان سے لپٹ گئی تھی۔ دونوں بازو ان کی کمر کے گرد حائل کیے وہ رو رہی تھی اور بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ آپ ہیں نا...... چاجی آپ ہی ہیں نا...... میرے اپنے چاجی۔"

"ہاں یہ ہم ہیں، لیکن تم کون ہو؟" وہ اسے اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں آپ کی ہنو ہوں...... آپ کی گڑیا...... آپ کی عروج فاطمہ......"

"تم کہاں چلی گئی تھیں ہنو؟" وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے پوچھ رہے تھے۔

"تم چلی گئی تھیں نا تو بہت ظلم ہوا ہمارے ساتھ۔ ظالموں نے کند چھری سے ذبح کر ڈالا ہمیں۔ دو ٹکڑے کر دیا...... بہت ظلم ہوا ہنو...... میرا وطن، میرا پاکستان دولخت ہو گیا...... میرا پاکستان......"

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے تھے اور ان کے رونے کی آواز سن کر عبدالکریم اپنے کوارٹر سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"حیدر بھیا...... حیدر بھیا...... میں صدقے جاؤں کچھ نہیں ہوا۔ کس کی جرأت ہے کہ ہمارے پاکستان کو دولخت کر دے۔" اس نے ان کے گرد بازو حائل کر کے انہیں اپنے ساتھ لگایا تھا۔

"سچ کہہ رہے ہو نا عبدالکریم کاکا؟"

اب وہ اس کی طرف پشت کیے عبدالکریم کے گلے لگے رو رہے تھے۔

"ہاں حیدر بھیا! بالکل سچ۔"

"تو پھر یہ میرے کانوں میں کون سرگوشیاں کرتا ہے کہ تمہارا پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ تمہارا مشرقی پاکستان الگ ہو گیا۔"

"آپ کا وہم ہے بھیا۔"

عبدالکریم نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے تو وہ ایک بار پھر دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ٹہلنے لگے تھے اور وہ عبدالکریم کو اور انہیں دیکھتے ہوئے آنسو بہاتی تھی۔

عبدالکریم نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

"اتنی دیر لگا دی بٹیا! کتنا ڈھونڈا آپ کو فیروز نے۔ کئی بار اس پتے پر گیا، لیکن جو لوگ وہاں رہتے تھے انہیں آپ کی خبر نہ تھی۔"

"آپ نے جو لکھا تھا کریم کاکا کہ چاجی...... تو پھر میں آ کر کیا کرتی، کس لیے آتی۔"

"مجھے کیا پتا تھا بٹیا! بڑے صاحب اتنا بڑا

www.pklibrary.com

جھوٹ بولیں گے۔ حیدر بھیا کو کسی پاگل خانے میں ڈال کر مجھے کسی لاوارث لاش کی تصویر دکھا دیں گے۔ ہائے کیسا تڑپا تھا میں حیدر بھیا اور آپ کے لیے۔ آٹھ سالوں میں بوڑھا ہو گیا تھا میں۔ دن رات سجدے میں گر کر آپ کی سلامتی کی دعا میں کرتا تھا اور تین سال پہلے جب بڑے صاحب نے فون کیا ادھر قصور تو اس وقت بھی میں رو رو کر اللہ سے دعائیں کر رہا تھا۔ فیروز اپنی شادی کے لیے پاکستان آیا تھا تو گھر میں فون لگوا دیا تھا اور میں نے بڑے صاحب کو نمبر لکھوا دیا تھا کہ بٹیا جب بھی آئیں مجھے بلوا لیجیے گا اور بڑے صاحب نے کہا۔

''عبدالکریم آ جاؤ۔'' اور میں تو جیسے اڑتا ہوا پہنچا تھا کہ بٹیا آ گئی ہیں، اللہ نے میری دعائیں سن لیں۔

یہاں آیا تو حیدر بھیا کو دیکھا۔ آغا جان کے کمرے میں ان کے بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ اور بڑے صاحب پاس کھڑے روتے تھے

''عبدالکریم! اپنے حیدر بھیا سے کہو ہمیں معاف کر دیں۔ ہم سب کو معاف کر دیں۔ اپنے بھیا سے ہماری سفارش کر دو عبدالکریم۔''

اور میں تو کبھی بھیا کے ہاتھ چومتا، کبھی پیشانی۔''

عبدالکریم بتا رہا تھا اور وہ آنسو بہاتی سن رہی تھی۔

''بڑے صاحب پر پہلے تو بہت غصہ آیا، کتنا ظلم کمایا انہوں نے لیکن پھر...... آپ نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا تھا اور اللہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ آپ اور حیدر بھیا آغا منزل سے کیا نکلے آغا منزل تو جیسے......''

''کیا ہوا...... یہاں سب ٹھیک تو ہیں نا۔ دا جی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے بے چینی سے عبدالکریم کی بات کاٹی۔

''کیا بتاؤں بٹیا! کیا کچھ نہیں ہوا یہاں، ان گیارہ سالوں میں۔ صبا بی بی کو شادی کے دو سال بعد ہی طلاق ہو گئی کہ سسرال والے کہتے تھے بدزبان اور ناشکری ہے۔ سونا بی بی کے شوہر ہر تیسرے چوتھے مہینے مار پیٹ کر کسی مطالبے کے ساتھ گھر سے نکال دیتے ہیں اور صاحب اس کے مطالبے پورے کر دیتے ہیں کہ بیٹی کا گھر بسا رہے۔ حسنین بھیا کو ان کی گوری میم نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ جو کچھ تھا ان کے پاس سب چھین لیا۔ وہ نیوجرسی چلے گئے تھے اور وہاں کسی حادثے میں دونوں ٹانگیں چلی گئیں۔ ثقلین بھیا گئے تھے ان کے پاس لیکن انہوں نے کہا کہ وہ پاکستان نہیں آئیں گے کہ یہاں علاج کی سہولتیں ہیں۔ اب تو تین چار سالوں سے کوئی خیر خبر نہیں، پتا نہیں زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ ثقلین بھیا کی اولاد ہی نہیں اور بیگم صاحبہ کو اولاد کا غم کھا گیا۔ ایک رات ایسی سوئیں کہ پھر اٹھی ہی نہیں۔''

''چچی جان!'' اس کے آنسو پھر بہہ نکلے تھے۔

''اور...... اور کاظم بھیا نے ادھر کراچی میں کاغذ کا کارخانہ لگایا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ ادھر ہی رہتے تھے، الیکشن میں کسی پارٹی والوں نے سب کو مار ڈالا۔ سونیا بی بی کاظم بھیا اور دونوں بچے۔''

''نہیں۔'' اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

''آپ کا صبر پڑ گیا بٹیا!'' عبدالکریم بھی رو رہا تھا۔

''نہیں عبدالکریم کا کا میں نے تو کبھی کسی کو بددعا نہیں دی، کبھی ایسا نہیں چاہا۔''

وہ رو رہی تھی، تب ہی حیدر سلطان نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''تم کیوں روتی ہو۔ یہ عبدالکریم ہے نا یہ کہتا ہے سب جھوٹ ہے۔ یہ کہتا ہے کوئی ہمارا دوسرا بازو نہیں کاٹ سکتا۔ یہ مجھے لے کر جائے گا سنہرے دیس میں تم بھی چلنا...... چلو گی نا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''بولو پاکستان...... زندہ باد۔'' اب وہ ہاتھ بلند کرتے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تیز تیز چل

www.pklibrary.com

رہے تھے۔
''یہ چاچی کی حالت اب بھی ایسی ہی ہے جیسی تب تھی، جب میں گئی تھی۔'' اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ارے نہیں بٹیا! تین سال پہلے تک جب میں آیا تو بہت بری حالت تھی۔ بھیا کا حال دیکھا نہیں جاتا تھا، بڑے صاحب نے بہت علاج کروایا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورے کیے۔ گیلانی صاحب کا بیٹا باہر سے پڑھ کر آیا ہے، وہ علاج کر رہا ہے اب۔ بڑے صاحب خود ہر مہینے میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی بالکل نارمل لوگوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ وحید بھیا، سعید بھیا سے گپ شپ لگاتے ہیں۔ پچھلی بہت ساری باتیں بھول گئے ہیں لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بات ایسی دماغ میں بیٹھ گئی ہے کہ کبھی بھی آدھی رات کو اٹھ کر اونچا اونچا رونے لگتے ہیں کہ ظالموں نے میرا ملک دو ٹکڑے کر دیا۔ سن اکہتر میں تو پاگل خانے میں ہی تھے، جب یہ حادثہ ہوا بس وہاں ہی کہیں سن کر بات دماغ میں بیٹھ گئی ہے۔''
''اور عبدالکریم کاکا.....'' اس نے لان کی باڑ سے ادھر حسن پیلس کے نظر آنے والے حصے کی طرف دیکھا۔
''ادھر حسن پیلس میں کیا اب کوئی نہیں رہتا۔ بالکل ویران اور اجاڑ سا لگ رہا ہے۔''
''بس ایک چوکیدار ہوتا ہے ادھر۔ شیر دل تو اللہ کو پیارا ہو گیا دو سال پہلے۔ حسن صاحب تو ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ کسی سفارت خانے میں افسر بن کر گئے تھے۔ اماں جی کو زہرا لے گئی تھیں ساتھ۔ دبیر بھیا تو پہلے ہی لندن میں تھے۔ بس جب مکین نہ ہوں تو گھر ڈھے کر ڈھیریاں ہو جاتے ہیں بٹیا۔ اب تو حسن صاحب اسلام آباد میں ہیں۔ اماں جی بھی ان کے ساتھ ہی ہیں۔ انس بھیا آتے ہیں سال چھ مہینے بعد تو مجھ سے بھی ضرور ملتے ہیں اور آپ کا پوچھتے ہیں کہ.....''
تب ہی دروازہ کھول کر روشن آرا نے برآمدے میں آ کر آواز دی تھی۔
''عروج یہ'' اور عبدالکریم کو اپنی بات ادھوری ہی چھوڑنی پڑی تھی۔ عروج نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ستا ہوا چہرہ، سوجی ہوئی آنکھیں جیسے رو کر آئی ہوں۔
''روشن مامی۔'' وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔
''یہ.....عبدالکریم کاکا کیا کہہ رہے ہیں کہ کاظم بھائی.....؟'' اور روشن آرا بھی اسے گلے سے لگائے رونے لگی تھیں۔
''میرا کاظم چلا گیا۔ سونی چلی گئی عروج! میرے بچے..... سب کاظم..... چندا..... گڈو..... سب کو مار ڈالا۔ چھوٹے معصوموں پر بھی رحم نہ کیا ظالموں نے۔ میرا گڈو تو صرف سال بھر کا تھا۔''
جانے وہ کب تک یوں ہی روتی رہتیں کہ وحید آغا نے آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''بس کرو روشن۔ یہ تو عمر بھر کا رونا ہے بچی کو صبح صبح پریشان مت کرو۔''
اس نے روشن آرا سے الگ ہو کر ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے وحید آغا کی طرف دیکھا۔
''ماموں جان!'' اور بہت سارے آنسوؤں نے اس کا حلق سی دیا۔
''بس بٹیا اللہ کی مرضی۔ آ جاؤ ناشتا کر لو، بہت دیر ہو گئی ہے۔''
وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تیزی سے اندر کی طرف مڑ گئے اور تبھی اس نے کتنا چاہا تھا کہ وحید ماموں اور سعید ماموں اسے بھی بچی یا بٹیا کہہ کر بلائیں۔
''حیدر کو بھی لے آؤ عبدالکریم ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہوگا۔''
روشن آرا نے عبدالکریم سے کہا جو تاسف اور دکھ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
''جی.....'' عبدالکریم حیدر کی طرف بڑھا تو وہ

www.pklibrary.com

بھی روشن آرا کے ساتھ اندر آ گئی۔

سامنے ہی لاؤنج میں صوفے پر رضیہ مائی بیٹھی تھیں۔ ہاتھ گود میں دھرے بے ساکت بیٹھی سامنے دیوار پر لگی سونیا اور کاظم کی شادی کی تصویر دیکھ رہی تھیں۔

"رضیہ مائی۔" وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔ کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ بس خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

"ظالموں نے میری بچی کو مار دیا۔ ذرا بھی رحم نہ کھایا۔ پر کیوں رحم کھاتے ہم نے کب رحم کیا...... کب ترس کھایا تھا۔"

"رضیہ!" سعید آغا نے رضیہ مائی کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سعید ماموں!" وہ بھی اٹھی تھی، انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"آؤ عروج بیٹی! کسی نے تمہارے انتظار میں ناشتا نہیں کیا۔ اب تو لنچ کا وقت ہونے والا ہے۔"

وہ ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کر کے ٹیبل پر آ گئی۔ سعید آغا، وحید آغا، معظم، حیدر سلطان، روشن مائی سب ہی ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے۔

"میں پہلے داجی سے مل آؤں۔"

"پہلے ناشتا کر لو بیٹی۔ چچا جان ابھی اٹھے نہیں ہیں۔ ثقلین آیا تھا تمہارا پوچھنے تو بتا گیا ہے۔ رات کو انجکشن لگے تو دیر سے ہی اٹھتے ہیں۔"

روشن آرا نے بتایا تو وہ خاموشی سے ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کبھی اسے یہاں اس بڑی سی ٹیبل پر سب کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرنے اور کھانا کھانے کی کتنی حسرت تھی۔ جب چھوٹی تھی تو آغا جان کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی ناشتا کرتی تھی اور پھر اوپر ان کا الگ کھانا بننے لگا تھا۔

نوالے جیسے اس کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔

اس نے سامنے دیکھا حیدر سلطان بہت رغبت سے ناشتا کر رہے تھے۔ سعید آغا اور وحید آغا بہت پژمردہ مضمحل سے تھے۔ جوان اولاد کو اپنے ہاتھوں دفن کرنے والے والدین کا حال شاید ایسا ہی ہو جاتا ہے۔

معظم نے اس کا حال پوچھا تھا اور پھر ناشتا کرنے لگا تھا۔ وہ بمشکل آدھا سلائس کھا کر اور چائے پی کر داجی کی طرف آ گئی تھی۔ صبا ناشتے کی ٹرے اٹھائے داجی کے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ ثقلین ان کے بیڈ پر بیٹھا ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا۔

"داجی......!" وہ دروازے میں ہی لمحہ بھر کھڑی رہی تھی۔ وہ بہت کمزور بوڑھے لگ رہے تھے۔

"عروج بیٹی۔" ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور پھر انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"نہیں...... داجی نہیں......" اس نے دوڑ کر ان کے بندھے ہاتھ کھولے تھے۔ "نہ کریں...... مت کریں ایسا...... باپ بیٹیوں سے معافی نہیں مانگتے۔"

وہ رو رہی تھی۔

"لیکن میرے جیسے باپ تو معافی کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت برا کیا تمہارے ساتھ، حیدر کے ساتھ۔"

"میں نے معاف کیا داجی! اللہ بھی آپ کو معاف کرے۔"

"اللہ ہی نے تو معاف نہیں کیا۔ یتیم کا حق مارنے پر...... اسے دکھ دینے پر...... کس کے لیے سب کچھ چھینا تم سے۔ حسنین جانے زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ثقلین کی اولاد ہی نہیں۔ صبا اجڑ کر گھر بیٹھی ہے۔ مونا......" وہ اونچا اونچا رونے لگے تھے۔

"اللہ بہت رحیم و کریم ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ وہ اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے۔ جب وہ سچے دل سے معافی مانگتے ہیں۔"

"تو تم دعا کرو نا عروج! اللہ ثقلین کو اولاد دے۔ میری صبا کا نصیب کھل جائے۔ گھر بس جائے اس کا...... اور مونا کو گھر کا سکھ ملے۔"

انہوں نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

www.pklibrary.com

"ان شاء اللہ سب اچھا ہو جائے گا۔ واجی بس اب روئیں نہیں۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے۔

"ثقلین! الماری میں سے وہ بیگ نکال دو، کالے رنگ کا۔ میں نے تمہیں اس لیے منت کر کے بلایا ہے کہ تمہاری امانت تمہارے حوالے کر دوں۔ مجھے کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ میں خود تمہیں تمہاری امانت لوٹانا چاہتا تھا۔ جب میں نے اپنے ایک سگے بھتیجے اور دوسرے بھتیجے کی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو دوسروں پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔"

ثقلین نے سیاہ بیگ نکال کر انہیں دیا۔

"یہ سنبھال لو بیٹی! اس میں تمہاری اور حیدر کی ساری پراپرٹی کے کاغذات ہیں اور وہ زیور بھی ہے جو آغا جان نے تمہارے لیے بنوایا تھا۔ زمینوں سے ہونے والی آمدنی اور دکانوں مکانوں کے کرائے کا سارا حساب پائی پائی کا وحید کے پاس ہے۔"

"واجی! میں کیا کروں گی اس سب کا۔" اس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ "میں تو بس ایک ماہ کے لیے ہی آئی ہوں اور چاچی کو بھی ساتھ ہی لے جاؤں گی۔ میں نے تو پہلے بھی کہا تھا آپ سے، سب لے لیں۔"

اور اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنسوؤں نے ایک بار پھر آنکھوں میں یلغار کر دی تھی۔

"لالچ نے اندھا کر دیا تھا مجھے۔" واجی بھی پھر رونے لگے تھے۔ "لیکن یہ سب تمہارا اور حیدر کا ہے، جہاں بھی کرو، جس کو بھی دو تمہاری مرضی۔ یہ زہریلے ناگ ہیں جو راتوں کو مجھے ڈستے تھے۔ تم لے جاؤ گی تو میں سکون سے سو سکوں گا...... اور میری بچی کو بھی معاف کر دو۔"

انہوں نے صبا کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی اندر آئی تھی اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"بابا جان! آپ نے ناشتے کے بعد اپنی میڈیسن لینی تھیں۔"

صبا نے انہیں یاد کروایا تو ثقلین نے انہیں دوائیں دیں۔ وہ کچھ دیر وہاں ہی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ثقلین کا ہاتھ پکڑے پکڑے سو گئے تھے۔

"واجی کو کیا تکلیف ہے صبا؟"

"ضمیر کی چبھن۔" اس نے صبا سے پوچھا تو ثقلین نے جواب دیا تھا۔

"کچھ خاص تکلیف نہیں بس کبھی کبھی ڈپریشن ہو جاتا ہے۔ دو تین دن یہ سکون کی دوائی لیں گے تو پھر بہتر ہو جائیں گے۔" صبا نے ثقلین کی بات نظر انداز کر دی تھی۔

"اس ڈپریشن کی بڑی وجہ وہ زیادتی تھی جو بابا جان نے تمہارے اور حیدر بھائی کے ساتھ کی تھی۔ اب شاید ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ثقلین نے آہستہ سے کہا تھا اور کمرے سے نکل گیا تھا۔

"ان شاء اللہ۔" وہ بھی کچھ دیر بعد اٹھ کر چاچی کے پاس آ گئی تھی۔ جو آغا جان والے کمرے میں کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

"کیا پڑھ رہے ہیں چاچی؟"

"میرا قائد۔" انہوں نے کتاب کا سرورق اسے دکھایا اور پھر کتاب میں کھو گئے تھے۔

"اور سنو، اب ڈسٹرب نہ کرنا مجھے، میں جناح صاحب کے متعلق پڑھ رہا ہوں۔"

اور وہ بے اختیار مسکراتے ہوئے باہر آ گئی تھی۔ روشن آرا لاؤنج میں بیٹھی تھیں، وہ بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ اسے ظہیر اور مکرم کے متعلق بتاتی رہیں۔

"مکرم اسلام آباد میں ہوتا ہے۔ چھٹیوں میں بیوی بچوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس کی بیوی اچھی ہے، ظہیر زیادہ تر بیوی کے ساتھ سسرال میں ہی رہتا ہے۔"

"اور ہاں۔" انہیں اچانک یاد آیا تھا۔ "تمہارے ماموں تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ اپنے کمرے میں ہیں، کہہ گئے تھے کہ تم چچا جان کی طرف سے آ جاؤ تو ان کی طرف بھیج دوں۔"

www.pklibrary.com

"جی، اچھا۔" وہ جھجکتے ہوئے ان کے بیڈ روم میں آئی۔

وہ کچھ رجسٹر کھولے حساب کتاب کر رہے تھے۔

"آؤ...... آجاؤ بیٹا۔ بیٹھو۔ یہ میں تمہارا حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ آغا جان نے اپنی زندگی میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوادیا تھا۔"

"جی۔" اس نے سر ہلایا۔

"تو میں نے تمہارے حصے کی دکانوں کے کرائے، کاروبار میں حیدر کا حصہ سب کچھ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروادیا تھا۔ چچا جان نے بھی کافی رقم دی تھی جو حیدر کی زمینوں وغیرہ سے آتی رہی۔ وہ بھی تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروادی تھی میں نے...... یہ حساب کتاب ہے سارا دیکھ لو تم۔ کچھ کمی بیشی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔"

"ماموں کیا بات کر رہے ہیں۔"

"ماموں جان پلیز، مجھے یہ سب نہیں چاہیے...... کچھ بھی نہیں۔ میرے لیے آپ سب کی محبتیں ہی بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ یہی چیز تو مجھے ملنی چاہیے۔"

"لیکن بیٹا۔"

"پھر کبھی یہ حساب کتاب بتاتے رہیے گا۔ جب سے آئی ہوں بے سکون سی ہوں، پریشان ہو رہی ہوں۔" روشن آپا بتا رہی تھیں۔

"چلو بیٹا تم جاؤ، کپڑے بدلو اور تھوڑا آرام کرو۔ پتا نہیں رات کو بھی ٹھیک سے سوئی ہو کہ نہیں۔"

"تو آپ سنبھالیے اپنے یہ رجسٹر۔ ابھی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔"

بات کرتے کرتے انھوں نے وحید آغا کی طرف دیکھا تھا اور وہ ان کا شکریہ ادا کر کے اوپر آ گئی تھی۔ اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ ہاتھ لے کر جو بیڈ پر لیٹی تو شام کو ہی آنکھ کھلی تھی۔ کتنی ہی دیر تک آنکھیں کھولے وہ کل رات سے اب تک کی ساری باتیں سوچتی رہی۔

کیا ضروری ہے کہ آدمی ٹھوکر کھا کر ہی عقل آئے۔ ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی وہ کیوں نہیں سنبھل جاتا۔

وہ اٹھ کر بالکونی میں آئی، پتا نہیں کیوں اسے سامنے والی بالکونی کا دروازہ تھوڑا سا کھلا نظر آیا۔ صبح تو یہ دروازہ بالکل بند تھا۔ شاید چوکیدار اوپر آیا ہو تو اس نے کھولا ہو۔ اس نے اپنے لان میں جھانک کر دیکھا کہ شاید حیدر سلطان اس وقت لان میں ہوں لیکن لان خالی تھا۔ وہ سیدھی ہوئی تو نظر پھر سامنے والی بالکونی پر پڑی تھی۔

اسے لگا جیسے کسی نے بالکونی کے کھلے دروازے سے جھانکا ہو۔

دہلا چلا سراپا ہات

"انیس الحسن" اس کے ہونٹوں سے سرگوشی کی طرح نکلا تھا۔

"نہیں...... کہیں میں بھی چاچی کی طرح حواس تو نہیں کھو رہی اور میرا تصور مجھے انیس الحسن کو مجسم کر کے دکھا رہا ہو۔" اس نے پھر سامنے دیکھا، دروازہ اسی طرح تھوڑا سا کھلا تھا اور بالکونی خالی تھی۔

وہ گھبرا کر کمرے میں آ گئی۔

"آج عبدالکریم کاکا سے کہوں گی، میرے لیے بھی آغا جان کے کمرے میں ایک بیڈ لگا دیں۔ میں جتنے دن یہاں ہوں، چاچی کے کمرے میں ہی سویا کروں گی بلکہ مجھے تو ان کے پاس ہی رہنا چاہیے، میں بھی نا......"

وہ دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے کرتی باہر آئی تو سیڑھیوں میں ہی اسے ملازم لڑکی ملی۔

"باجی! نیچے چائے پر سب انتظار کر رہے ہیں، میں کھانے پر بھی دوبار بلانے آئی تھی، آپ سو رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا آپ کو نہ جگاؤں۔"

"میں بس آ ہی رہی تھی۔"

وہ نیچے آئی تو روشن آرا، رضیہ بیگم کے علاوہ صبا بھی ادھر ہی تھی۔ روشن آرا نے چائے کے ساتھ کافی اہتمام کر رکھا تھا۔

"تمہارے ماموں جان تو اب رات کو ہی

آئیں گے۔ ثقلین بھی کسی کام سے چلا گیا ہے اور حیدر شام کی چائے کمرے میں ہی پیتا ہے۔''

روشن آرا نے بتایا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''واجی کیسے ہیں؟'' اس نے صبا سے پوچھا۔

''بہتر ہیں اب۔''

اور پھر چائے پیتے ہوئے وہ انہیں اختر بانو، نرگس، سلطانہ بانو، وقار علی خان سب کے متعلق بتاتی رہی اور رضیہ ماسی، سونیا اور کاظم اور ان کے بچوں کی باتیں کرتی رہیں۔ چائے کے بعد روشن آرا نے اسے کاظم کے بچوں کی تصاویر دکھائیں۔

''کتنے پیارے بچے تھے۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے ماسی! لوگ اتنے ظالم کیوں ہو جاتے ہیں۔''

''ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایسے وقت آتے ہی رہتے ہیں۔'' حیدر سلطان اپنے کمرے سے باہر آ گئے تھے اور جھک کر بچوں کی تصویریں دیکھ رہے تھے۔

''کیسے وقت چاچی۔''

''بھی...... پہلے بھی ہم نے قربانیاں دیں اور اب بھی ہم ہی قربان ہوئے لیکن بہادر قومیں ہمت اور حوصلے کے ساتھ سب سہہ جاتی ہیں۔''

انہوں نے سیدھا ہوتے ہوئے باہر جانے کے لیے لاؤنج کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''کہاں جا رہے ہیں چاچی؟'' اس نے پوچھا۔

''باہر...... باہر جاؤں گا۔ کبھی کبھی تو میرا دل بہت گھبراتا ہے، ان بند دیواروں کے اندر دم گھٹتا ہے میرا۔''

''میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔'' وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

''ہاں چلو۔''

''عبدالکریم ہوگا باہر، وہ چلا جائے گا ساتھ۔'' روشن آرا نے کہا۔

''نہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے ان کے ساتھ جانے کو۔ دیکھوں گی ان گیارہ سالوں میں باہر کیا کچھ بدل گیا ہے۔''

''ہمارے علاقے میں تو کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی لیکن ویسے بہت کچھ بدل گیا ہے۔''

جواب صبا نے دیا تھا۔ وہ سر ہلاتی حیدر سلطان کے ساتھ لاؤنج سے باہر نکل آئی تھی۔ حیدر سلطان کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھی تو گیٹ کے پاس چوکیدار سے باتیں کرتا عبدالکریم اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہی ہیں بٹیا؟''

''پارک تک کاکا۔''

''میں بھی چلوں۔''

''نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

عبدالکریم کی بات کا جواب دے کر حیدر سلطان کا ہاتھ پکڑے اس نے گیٹ سے باہر قدم رکھا۔ بالکل سامنے گلی کے اسی طرح حسن پیلس کا گیٹ تھا۔ اس کا بے اختیار دل چاہا وہ دوڑتی ہوئی گلی پار کرے اور حسن پیلس کے گیٹ سے اندر جاتی شیر دل چاچا کو سلام کرتی بھاگتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ بھاری منقش دروازہ دھکیلتی اندر چلی جائے۔ تخت پر بیٹھی اماں جی مسکرا کر اسے دیکھیں وہ ان سے لپٹ جائے...... اور اسے اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی اور دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔

تب ہی حیدر سلطان نے اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لیا اور واپس مڑنے لگے۔ اس کا دل جیسے اتھاہ گہرائیوں سے ڈوب کر ابھرا اور اس نے بمشکل حسن پیلس کے گیٹ سے نظریں ہٹا کر حیدر سلطان کی طرف دیکھا۔

''چاجی آئیں۔''

''کہاں؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔

''پارک تک جائیں گے۔ سیر کریں گے۔''

''نہیں...... مجھے تو پاکستان جانا ہے۔'' ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ''میں پاکستان ہی جاؤں گا۔''

وہ مڑ کے کھلے گیٹ سے اندر چلے گئے۔ عبدالکریم نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''آئیں بھیا، میں آپ کو لے جاؤں گا پاکستان۔''

''سچ میں لے جاؤ گے نا پاکستان؟'' ان کی

www.paklibrary.com

آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ہاں بھیا۔ کیوں نہیں لے کر جاؤں گا، مجھے بھی تو جانا ہے۔" وہ ان کا رمز شناس تھا۔

"اکثر ایسا ہی کرتے ہیں بٹیا! باہر جاتے ہیں، چند قدم چل کر واپس آ جاتے ہیں۔"

"روشن مامی کو بتا دیجیے گا میں ذرا پارک تک کا چکر لگا کر آتی ہوں۔"

اپنی آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے اس نے رخ موڑا۔ اب پھر سامنے حسن پیلس تھا وہ جیسے کسی مقناطیسی کشش سے کھنچتی گلی عبور کر کے حسن پیلس کے گیٹ تک آئی اور پھر اپنا ہاتھ گیٹ پر رکھا۔ کیسا آشنا سا لمس تھا جس نے سارا تن بھگو دیا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی ہاتھ رکھے کھڑی رہی پھر حسن پیلس کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے پچھلے حصے تک آ گئی تھی۔ اس سے بے خبر کہ دو آنکھیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ سامنے سڑک تھی اور سڑک کے اس طرف پارک تھا جب اس طرف نئی کالونی بنی تھی تو یہ پارک بھی بنایا گیا تھا اور آس پاس کی عورتیں رات کو کاموں سے فارغ ہو کر یہاں چہل قدمی کرتی تھیں۔ وہ بھی ذہرا کے ساتھ کبھی کبھی یہاں آ جاتی تھی۔ تب پارک کی گھاس بہت سرسبز ہوتی تھی اور شام کے وقت خوب رونق ہوتی تھی۔ شاید حساب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے پارک اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ گھاس پیلی اور سوکھی ہو رہی تھی۔ کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ پارک کی چار دیواری اونچی نہیں تھی بس چند اینٹوں جتنی اونچائی سے حد بنا دی گئی تھی۔ وہ بے دھیانی سے بچوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ رہی تھی جب اس کی سماعتوں میں مٹھاس سی گھل گئی تھی۔

"انیس جاں......!" روح میں اترتی محبت کی حدت میں ڈوبی آواز۔

لمحہ بھر کو وہ مسحور سی ہوئی پھر اس نے جیسے خود سے پوچھا۔

"کیا میں پاگل ہو رہی ہوں...... ہاں شاید اگر میں یہاں رہی تو ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔ کل ہی انکل وقار کو فون کرتی ہوں کہ وہ چاچی کو بلانے کے لیے کچھ کریں۔"

"انیس جاں!" اسی مدھ بھری آواز کے ساتھ اس بار کندھے پر کسی ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے وہ تیزی سے مڑی تھی۔

وہی اونچا لمبا سراپا...... وہی دلکش خوش نما آنکھیں، محبتوں کے جہاں اپنے اندر سمیٹے اسے تکتی تھیں۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ہزاروں جگنو چمکتے تھے۔

"کیا کوئی اپنے پیاروں کو اتنا انتظار کرواتا ہے انیس جاں؟" ان بے حد دلکش آنکھوں میں شکوہ مچلا تھا پھر اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آؤ......"

اور وہ جیسے کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑی تھی اور خواب کی سی کیفیت میں اس کے ساتھ چلتی ہوئی وہ حسن پیلس کے گیٹ سے اندر آ گئی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے بھاری منقش دروازہ دھکیلتا لاؤنج میں آیا تھا۔ سامنے شیشے کی دیوار تھی جس سے پچھلے لان کے درخت نظر آتے تھے۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔ اماں جی کا تخت خالی پڑا تھا۔ وہ جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ انیس الحسن کا ہاتھ چھڑا کر وہ بھاگتی ہوئی شیشے کی دیوار سے ناک ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ بہار کی آمد تھی۔ کیاریوں میں کہیں کہیں پھول کھل رہے تھے۔

"میرا اعتبار کیوں نہیں کیا بجی! میں نے کہا تھا نا ڈرنا مت؟" انیس الحسن اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں بزدل تھی اتنی بہادر نہیں تھی کہ اپنے پیاروں کی تکلیف اور موت کا ڈراوا سہہ سکتی۔ مجھے معاف کر دیجیے گا انیس! میں نے آپ کا اعتبار توڑا، میں نے وعدہ ایفا نہیں کیا۔"

وہ اب بھی گلاس وال سے باہر کھلتے گلابوں کو دیکھ رہی تھی اور آنسو اس کی سیاہ آنکھوں کی جھیلوں میں تیر رہے تھے۔

"اور جب آزاد ہو گئیں تو پھر بھی واپس کیوں نہیں آئیں؟"

www.paklibrary.com

”کس لیے آتی..... کون تھا یہاں میرا..... عبدالکریم کاکا نے لکھا تھا چاچی.....“

اور آنسو جھیلوں کے کناروں سے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

”کیا میں تمہارا کچھ نہیں تھا؟“

”آپ ہی تو میرے سب کچھ تھے انیس۔“

آج اس کا اعتراف انیس الحسن کو مالا مال کر گیا تھا۔ اتنا امیر تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔

”آپ ہی کے لیے تو آنا تھا مجھے لیکن عبدالکریم کاکا نے لکھا تھا کہ.....“

”اور تم نے پھر کبھی عبدالکریم کاکا کو خط ہی نہیں لکھا۔ کیا تم نہیں جانتی ہیں کہ صبا نے میرے متعلق ہمیشہ جھوٹ بولا ہے۔“

عبدالکریم کاکا نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

”اور وہ لائٹنگ، روشنیاں؟“

دل یقین کرتے ہوئے بھی بے یقین تھا۔

”احسان چچا آئے ہوئے تھے انگلینڈ سے اپنے بیٹے کی شادی کرنے اور تم..... کیا تمہیں نہیں پتا تھا انیس جاں کہ انیس الحسن کا دل تو صرف عروج فاطمہ کے لیے دھڑکتا ہے اور اس کی ساری روشنیاں تو تم ساتھ لے گئی تھیں۔“ اس نے بازوؤں سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور رخساروں پر پھسلتے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لیے اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آؤ، میرے کمرے کی بالکونی سے تمہارے کمرے کی بالکونی کو دیکھیں، جیسے پہلی بار جب میں مری سے آیا تھا تو دیکھی تھی۔“

”آپ نے حسن پیلس کا خیال نہیں رکھا، باہر سے پینٹ اور سیمنٹ اکھڑ رہا ہے۔“

حسن پیلس اس کے خوابوں کا گھر تھا سو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بے اختیار گلہ کر بیٹھی۔

”ہاں، ہم لوگ یہاں رہے ہی نہیں، میں بس کبھی کبھار سال چھ مہینے بعد تھوڑی دیر کے لیے آتا تھا اور اب ڈیڈی پروگرام بنا رہے تھے اس کی مرمت وغیرہ کا۔“

اس نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے لاؤنج میں قدم رکھا۔

”پتا ہے پچھلے تین سالوں میں جتنی بار بھی میں یہاں آیا تمہارے داجی سے بھی ملا اور ہر بار ہی وہ معافی مانگتے اور وعدہ کرتے تھے کہ تمہارے آتے ہی وہ تمہیں میرے ساتھ رخصت کر دیں گے تو جیسے ہی عبدالکریم کاکا اور پھر داجی کا فون آیا کہ تم آ رہی ہو تو بھاگتا چلا آیا کہ کہیں ارادہ بدل نہ جائے تو اب زہرا آپی اور ممی، ڈیڈی بھی کل آ جائیں گے اور پھر.....“

”نہیں..... اب اس عمر میں.....“

اس نے گھبرا کر ہاتھ چھڑا لیا۔

”کیا ہوا ہے تمہاری عمر کو۔ کتنی عمر ہے تمہاری..... یہی تقریباً اکتیس سال نا۔“ اس نے اسے گھورا۔

”اور اکتیس سال کی عمر میں کوئی بوڑھا نہیں ہوتا اور ہم تو ہیں ہی شیر دل فوجی جوان۔“

اس نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا اور وہ اس کے کمرے میں کھڑی چاروں اور حیرت سے دیکھتی تھی۔ چاروں دیواروں پر اس کی منگنی کے فنکشن کی اور کچھ حسن پیلس میں لی گئی اس کی تصویریں تھیں۔

”یہ.....“ اس نے چاروں طرف گھوم کر اشارہ کیا اور آنکھیں پھر نم ہو رہی تھیں۔

”یہ.....“ وہ مسکراتا ہوا گنگنایا۔

ہم نے اپنی زندگی میں اور کیا رہنے دیا
اک تمہاری یاد رکھی ایک دیا رہنے دیا

اب تک کی عمر کی تکلیفوں اور دکھوں کا اجر۔

انیس الحسن کی محبت۔

آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے۔ وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو چنتا گنگنا رہا تھا۔

ہم نے اپنے گھر کی ساری رونقیں تقسیم کیں
جس میں تیرا عکس تھا، وہ آئینہ رہنے دیا
اک تمہاری یاد رکھی اک دیا رہنے دیا
(تسلیم الہیٰ زلفی)

☆

www.pklibrary.com

سعدیہ رئیس

دل آگاہی

اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے چپ چاپ کچی پکی دیواروں سے بنے باورچی خانے کا رخ کیا۔ صحن کے کونے پر بنا کچی اور مٹی دیواروں سے اٹا یہ باورچی خانہ دھوپ سے تپ رہا تھا۔ ٹوٹی کگروں والے سلیب پر پرانے بدرنگ سے

www.pklibrary.com

چولہے پر سیاہ بدشکل سی دیگچی رکھی تھی جس پر ٹیڑھے میڑھے کناروں کا ڈھکنا ڈھکا ہونے کے باوجود اس کے اندر سے خوشبو پھوٹ کر پورے باورچی خانے کو مہکا رہی تھی۔ اردگرد بے ترتیبی سے برتن پھیلے ہوئے تھے، ایک طرف توا رکھا تھا اور اس کے پاس ہی زمین پر چمٹا پڑا ہوا تھا۔ اس نے نظر گھمائی۔

پرانے سے ٹوٹے ہوئے بدرنگ چھلنے میں چند برتن دھلے ہوئے رکھے تھے لیکن برتنوں کا شور وہ اس وقت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے محتاط نظروں سے کچھ فاصلے پر بنے کمرے میں پلنگ پر پڑی اماں کو دیکھا جو سر پر دوپٹا کے چت لیٹی پیر پسارے بے سدھ سو رہی تھی۔

ہانڈی کا ڈھکن کھول کر اس نے جھانکا تو بھری ہانڈی سے بریانی کی تیز خوشبو نتھنوں میں گھستی چلی گئی اور پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ اس نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھ کر تسلی کی اور پھر جیسے بریانی پر ٹوٹ پڑی۔ ہانڈی میں ہاتھ ڈال کر مٹھیاں بھر بھر بریانی کھائی پھر ایک لیگ پیس لے کر اسے بھنبھوڑنے لگی۔

اچانک کمر پر ایک زوردار دھموکا پڑا۔

ایک لمحہ کو تو اس کا سانس رک گیا۔ آنکھیں ابل کر باہر آگئیں اور ادھ کھائی ٹانگ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ اس کا صدمہ الگ سہا۔

"اری منحوس..... ندیدی نہ ہو تو..... ساری ہانڈی کا بیڑا غرق کردیا۔ آدھی ہانڈی ٹھونس لی..... پیٹ ہے یا کنواں ہے؟ اب باقی لوگ کیا ہوا کھائیں گے؟"

اماں نے اس کے بالوں کے جھونٹوں کو پکڑ کر دو جھٹکے دیے اور نورو نے بھاں بھاں کر کے جو رونا شروع کیا تو اردگرد سب ہی کو اس کی تواضع اور درگت کی خبر ہوگئی۔ کھڑکی کی اوٹ اور دروازے کے درز سے جھانک کر سب بہنیں کھی کھی کرنے لگیں۔ گھر کے باہر بیٹھا راجا بھی اندر آگیا۔

اس نے ایک نظر روتی ہوئی نورو پر ڈالی جس کے پھولے پھولے سانولے گالوں پر آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ رونے کے باعث مزید پھیلے ہوئے بدنما لگ رہے تھے۔ گھنگھریالے الجھے بالوں میں لگتا تھا کئی دن سے کنگھا نہیں کیا گیا۔ راجا نے ہمدردی اور شفقت سے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو دیکھا اور پھر جیسے اسے طرارہ آگیا۔

"او جاہل عورت! پھر مارا تو نے اس کو۔ ہاتھ توڑ دوں گا میں تیرے۔" بڑے دنوں بعد اسے بیوی پر غصہ اتارنے اور رعب جمانے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔

"ناں تو یہاں کیا من سلویٰ اتر رہا ہے۔ ندیدی چٹوری سب کے حصے کا چٹ کر گئی۔

مولوی صاحب کے ہاں سے نیاز کا کھانا آیا تھا۔ سب چٹور گئی۔ بارہ برس کی ہوگئی، ننھی کاکی بنی رہتی ہے۔ حرکتیں تو دیکھو اس کی۔" کنیزہ کی چلتی زبان کوئی نہ روک سکتا تھا۔

اور یہ جو طبل جنگ بجا تھا۔ اب اس کے جلدی ختم ہونے کا کوئی چانس نہ تھا۔ کنیزہ کا چھوٹا سا طعنہ بھی اس کی مردانگی پر گہری چوٹ کی طرح لگتا تھا۔ اس بدحالی کا ذمے دار وہ اسے ہی ٹھہراتی تھی کیونکہ اس نے بھی ڈھنگ سے کچھ کمایا ہی نہ تھا۔

"آگے سے زبان چلائے جارہی ہے..... چپ کر بدبخت....." طیش میں آکر راجا کا ہاتھ اٹھ گیا۔

کنیزہ نے ہاتھ میں پکڑی ڈوئی دیوار پر دے ماری جواب میں راجا نے اس کی چٹیا پکڑ لی۔

اور دیوار سے چپکی کھڑی ہوئی نورو اپنا رونا بھول کر ان دونوں کو دیکھنے لگی پھر چپکے سے زینے چڑھ کر چھت پر آگئی۔ چھت پر کوئی بھی نہ تھا۔ ٹوٹی پھوٹی منڈیروں والی ویران چھت پر لکڑی کے پرانے تختے اور دوسرا کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا تھا۔ وہ کھلی فضا میں کھڑے ہو کر بے فکری سے نقارہ بجانے لگی۔ اس کے آنسوؤں سے آنکھوں کا کاجل بہہ کر گالوں پر سیاہ لکیروں کی صورت نظر آنے لگا تھا مگر اسے کوئی پروا نہ تھی۔ وہ دھواں دھار رو رہی تھی۔

رمشا اپنی چھت پر کپڑے پھیلانے آئی تھی۔ اس کے گھر سے پانچ چھ گھر کے فاصلے پر نورو اپنی

www.pklibrary.com

چھت پر کھڑی رونے کے شغل میں مصروف تھی۔
فاصلہ زیادہ نہ ہونے کے باعث وہ اسے صاف نظر آرہی تھی کیونکہ پورے محلے میں وہ واحد کچا کوٹھا تھا جس کی اونچی نیچی ٹوٹی منڈیروں سے سارا منظر صاف نظر آتا تھا۔ اس نے ہمدردی سے نورو کو دیکھا مگر ابھی وہ اس کے لیے کچھ نہ کرسکتی تھی۔

نجانے کیا بات تھی کہ اسے راجا کی اس چھوٹی بیٹی پر بہت ترس آتا اور پیار بھی۔ وہ اکثر اسے روتی بسورتی ہوئی ہی نظر آتی تھی۔ گھر کے حالات نے اس کے معصوم بچپن کو بہت چوٹ پہنچائی تھی۔ حال سے بے حال بکھرے گھنگھریالے بالوں کی لٹیں ہوا کے آوارہ گرد جھونکوں کی چھیڑ خانیوں سے اس کے گالوں پر اور پیشانی پر جھولتی رہتیں۔ پھولے پھولے گالوں اور موٹے موٹے ہونٹوں کے ساتھ روتی ہوئی وہ اسے بہت بے چاری سی لگتی۔ ویسے بھی پورے محلے کے مقابلے میں اس کے گھر کے حالات سب سے زیادہ خستہ اور ابتر تھے۔

کبھی اسے موقع ملتا، اسکول سے واپسی پر یا شام کو جب بھی وہ کسی کام سے گھر سے باہر نکلتی تو گلی میں مٹی سے رلتی کھیلتی نورو کا ننھا سا میلا ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ گھر لے آتی۔ اس کا منہ ہاتھ دھلاتی، بال سنوارتی اور بکھرے الجھے بالوں میں کنگھی کرکے کس کے دو پونیاں بنا دیتی۔ صاف کپڑے پہنا دیتی اگر اس کے پاس موجود ہوتے تو...... اسے ٹافیاں یا بسکٹ دے کر خوش کردیتی۔ اس وقت اس کے چہرے پر چمکتی خوشی اور آنکھوں کی روشنی دیکھ کر اسے بے حساب روحانی مسرت اور سکون محسوس ہوتا تھا لیکن امی ہر بار ہی ناک بھوں چڑھاتیں، انہیں اس طرح اس کے نورو کے لاڈ اٹھانا برا لگتا تھا۔

”جہاں تک ہے، وہیں تک رہنے دو اسے۔ ان کے اور ہمارے رہن سہن میں بہت فرق ہے۔“

امی کے پاس کئی اعتراضات تھے مگر وہ ان سے بھی الجھ پڑا کرتی۔

”کیوں منع کرتی ہیں، لوگ تو اپنے گھروں میں پالتو کتوں اور بلیوں پر اس سے زیادہ خرچ کرتے ہیں اور توجہ دیتے ہیں۔ یہ بے چاری تو پھر ایک انسان ہے۔ مجھے بھی تو ثواب ہی ملتا ہے۔“

”ثواب کمانے کے اور بھی بہت سے ذریعے ہیں بخشو مجھے۔ اسے یہاں کا راستہ نہ دکھاؤ۔ یہ ٹھہرے بدذات...... بے نام نسب کے لوگ...... پورے علاقے میں نام بجا ہوا ہے اس کے باپ کا۔ دور رہو اس سے، ان کا اور ہمارا کوئی میل نہیں۔“ اس کے بیچ پر امی بھڑک جاتیں اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیتیں اس کے آگے۔

”مگر امی......“ اس نے بولنا چاہا۔

”دیکھو میں اس کی ماں کی پیسوں کے ذریعے مدد کرتی رہتی ہوں۔ گھر میں اچھا کھانا پکتا ہے وہ بھی بھجواتی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ مدد کرو مگر حد میں رہ کر، اس کو سر پر مت چڑھاؤ۔“

امی اسے مزید بولنے کا کوئی موقع نہیں دیتی تھیں، جب وہ بھی مزید بحث میں پڑنے کے بجائے خاموش ہوجاتی۔ لیکن پھر بھی باز نہیں آتی تھی اور کبھی کبھی چپکے چپکے اس پر مہربانی کرتی رہتی تھی۔ ماں کی نظر بچا کر کبھی باہر کے باہر اس کی مٹھی میں پیسے پکڑا دیتی اور کبھی ان کی غیر موجودگی میں اسے گھر لے آتی۔

سارا سارا دن وہ گلیوں میں پھرتی نظر آتی تھی۔ میلے کپڑوں، الجھے بالوں اور ٹوٹی چپل کے ساتھ کسی سے لڑتی، کسی سے پھٹکار سنتی اور کبھی لمبی لکڑی سے کوؤں کو اڑاتی، کبھی آوارہ بلی سے کھیلتی ہوئی اور کبھی چوٹ لگنے پر روتی بسورتی نظر آتی۔ لیکن اب وہ بڑی ہوگئی تھی، اب وہ گلی میں بیٹھ کر نہ روتی تھی بلکہ چھت پر چڑھ کر آنسو بہاتی تھی۔

اب بھی وہ کبھی کبھار اسے بلوا لیتی۔ اس سے باتیں کرتی، اسے پڑھاتی۔ کبھی کچھ مزے کی چیز کھلا دیتی، فرنچ فرائز یا سینڈوچ وغیرہ اور امی کلستی رہتیں۔

”آگئیں وہ سوشل ورکر...... ایک امی پر ہمدردی

کا بخار چڑھا رہتا ہے ہر وقت۔" وہ بڑبڑاتی پھرتیں۔

ان کی ہر بات کو وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھی۔ نورو پر چند دن کی پابندی لگتی اور پھر آہستہ آہستہ وہ دوبارہ اسے گھر بلانے لگتی۔

امی کی خفگی اور ناگواری کی رمشا پروا نہ کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا یہ ان کا وقتی غصہ ہوتا ہے اور وہ دل کی بھی بہت نرم ہیں۔ جہاں تک ہو سکتا تھا وہ اس پر عنایات کرتی رہتی تھیں۔ اس کے گھر کے حالات کسی سے مخفی نہ تھے، پورا محلہ ان کے حالات سے باخبر تھا۔ گلی کے کونے پر بنا یہ خستہ حال چونا جھڑی دیواروں، ٹوٹی کھڑکیوں اور لٹکتے دروازوں والا گھر شاید قیام پاکستان سے قبل کا تھا اور پہلے سے کہیں بڑھ کر مخدوش حالت میں تھا۔ اس گھر کی حالت سے زیادہ اس گھر کے مکینوں کا برا حال تھا۔ یہ بات سب جانتے تھے۔

رمشا کے گھر سے وہ گھر اس زاویہ سے دکھائی دیتا کہ چھت پر چڑھ کر دیکھو تو گھر کی اندرونی حالت اور چلتے پھرتے لوگ بھی دکھائی دیتے تھے۔

راجا صاحب محلے بھر میں مشہور تھے۔ موٹی توند پر پہنا بنیان ان کی ناف چھپانے سے بھی قاصر تھا اور وہ گھر کے باہر چارپائی ڈالے اس پر بیٹھے بیڑی پیتے رہتے یا آتے جاتے راہ گیروں کو دیکھتے رہتے تھے۔

راجا صاحب اپنے نام کے شایان شان ہندوستان کی کسی ریاست کے راجا نہ تھے اور نہ ہی حسب نسب اور خاندانی لحاظ سے وہ کسی راجا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس علاقے کے سابقہ غنڈے زمان عرف راجا صاحب تھے، جن کا اپنے زمانے میں طوطی بولتا تھا۔ دھونس دھمکی، ڈرانا دھمکانا اور لوگوں سے چندے اور بھتے کی مد میں رقم بٹورنا ان کا شیوہ تھا۔ کام کے نہ کاج کے، ادھر ادھر آوارہ پھرتے۔ سگریٹ کے سٹے مارتے، تاش کے پتے پھینکتے اور ایسے ہی دوسرے الٹے سیدھے کام کرتے پھرتے۔ لڑائی جھگڑے کرنے میں سب سے آگے، دوسروں کی لڑائی میں فوراً ٹانگ اڑا کر اپنی دھاک بٹھاتے مگر ایک خوبی ان ساری عادتوں پر بھاری تھی۔ مشکل وقت میں محلے داروں اور ضرورت مندوں کو کہیں سے بھی قرض یا ادھار کی صورت میں رقم کا بندوبست کروا دیتے تھے۔

ان کا اپنا کوئی ذریعہ معاش تو تھا نہیں سب کو معلوم تھا کہ وہ اپنی دادا گیری کے بل پر یا کوئی دو نمبر کام کر کے پیسہ بناتے ہیں۔ لیکن یہ شرافت کی انتہا تھی کہ اپنے کسی محلے دار یا محلے کی کسی بہن بیٹی کو کبھی ٹیڑھی آنکھ یا غلط نظر سے نہ دیکھا بلکہ اپنے رعب داب سے اکثر ہی محلے والوں کی مشکل آسان کرائی۔ ان کی وجہ سے کسی دوسرے کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ محلے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے شاید یہی وجہ تھی کہ محلے والوں نے ان کو برداشت کر لیا تھا۔

پھر جوانی کا جوش چڑھا تو شادی کر لی اور شادی کے بعد جیسے ان کے سارے کس بل نکل گئے۔ پے در پے بیٹیوں کی ولادت نے تو جیسے سارا خناس ختم کر دیا۔ گھر چلانے کے لیے وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگے۔ بدمعاشی بھی چھوڑ دی لیکن ان کے مالی حالات ہمیشہ ابتر ہی رہے۔

محلے والوں کی خدا ترسی کی وجہ سے ان کا گھرانہ پرورش پاتا رہا۔ کچھ بیوی نے سلائی کر کے ساتھ دیا۔ کسی گھر سے کھانا آ جاتا، کوئی سال کے سال کپڑے بنا کر ان کو تھما جاتا، زکوٰۃ خیرات کی رقم بھی مل جاتی تھی یوں جیسے تیسے کر کے کام چلتا رہا۔

ان کی چاروں بیٹیاں ایک وضع کی تھیں۔ سب اپنے باپ پر گئی تھیں۔ پھولے پھولے گال، موٹے موٹے ہونٹ، قدرے فربہ جسامت اور گھنگھریالے بال...... اکثر شام کو چھت پر چڑھتیں تو نظر آ جاتیں، راجا صاحب تو ہمیشہ سے ایک ہی پہناوا پہنے رہتے۔ سفید چھوٹا بنیان جو ان کے موٹے پیٹ پر ناکافی ہوتا تھا اور چار خانے کی لنگی۔ ان کی بیوی جو درمیانی جسامت کی تھی لیکن اوپر تلے کے بچوں، برے حالات، خون کی کمی اور کمزوری کی وجہ سے اب وہ بھی بارہ من کی دھوبن لگتی تھی۔

محلے میں سب لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے __________ -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے __________ -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے __________ -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

جاتا [illegible] تھا مگر راجا صاحب کے گھرانے کو کبھی نہیں بلایا جاتا تھا۔ کسی کے ہاں شادی ہو، دعوت ہو، تکہ بوٹی ہو یا عید کے موقع پر سب کی مشترکہ بیٹھک ہوتی مگر انہیں کوئی مدعو نہیں کرتا تھا۔ ہاں غریبوں کا ایک حصہ نکال کر ان کے گھر کھانا ضرور بھجوا دیا جاتا تھا۔

رمشا کو ان کی سب بیٹیوں پر ترس آتا، ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں عجیب سی حسرت برستی تھی اور سب سے چھوٹی نورو کو دیکھ کر تو دل اور بھی ہمدردی سے بھر جاتا۔ وہ راجا صاحب کو بہت عزیز تھی، تب ہی وہ اس کی طرف داری کرتے اور چھوٹی موٹی فرمائشیں پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن وقت کی یاسیت کے ساتھ جب اسے ماں کے ہاتھوں کی مار پڑتی تب وہ بلک بلک کر روتی۔ اس کے موٹے موٹے گالوں پر ڈھلکتے آنسو دل پر اثر کرتے تھے۔

ایک روز نورو اسے گلی میں مل گئی۔ وہ کہیں سے آ رہی تھی، وہ اسے اپنے ساتھ بصد اصرار گھر لے آئی کیونکہ بڑے ہونے کے بعد وہ ہچکچانے لگی تھی۔ اس نے کئی جوڑے اس کے لیے نکال کر رکھے تھے، وہ کپڑے لیتے ہی جانے کے لیے اٹھ گئی۔

آج کافی دن بعد وہ اس کے ہاتھ لگی تھی اور رمشا کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اسے جو کچھ پڑھایا تھا، وہ بھول گئی ہوگی۔ راجا صاحب کی کسی بھی بیٹی نے اسکول میں نہیں پڑھا تھا۔ وہ نورو کو ہمیشہ پڑھنے کی تلقین کرتی تھی اور فی سبیل اللہ اسے پڑھایا کرتی تھی۔ آج امی گھر پر نہیں تھیں تو اسے موقع مل گیا۔ تھوڑی دیر تک اسے پڑھایا، اسے اپنی ایک پرانی کتاب گھر میں پڑھنے کے لیے دی۔ چائے کے ساتھ پاپڑ تل کر کھلائے اور بسکٹ کا پیکٹ بھی اسے دیا، ان ہی کاموں کی مصروفیت میں اسے معلوم ہی نہ [illegible] کہ امی کب گھر آ گئیں۔

امی نے کڑی نظروں سے نورو کو دیکھا اور پھر [illegible] نورو [illegible] میں رکھا بسکٹ چھپانا بھول گئی۔ [illegible] کی [illegible] نے اسے کم سنی میں ہی لوگوں کے [illegible] نظروں کا مطلب سمجھا دیا تھا اسی لیے

وہ امی کا سامنے کرنے سے کتراتی تھی، وہ بھی سہمی، شرمندہ سی نظر آنے لگی۔ امی نے اسے کچھ نہ کہا، پرس میں سے کچھ رقم نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"لو نورو.....! اپنی اماں کو دے دینا۔ اب گھر جاؤ، شام ہو رہی ہے۔" ان کے سادہ لفظوں میں چھپی تحقیر نورو سے چھپی نہ رہی۔

وہ فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ جاتے وقت اسے خدا حافظ کہنا بھی بھول گئی۔ اسے بہت افسوس ہوا، یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی، کسی کو اس کی حیثیت اور کم مائیگی کی وجہ سے حقیر سمجھنا غلط ہے لیکن امی کو کون سمجھاتا۔

"یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا امی!" وہ غصہ دبا کر احتجاجاً بول پڑی۔

"رمشا! کب عقل آئے گی تمہیں۔ ارے غیر لڑکی کو گھر میں گھسا رہی ہو۔ جوان بھائی ہے تمہارا..... اور پھر تم کیوں اس کو یہاں بلا کر اس کا احساس کمتری بڑھا رہی ہو۔ ان کا گھر دیکھا ہے کیسا ہے اور ہمارا رہن سہن بھی تمہارے سامنے ہے۔ وہ کیا سوچتی ہوگی، کچھ تو خیال کرو۔" امی کا اپنا ہی نظریہ تھا۔

اس بار امی نے کچھ اس انداز میں لپیٹ کر بات کی کہ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے ایک نظر سبز قطعہ پر لگے رنگا رنگ پھولوں اور اپنے چمکتے دمکتے گھر کو دیکھا اور تصور میں وہ رنگ اترا پلستر اکھڑا گھر آ گیا تو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"شاید امی سچ کہہ رہی ہیں۔ اس پہلو سے تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" اس نے جیسے خود کو سمجھایا۔

"شکر ہے بلا ٹلی..... روز کا ناکہ رکھا ہوا تھا اس نے۔" اسے سوچ میں پڑتا دیکھ کر امی نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

☆☆☆

یہ اس کی نورو سے آخری ملاقات تھی۔

اس کے بعد آنے والے دنوں میں بہت بڑی اور خوش گوار تبدیلی آ گئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق اس کی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر فیصل آباد چلی گئی۔ نئی زندگی کی شروعات سے قبل اس نے نورو سے ملنے کی بہت کوشش کی، وہ اسے عزت سے شادی میں بلانا چاہتی تھی مگر امی نے فوراً اس خیال کو رد کر دیا۔

رخصتی سے قبل اس نے کئی جوڑے، چوڑیاں اور دوسرا بہت سا سامان ایک دو شاپرز میں رکھ کر امی کے حوالے کر دیا کہ یہ نورو تک پہنچا دیں۔ شادی کے چند سال بعد ہی وہ دبئی چلی گئی، جہاں اس کے شوہر کا کاروبار تھا۔ زندگی کے کئی سال اس نے عیش و نشاط میں بھرپور طریقے سے گزارے۔ صبا اور طوبیٰ کی پیدائش نے جیسے زندگی کو مکمل کر دیا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد دبئی سے واپسی پر وہ کراچی شفٹ ہو گئی۔ دو سال قبل امی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اب اس کا میکہ بھائی کے دم سے تھا۔ مدتوں بعد وہ اپنے میکے آئی تو ان پرانی گلیوں اور پرانے راستوں کو دیکھ کر اسے گلی کے کونے پر بنا وہ خستہ حال گھر اور نورو بھی یاد آ گئی۔

نورو کا گھر اب ویران کھنڈر کی طرح خالی پڑا تھا۔ اب وہاں نہ کوئی رہتا تھا اور نہ ہی اب وہاں پرانی باتوں کو بتانے اور یاد کرنے کے لیے کوئی تھا۔ اس کی بھابھی تو راجا کے گھر سے واقف بھی نہ تھی اور بھائی کو بھی ایسی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی جو کچھ یاد رہتا۔ ایک وہی تھی جس نے راجا کے گھر کو خود پر سوار کر رکھا تھا۔ خیالات کی یلغار سے اس کا دل بوجھل سا ہو گیا۔

☆☆☆

کراچی شفٹ ہونے کے بعد حالات نے یک دم پلٹا کھایا، اس کے شوہر کو ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ سب بھاگ دوڑ بے سود رہی۔ وہ بے بس لاچار سی سب کچھ دیکھتی رہی مگر جانے والے کو روکنا اس کے اختیار میں نہ تھا اور اس کے اختیار میں تو کچھ بھی نہ تھا۔

حالات کو درست کرنے پر وہ قادر نہ تھی۔ سر کی چھت، اس کا دنیاوی سہارا اسے بے سائبان کر گئے تھے۔ چھوٹا بیٹا ابھی پانچ برس کا ہی تھا، سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ وہ جیسے ایک دم خالی سی ہو گئی۔ چند ہی دنوں میں وہ برسوں کی مریضہ نظر آنے لگی۔ حالات اور مہنگائی کا طوفان اسے وقت سے پہلے بوڑھا کرنے پر تلا ہوا

www.pklibrary.com

تھا۔ مدت کا عرصہ تو جیسے تیسے گزر گیا مگر کون کب تک کرتا رہتا۔ تب اسے کسی ہمدرد نے اسکول میں ٹیچنگ کرنے کا مشورہ دیا۔

یہ مشورہ کسی قدر قابل قبول تھا۔ ایک روز وہ تپتی دھوپ میں جھلستی ایک اسکول میں پہنچ گئی۔ ویٹنگ ایریا میں بیٹھی وہ اپنے بدلے حالات پر کڑھ ہی رہی تھی کہ اسے آفس میں بلا لیا گیا۔ شاندار آفس کے ٹھنڈے پُرسکون ماحول میں اس کی نم آلود دھندلی آنکھیں کھل سی گئیں مگر پرنسپل کی سیٹ پر بیٹھی شخصیت کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔ پھولے پھولے گال، موٹے موٹے ہونٹ، گھنگھریالے بالوں اور فربہ جسامت والی کرسی پر براجمان، وہ کھلے کھلے سے چہرے والی نفیس سی خاتون آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگائے کوئی اور نہیں نورو تھی۔

نورو بھی اسے پہلی نظر میں پہچان گئی۔ وقت نے اسے بہت بدل دیا تھا پیسے کی فراوانی، سکون اور عیش و عشرت نے اس کے چہرے پر خوب صورتی اور شخصیت میں وقار پیدا کر دیا تھا۔ انگلیوں میں نازک و نفیس سی انگوٹھیاں پہنے اور قیمتی سوٹ زیب تن کیے وہ بہت جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھ کر دوسری نظر اپنے بے حیثیت اور اجڑے ہوئے روپ پر ڈالی، وقت نے سب کچھ بدل دیا تھا۔

نورو اسے پہچانتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اس کے بعد سب منزلیں آسان ہو گئیں۔ کبھی کی، کی گئی نیکی آج اس کے کام آ گئی اور انسانیت کے رشتے پر یقین مزید پختہ ہو گیا۔ نورو نے فوراً اسے رکھ لیا، نہ انٹرویو لیا نہ کوئی ڈگری مانگی۔

آج وہ سچ مچ کے راجا کی بیٹی لگ رہی تھی۔

نام، نسب، حیثیت، شان و شوکت اور پیسہ سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ صرف اللہ کا فضل نظر آ رہا تھا۔ وہ جسے چاہے عزت دے۔

بے شک عزت اور ذلت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

☆

الف لیلہ

ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے بڑے سب کچھ بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں

-/300 روپے ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

فی کتاب -/1200 روپے

ڈسکاؤنٹ -/300 روپے

آج ہی -/950 روپے

منی آرڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

www.pklibrary.com

فرح بھٹو

کہر چھائی اس سرد ٹھٹھرتی ہوئی رات میں ایک بنچ پر اکیلا بیٹھ کر میں اس رات کی ساری ٹھنڈک اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں۔

لندن کی اس مشہور اسٹریٹ پر اس وقت لوگوں کا رش بہت کم ہے۔ ہاں دکانوں اور ریسٹورینٹس کے اندر چہل پہل ہے۔ چودہ تاریخ کا چاند آکاش پر عین میرے سامنے اپنی نرم سفید روشنی براہ راست مجھ پر ڈال رہا ہے۔ لیکن میں اس کی کرنوں سے بے نیاز اپنے ماضی کی سوچوں میں گم ہوں۔

ماضی جو موجود لمحے کو بیٹھے بٹھائے گزرے وقت میں بدل دیتا ہے۔ اور گزرا وقت دل کے اتنا قریب ہوتا ہے کہ موجود لمحے اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میرے لیے بھی میرا حال بے معنی ہے۔ میں حاضر لمحوں میں سانس ضرور لے رہا ہوں مگر میرا دل ماضی میں کھویا ہوا ہے۔ اور ماضی کی سوچ کے ساتھ ایک چہرہ میرے ذہن کے پردے پر جگمگاتا ہے۔ بس وہی چہرہ۔ اسی کی یاد۔ میرے دل میں ہلچل سی مچا دیتی ہے۔ پھر جیسے فاصلے دھوئیں میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور میں اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

☆☆☆

میں بالاج شاہ۔ نواب شاہ کے سب سے بڑے زمین دار حیدار شاہ کا سب سے چھوٹا لاڈلا سپوت۔ جو اپنے بڑے بھائیوں کی طرح گریجویشن کر کے زمینداری سنبھالنے کے بجائے۔ ایم بی بی ایس کر کے سرجن بننا چاہتا تھا۔ میرے اس شوق میں بابا بالکل رکاوٹ نہ بنے۔

انٹری ٹیسٹ میں نمایاں کامیابی کے بعد جب میرا داخلہ جامشورو میڈیکل یونیورسٹی میں ہوا تو بجائے حیدرآباد والے اپنے خالی بنگلے میں رہنے کے میں نے نانو کے پاس رہنے کو ترجیح دی۔ جہاں میرے تین

www.pklibrary.com

مکمل ناول

www.pklibrary.com

ماموں اپنے اہل و عیال سمیت آباد تھے۔

ہزار گز پر پھیلے اس خوب صورت بنگلے میں تین پورشن بنے ہوئے تھے۔ نانو سب سے چھوٹے ماموں کے پورشن میں رہتی تھیں۔ جن کے تین ننھے منے چشم و چراغ ہر وقت ایک ہنگامہ بپا رکھتے۔ میں نے بڑے ماموں کے پورشن میں رہنے کا ارادہ کیا۔ جہاں میرے کزن موحد اور احد میرے بچپن کے گہرے دوست بھی تھے۔ بڑے ماموں کے پورشن میں زندگی خاصی منظم اور پرسکون تھی۔ دوسرے نمبر کے ماموں کویت میں تھے اور ان کی فیملی وہیں مقیم تھی۔ ان کی دو بیٹیاں ماہ پارہ اور ماہ وش پاکستان میں زیر تعلیم تھیں۔

نانو کے گھر ہمیشہ کی طرح میرا والہانہ استقبال ہوا۔ موحد اور احد تو خاصے پرجوش تھے کہ ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری تعلیمی دلچسپیاں بھی ایک جیسی تھیں۔ ان دونوں کا بھی میرے ساتھ میڈیکل میں ایڈمیشن ہوا تھا۔ اپنا سامان بڑے ماموں کے پورشن میں چھوڑ کر میں فریش ہو کر چھوٹے ماموں کے پورشن میں چلا آیا۔ نانو کے کمرے میں ان کی مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور وہ خود ایک کونے میں بچھے مصلے پر بیٹھ کر نماز ادا کر رہی تھیں۔ نانو کافی سال پہلے پیرالائز ہو گئی تھیں۔ پھر مسلسل علاج اور فزیو تھراپی کے بعد بہتر ضرور ہوئیں مگر اب بھی زیادہ چلنے پھرنے سے قاصر تھیں۔ میں کچھ دیر ان کو نماز پڑھتے دیکھتا رہا انہوں نے سلام پھیرا تو مجھ پر نظر پڑی۔

"ارے بالاج میرا بچہ۔" نانو نے بانہیں پھیلائیں تو میں اٹھ کر ان کے گلے لگ گیا۔ ان کے نحیف وجود میں عجیب سکون بھرا تھا۔ میں نے ان کی پیشانی چوم لی۔

"مہناز کیسی ہے اور تمہارے بابا۔ بھائی بہن سب ٹھیک ہیں نا۔" وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے پوچھنے لگیں۔

"سب خیریت سے ہیں۔ اماں نے آپ کو سلام بھیجا ہے اور یہ بھی۔" میں نے مٹھائی اور چار سوتی کڑھائی سے بنی نفیس چادریں ان کو دی۔

"اللہ خوش رکھے۔" انہوں نے دعا دی۔

"بالاج بھائی آئیں نا میں آپ کو اپنا نیا لیپ ٹاپ دکھاؤں جو پاپا نے میرے اے پلس آنے پر مجھے گفٹ کیا ہے۔" بارہ سالہ نمیر نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"ہاں آ رہا ہوں یار۔" میں نے ٹالنے کی کوشش کی کہ نانو کی قربت اچھی لگ رہی تھی۔

"نہیں ابھی آئیں۔" وہ بضد ہوا۔

"اوکے بابا۔" میں نا چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے لے کر لاؤنج میں آ گیا۔ جہاں اس سے چھوٹے دو بھائی دھینگا مشتی میں مصروف تھے۔

"یار کبھی سکھ سے بھی بیٹھ جایا کرو۔" میں نے مانی کو دائم کے ہاتھوں سے چھڑا کر اپنے ساتھ صوفہ پر بٹھایا تو وہ ہنستا ہوا اتر کر بھاگا۔

"یہ دیکھیے بالاج بھائی۔" نمیر نے لیپ ٹاپ میرے سامنے کیا۔

"واہ بہت اچھا ہے۔" میں نے تعریف کی تو وہ کھل اٹھا۔ "اسی طرح اسٹڈی پر توجہ دیتے رہنا اور ان دونوں کو بھی عقل سکھاؤ۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دائم اور مانی کو دیکھا جو اب بھی لڑائی میں مصروف تھے۔

"ہاہا یہ تو نہیں سدھریں گے۔" وہ ہنستا ہوا بولا۔

"ایک دو سال پہلے تک تم بھی ایسے ہی جن تھے۔" عاصمہ مامی ٹرے کے لوازمات ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"ارے مامی آپ نے زحمت کیوں کی۔" میں سیدھا ہو بیٹھا اور مامی کو کچھ شرمندہ ہو کر دیکھا۔

"بس اب غیروں والی بات نہ کرو مجھ سے۔" انہوں نے ایک پلیٹ میری طرف بڑھائی اور دوسری پلیٹ میں رول اور کٹلس وغیرہ ڈال کر واپس مڑیں۔

"انزلنہ۔ یہ کھا لو اور اب زیادہ نخرے مت کرو۔" وہ بیزاری سے کسی سے مخاطب تھیں میں نے

بائیں طرف گردن موڑ کر دیکھا تو فلور کشن پر ایک نو دس سال کی بچی دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے آنٹی۔" وہ بولی تو مجھے اس کا لہجہ بھیگا ہوا محسوس ہوا۔

"بچے۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے تمہاری منتیں کرنے کی۔ ہر دفعہ ایک ہی جواب بھوک نہیں ہے۔ اب کھانا ہو تو خود ہی کھا لینا۔" مامی نے پلیٹ ٹیبل پر پٹخی اور خفگی سے کمرے سے نکل گئیں میں نے تعجب سے لب بھینچے پھر نمیر سے پوچھا۔

"یہ کون بچی ہے؟"

"یہ پاپا کے کسی کزن کی بیٹی ہے۔ اس کے مما بابا ایکسیڈینٹ میں فوت ہوگئے تو یہ یہاں آگئی۔" نمیر نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے سرسری سا بتایا۔

"کیا؟" میں نے ایک بار پھر گردن موڑی۔ اس بار آنکھوں میں ہمدردی کا عکس تھا۔ بلو کلر کی لمبی فراک میں ملبوس وہ بچی انتہائی گوری اور خوب صورت تھی۔ ماموں کے تینوں بیٹوں کے سامنے بالکل انگریز لگ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے برابر والے کشن پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا نام کیا ہے گڑیا؟" میں نے نرم آواز میں پوچھا تو اس نے اپنی سبز آنکھیں اوپر اٹھالیں۔ ان آنکھوں میں تیرتا پانی۔ میں بے کل ہوا۔

"انزلنہ۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"آپ کچھ کھاتی کیوں نہیں۔ اچھے بچے اس طرح نہیں کرتے۔" میں نے ٹیبل سے پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے کی۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔

"شاباش یہ تھوڑا سا کھالو۔" میں نے کانٹے میں نگٹ پھنسا کر اس کے منہ کے آگے کیا۔ انزلنہ نے بے ساختہ منہ کھولا۔ میں نے نگٹ اس کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ دھیرے دھیرے چبانے لگی۔ مجھے حوصلہ ہوا میں نے باری باری پانچ نگٹس اس سے کھلا دیے اور ایک چین کیک بھی۔ وہ آرام سے کھا رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے "بس اب نہیں" کا اشارہ کیا۔ میں نے پاس رکھا ٹشو اس کو دیا۔ انزلنہ نے فرماں برداری سے منہ پونچھ لیا۔

"یہ تو اب کھا رہی ہے۔ دو دن سے تو کچھ نہیں لے رہی تھی۔" نمیر نے حیران ہو کر کہا۔

"انزلنہ! آپ آنٹی کو کیوں تنگ کر رہی تھیں۔ بری بات ہے بڑوں کی نافرمانی کرنا۔" میں نے اس کے سنہری بال چھوئے۔

"وہ...... مجھے ممی اپنے ہاتھ سے کھلاتی تھیں۔" وہ آہستگی سے بولی اور سر جھکا لیا۔

"اوہ۔ اچھا۔" میں سمجھ گیا کہ اس نے میرے ہاتھ سے کیسے کھا لیا۔ اسے اس طرح ہی کھانے کی عادت تھی۔ میں نے ہمدردی سے اس معصوم پری کو دیکھا۔

"بالاج تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھے ہو اور میں سمجھی دادی کو کمپنی دے رہے ہو۔" ماہ پارہ کی آواز پر میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر میرے سامنے کھڑی تھی۔

"ہاں بس آرہا تھا۔" میں نے اٹھ کر پلیٹ واپس ٹیبل پر رکھی۔

"اس ڈراما کوئین کے ساتھ کیوں بیٹھے ہو۔"

بہنوں کے لیے خوش خبری
آج ہی تشریف لائیں اور
30% فیصد ڈسکاؤنٹ
حاصل کریں ہماری شاپ پر موجود
تمام کتب کی سیل جاری ہے
یہ رعایت صرف کراچی کی بہنوں کے لیے ہے
شاپ کا پتا:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

وہ نخوت سے ازلنہ کو دیکھ کر بولی تو میں اس کے انداز پر حیران ہوا۔

"چھوٹی سی بچی کو کن القاب سے نواز رہی ہو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"ہونہہ۔ بچی۔" وہ کہہ کر آگے بڑھی تو میں اس کے پیچھے چلا آیا۔

"بی ہیو یور سیلف۔ ماہ پارہ وہ پہلے ہی ٹراما سے گزر رہی ہے پھر تم......"

"اس کے فادر نے جو کچھ عالیہ خالہ کے ساتھ کیا۔ میں وہ بھول نہیں سکتی بالاج۔" وہ لان کی روش پر چلتے رک کر بولی تو میں نے ناسمجھی سے اس سے دیکھا۔

"یہ اعتزاز انکل کی بیٹی ہے؟ او گاڈ تو ان کا ایکسیڈینٹ میں انتقال ہوا ہے۔" پھر جیسے مجھے کلک سا ہوا اور میں افسوس میں گھر گیا۔

اعتزاز ماموں، ماہ پارہ کی خالہ کے منگیتر تھے۔ انگلینڈ تعلیم حاصل کرنے گئے تو ایک عیسائی لڑکی فریوا کے اسیر ہو گئے۔ پھر ان کی واپسی فریوا کے ساتھ ہوئی۔ خاندان میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ماہ پارہ کی خالہ کو گہرا صدمہ ہوا۔ وہ کئی مہینوں تک بیمار رہیں۔ اعتزاز کے

والدین نے فریوا کو چھوڑنے کا مطالبہ کیا نتیجتاً اعتزاز والدین سے علیحدہ ہو کر دوسرے شہر چلے گئے۔ یہ ایک طرح سے بائیکاٹ تھا۔ زینب (فریوا) نے بھی ساتھ نبھایا وہ اسلام قبول کر چکی تھیں۔ ان کی بیٹی ہونے کی خبر آئی۔ اور پھر سب کچھ وقت کی دھول میں بیٹھ گیا۔ ماہ پارہ کی خالہ نے پھر شادی نہیں کی۔ بہت سال بعد وہ ایک دن ہارٹ اٹیک سے فوت ہو گئیں اور اب اعتزاز انکل کی بیوی کے ساتھ ایکسیڈینٹ میں موت اور ان کی بیٹی کی یہاں موجودگی۔ اس نے پر سوچ نظروں سے ماہ پارہ کو دیکھا۔

"ازلنہ کو اس کے دادا دادی نے کیوں نہیں رکھا۔" میرے سوال پر وہ طنزیہ سا مسکرائی۔

"وہ کیوں رکھتے۔ اس کی انگریز ماں نے ان کے ساتھ کون سی اچھائی کی؟ ان کا بیٹا چھین لیا۔ دادی جیسے مہان سب تھوڑی ہیں جو یہ گند اپنے گھر لے آئی ہیں۔" وہ نفرت سے بولی تو میں نے تاسف سے اس سے دیکھا۔

"بری بات ماہ پارہ۔" میں نے بے اختیار ٹوک دیا۔ "اتنی ایجوکیٹڈ ہو کر ایسی باتیں کر رہی ہو۔"

"اس میں ایجوکیشن کا کیا دخل؟ میری خالہ جانی نے سسک سسک کر جان دے دی۔ وہ اعتزاز انکل کو کتنا چاہتی تھیں۔ اور وہ کتنے بے وفا نکلے۔" ماہ پارہ جلبلا رہی تھی۔

"جو کچھ اعتزاز انکل نے کیا وہ ان کا عمل تھا اس سب میں ان کی بیٹی کا کیا قصور؟"

میں نے سوال کیا تو ماہ پارہ نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"اس کا قصور یہ ہے کہ وہ ان کی "بیٹی" ہے۔" ماہ پارہ نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا اور پھر رکی نہیں۔ میں تاسف سے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"یار ولدار پلس لینڈ لارڈ کزن کے پیسوں سے پیزا اڑانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔" احد نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لے کر کہا تو موحد اور ماہ پارہ نے متفق ہو کر سر ہلایا۔

"اور جگری بالاج نے ہمیں ہمیشہ اس مزے سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا ہے۔" موحد نے ٹکڑا لگایا تو پھر دوسرا اثبات میں ہلے۔

"بس کر زیادہ اوور نہ ہو۔" میں نے احد کے شانے پر ہاتھ مارا تو وہ ہنسنے لگا۔

"میں نے کیا غلط بات کی۔ نواب شاہ کا نواب نہیں ہے کیا تو؟" وہ آنکھ دبا کر بولا تو میں بھی ہنس دیا۔

"یار مجھے یہ پیزا کا ہٹ خرید کر دے دے۔ ساری عمر دعائیں دوں گا۔" احد اب مسخرے پن پر اتر آیا تھا۔

"اچھے خاصے بیوروکریٹ کی اولاد ہو کر منگتا

www.pklibrary.com

بن رہا ہے شرم کر۔" میں نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

"نہ پوچھ اس بیوروکریٹ کی جگہ مشہور کنجوسی کا حال میرے یار۔" وہ ٹیبل پر بازو لمبا کر کے اس پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"ٹوتھ پیسٹ کی جگہ اب تک ڈینٹونک سے دانت صاف کرنے پڑتے ہیں۔ شیمپو کی جگہ لال صابن سے کام چلانا پڑتا ہے اور...... ناشتے میں انڈے کی جگہ ڈنڈے کھانے پڑتے ہیں ہاہا۔" موحد نے احد کا جملہ اچک کر قہقہہ لگایا تو ہم سب ہنس پڑے۔

"اب اتنے بھی کنجوس نہیں خلیل ماموں۔ خوامخواہ ان کی مٹی پلید نہ کر۔" میں نے ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ماموں کا دفاع کیا۔

ہائے تو بے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
کسی روز اتر میرے گھر شام کے بعد

اس نے ٹیبل بجاتے لہک کر شعر پڑھا تو میں عش عش کر اٹھا۔

"تیری رات کا دکھ تو میں تین راتوں سے دیکھ ہی چکا ہوں۔ بس ماموں کو اطلاع دینے کی دیر ہے رات کا دکھ ناک کے ذریعہ کیسے نکالتے ہیں دیکھنا۔" میں نے شیو پر ہاتھ پھیرتے دھمکی دی تو اس کی مچلتی تھرکتی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔

"نہ کر یار۔" احد نے ہاتھ جوڑے۔

"کون سا دکھ ہے رات کا۔ مجھے بھی بتاؤ۔" ماہ پارہ کے کان کھڑے ہوئے۔

"وہ کچھ دنوں سے مجھے پیٹ درد تھا تو سو نہیں پا رہا تھا جس سے تو میری وجہ سے بالاج بھی ڈسٹرب ہو رہا تھا۔" احد ساری ہوا کاری بھول کر سیدھا ہوا اور میں اس کی ہوشیاری سے چکرا کے رہ گیا اور ساتھ ہی بے ساختہ ہنس دیا۔

"اچھا۔" ماہ پارہ نے مشکوک نظریں ہم دونوں پر گاڑ دیں۔

"اب معاف کر دے۔ قو چہ کی مسز نواب پلس لینڈ لارڈ۔" احد نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو وہ سرخ سی ہو گئی۔ پھر ہونٹ دبا کر مجھے دیکھنے لگی۔ احد اپنی چالاکی پر فاتحانہ مسکرایا۔ ماہ پارہ کا دھیان بٹ چکا تھا۔

"ماہ مجھے اپنے نواب سے ادھار دلوا دے یار بڑا احسان ہو گا۔ میں انچ کا پیزا اور ڈیڑھ لیٹر کولڈ ڈرنک میری پیزا شاپ سے روز تمہیں ڈلیور ہو گی قسم سے۔" وہ مزید بولا تو ماہ پارہ کھلکھلائی۔

"سن رہے ہو بالاج اس کی باتیں۔" ماہ پارہ نے اٹھلا کر مجھے مخاطب کیا تو میں جو ویٹر کو بل پے کر رہا تھا فقط مسکرا دیا۔

"اگنور کرو۔ پاگل ہے۔" میرے کہتے ہی احد نے مجھے دھپ ماری۔

"اچھا میں پاگل ہوں۔"

"بالکل پاگل۔" میں نے والٹ جیب میں ڈالا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ تینوں میرے پیچھے چلے آئے۔

"تم لوگ گاڑی میں بیٹھو میں نانو اور بچوں کے لیے آئس کریم پیک کروا کر آتا ہوں۔" میں نے سامنے آئس کریم شاپ دیکھی تو نانو یاد آ گئیں جو آئس کریم بہت شوق سے کھاتی تھیں۔ پھر مختلف فلیورز کی آئس کریم پیک کروا کر میں واپس آیا تو ماہ پارہ حسب توقع فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

یہ ایک طرح سے اس کا مجھ پر استحقاق جتانے کا انداز تھا۔ میں بالاج شاہ اس کا بچپن کا منگیتر جو

تھا۔ گھر پہنچ کر احد موحد اور ماہ پارہ اپنے پورشنز میں چلے گئے اور میں آئس کریم لے کر نانو کے پاس چلا آیا۔ نانو بستر میں گھٹنوں تک کمبل ڈالے بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھا تو ہمیشہ کی طرح اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

"کیسا ہے میرا بچہ۔"

"بالکل اے ون۔ آپ کے لیے پستہ آئس کریم لایا ہوں۔" میں نے آئس کریم انہیں دی تو وہ ایک دم خوش ہو گئیں اور فوراً ہی کھانے لگیں۔ میں ان کی بچوں جیسی حرکات پر مسکرانے لگا۔ ان کو آئس کریم کا کریز تھا لیکن جلیل ماموں کبھی کبھار کھانے کی اجازت دیتے تھے۔

"میں یہ بچوں کو دے آؤں۔" میں نے شاپر اٹھایا۔

"بالاج بیٹا۔ ایک اس بچی کو بھی دے۔" نانو نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تو میں نے ان کے پہلو میں دبکی ازلنہ کو دیکھا۔

"ارے یہ یہاں بیٹھی ہے۔ کیسی ہو ڈول؟" میں نے ایک آئس کریم کپ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"نوید یہ آئس کریم باہر دے آؤ۔"

"بالاج بیٹا تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔" نانو نے پاس کھڑے ملازم کو کہا میں نانو کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"باہر جا کر بیٹھتے ہو تو پھر وہیں کے ہو جاتے ہو دوبارہ میرے کمرے میں نہیں آتے۔" نانو خفا لہجے میں بولیں۔

"سوری نانو۔"

"بس بیٹا۔ آج کل کے بچے بزرگوں کے پاس دو گھڑی بیٹھنے سے بھی بور ہو جاتے ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری تو میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"پلیز نانو۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"خوش رہو بچے۔ میں کیا اور میری شکایتیں کیا۔ یہ بھی بہت ہے کہ تم نے احساس کر لیا اور معافی مانگ لی۔ اس گھر کے افراد تو جو کچھ کرتے ہیں اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ معافی تلافی تو دور کی بات ہے۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"کیا ہوا نانو۔ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟" میں ایک دم چونک کر پوچھ بیٹھا۔

"مجھے کسی نے کیا کہنا ہے۔ اس معصوم بچی کے لیے ہی سب شقی القلب بنے ہوئے ہیں۔" انہوں نے ازلنہ کا سر سینے سے لگایا۔

"اعتزاز میرا بہت پیارا بھتیجا تھا۔ اس کا سارا بچپن یہیں اسی گھر میں گزرا۔ عالیہ میری بھانجی جس سے اعتزاز کی نسبت طے تھی۔ تم تو جانتے ہو نا ہمارے یہاں بچپن میں نسبتیں طے ہو جاتی ہیں میرے خلیل اور فواد کی بھی عالیہ کی دونوں بہنوں سے شادیاں ہوئی ہیں۔ پھر اعتزاز باہر پڑھنے گیا اور وہیں کسی انگریز لڑکی سے شادی کر لی۔ ہمیں دکھ ہوا پر سب کا اپنا نصیب ---- عالیہ بہت بیمار ہو گئی سالوں تک غم کو سینے سے لگائے رکھا پھر دنیا سے چلی گئی، بہت برا ہوا۔ اعتزاز کی نئی دلہن کو خاندان نے قبول نہیں کیا، وہ الگ رہنے لگا۔ پر اس کی قسمت میں بھی جان لیوا حادثہ لکھا تھا۔" نانو سانس لینے کو رکیں۔ میں بغور سن رہا تھا۔

"اب جب وہ بیوی سمیت دنیا سے چلا گیا تو اس کے گھر والے اس کی معصوم بچی کو قبولنے کو تیار نہیں۔ میری بیوہ بھابھی بیٹوں کے آگے مجبور ہے۔ مجھ سے ہاتھ جوڑ کر کہا میرے اعتزاز کی نشانی تو سنبھال لے۔ میں نے ازلنہ کی سرپرستی اپنے ذمہ لے لی۔ لیکن میری بہوؤں نے ایک محاذ کھول کر رکھ دیا۔ اس بچی کی دشمن بن گئی ہیں۔ جلیل کی دلہن کچھ بہتر ہے۔ مگر جٹھانیوں کی باتوں میں آ کر وہ بھی بگڑ جاتی ہے۔ سیدھے منہ بچی سے بات نہیں کرتی حالانکہ یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھنے کا کتنا ثواب ہے۔ سچ پوچھو تو بالاج بیٹا! میں ازلنہ سے شرمندہ ہو رہی

ہوا، بچی دنوں میں کملا گئی ہے۔ پہلے ہی والدین کی جدائی کا صدمہ پھر لوگوں کے خراب رویے۔" وہ سرد آہ بھر کر خاموش ہوئیں تو میں نے افسوس سے ازلنہ کو دیکھا جو گہری سبز آنکھوں سے کبھی مجھے کبھی نانو کو دیکھ رہی تھی۔

"جب تک زندہ ہوں اس کی ڈھال بنی رہوں گی۔ پھر تو اللہ محافظ ہے۔"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں اللہ آپ کو زندگی دے۔" میں نے بے اختیار کہا۔

"بیٹا زندگی کسی کے چاہنے سے نہیں بڑھا کرتی۔ جس وقت قضا لکھی ہوتی ہے اسی وقت آتی ہے۔ اپنی ذمہ داریوں سے تو میں کب کی فارغ ہو گئی لیکن اب یہ نئی ذمہ داری اس آخری عمر آن پڑی ہے۔ سچ پوچھو تو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ میرے بعد دنیا اس معصوم کے ساتھ کیا کرے گی۔" وہ ازلنہ کا سر تھپکتے مایوس لہجے میں بولیں۔

"آپ فکر مت کریں نانو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میرے کہنے پر وہ پھیکا سا مسکرا دیں۔

"بالاج۔ میری ایک بات مانو گے؟" پھر وہ میرے قریب ہوئیں۔

"ہاں نانو کہیں۔" میں ہمہ تن گوش ہوا۔

"ویسے تو تم بھی ابھی کم عمر ہو۔ لیکن تمہاری حیثیت اس گھر میں بہت مضبوط ہے۔ تمہاری بات مانی جاتی ہے۔ میرے بعد تم ازلنہ کے لیے اچھا سہارا بن سکتے ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ میری ازلنہ کو ان لوگوں کے شر سے ہمیشہ بچا کے رکھو گے۔ جب تک وہ تعلیم مکمل کر کے اپنے گھر کی نہ ہو جائے۔" نانو نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر لجاجت سے کہا تو میں ایک لمحے کے لیے گنگ ہو گیا۔ پھر نظریں گھما کر ازلنہ کو دیکھا جو ہم دونوں کی گفتگو سے بے نیاز نانو کا سیل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ گوری گلابی گڑیا ایسی معصوم لڑکی۔

"وعدہ کرو میرے بچے۔" نانو نے اصرار سے میرا ہاتھ دبایا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں نانو۔ میں ہمیشہ ازلنہ کو سپورٹ کروں گا۔" ایک پل میں فیصلہ کر کے میں مضبوط لہجے میں بولا تھا۔ نانو جیسے ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی تھیں۔

"جیتا رہ میرا بچہ۔ اب مجھے مرنے جینے کی کوئی فکر نہیں۔ تیری ماں بھی خدا ترس عورت ہے۔ مجھے تم دونوں پر پورا بھروسا ہے۔ کبھی یہ گھر اس بچی کے لیے تنگ پڑے تو میری ملیحہ بیٹی اپنا دامن کھول دے گی۔" وہ غالباً اماں سے بھی اس معاملہ پر بات کر چکی تھیں۔ "ازلنہ بیٹا۔ اب سے اپنی ہر پرابلم بالاج سے شیئر کرنا ٹھیک ہے۔" انہوں نے ازلنہ کا نرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر تاکید کی۔ تو سنہری بالوں والی لڑکی نے زور سے سر ہلایا اور میں خود پر پڑنے والی اس پیاری سی ذمہ داری کو گم صم سا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد میں کوشش کر کے دن میں ایک بار نانو کی طرف چکر لگا آتا۔ ان کے پاس بیٹھ کر حال احوال پوچھنے کے ساتھ ازلنہ سے بھی ہلکی پھلکی باتیں کیا کرتا۔ وہ بہت کم گو بچی تھی۔ زیادہ تر نانو کے پاس پائی جاتی۔

میں نے نانو کے مشورے سے اس کو شہر کے اچھے اسکول میں پانچویں کلاس میں داخلہ دلوا دیا۔ نہال وغیرہ بھی وہیں زیر تعلیم تھے۔ وہ اسکول جانے کے بعد کچھ کھل گئی۔ اب نانو کے برابر والے بیڈ پر وہ اپنی کتابیں بکھرائے پڑھتی رہتی۔

بلاشبہ وہ ایک ذہین بچی تھی۔ یہ بات میں نے دنوں میں ہی محسوس کر لی تھی کہ اس کے اندر حساسیت اور ذہانت یکجا تھیں۔ وہ اچھے برے رویوں کو بہت جلدی محسوس کر لیتی تھی۔ شاید والدین کی جدائی نے اس کو وقت سے پہلے سمجھدار بنا دیا تھا۔ مجھ سے بھی وہ بہت دیر بعد کچھ بے تکلف ہوئی۔

ماہ پارہ البتہ اس سارے عرصے میں جلبلاتی رہی۔ میں نے کسی سے بھی نانو کے ساتھ کیے وعدے کا ذکر نہ کیا تھا۔ وہ صرف نانو کے کمرے میں میرے دیر تک بیٹھنے پر معترض ہوتی تھی خود تو وہ بزرگوں کی کمپنی

سے کوسوں دور رہتی۔ نانو کو سلام کر کے نکل بھاگتی تھی۔ اسی لیے دیکھ نہ پاتی کہ اعتزاز انکل کی بیٹی سے میں کتنا اخلاص برت رہا ہوں۔

☆☆☆

پھر میڈیکل کالج کھلتے ہی زندگی ایکدم بہت مصروف سی ہوگئی۔ میں آدھا دن کالج میں گزار کر تھکا ہوا آتا پھر کھانا کھا کر سو جاتا۔ شام کو احد کے ساتھ مل کر کمبائن اسٹڈی کرتا۔ اور کچھ دیر فون پر گھر والوں سے بات کر کے سو جاتا۔ پھر اگلے دن وہی روٹین۔

نانو کی طرف جانا کم ہوگیا تھا۔ نانو بھی میری مجبوری سمجھتی تھیں سو زیادہ اصرار نہ کرتیں۔ کبھی کوئی مسئلہ ہوتا تو کال کر کے بلوا لیتیں۔ انزلنہ بھی پڑھائی میں مگن تھی سو میں مطمئن ہو کر اپنی روٹین میں لگا رہا کہ چھوٹی مامی کے ہاں بیٹی ہونے کی خوش خبری زندگی میں ہلچل مچا گئی۔

جلیل ماموں کے پورشن میں خوشی کا سماں تھا۔ مامی اسپتال سے گھر آچکی تھیں۔ میں، موحد اور احد بچی کو دیکھنے گئے۔ گل گوتھنی سی چھوٹی سی ہماری کزن۔ انزلنہ بھی وہیں موجود تھی۔ مامی کی گود میں لیٹی انشال کو پیار سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو چھوٹے بچے پسند ہیں؟" میں نے پوچھا تو اس نے سر ہلایا۔

"کبھی زبان کو بھی زحمت دیا کرو صرف سر ہلاتی ہو۔" میرے کہنے پر وہ جھینپ گئی۔

"یہ تو سارا دن گم صم بدھو کی طرح یوں خاموش رہتی ہے۔" دائم زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"کیوں انزلنہ۔ اس طرح کیوں کرتی ہو۔ ہنسا بولا کرونا۔" میں نے اس کے سنہری بال چھوئے۔

"ادھر آؤ نہال، دائم۔ یار انزلنہ سے دوستی کرو۔ اس کو اپنے گیم وغیرہ کھلاؤ، یہ اب آپ کی فیملی کا حصہ ہے۔" میں نے دونوں کو کہا تو وہ ہنسنے لگے۔

"یہ تو ہر وقت دادی کے پاس گھسی رہتی ہے۔" نمیر نے منہ بنا کر کہا۔

"بری بات، ایسے نہیں کہتے۔ آپ اس سے دور رہو گے تو یہ ایسا ہی کرے گی۔ گھر آپ کا ہے، یہ یہاں آئی ہے۔ اپنائیت کا احساس آپ کو دلانا ہے۔" میرے ٹوکنے پر وہ شرمندہ ہوا۔

"یہ خود ہی فرینک نہیں ہوتی ہے بالاج بھائی۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"اچھا ہر ویک اینڈ ہم گارڈن میں کرکٹ کھیلتے ہیں۔ یہ کھیلے گی؟" دائم نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں کھیلے گی۔" میں نے وثوق سے کہہ کر انزلنہ کو دیکھا۔ جو ہماری باتوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔

"کھیلو گی نا انزلنہ۔" میرے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر یاد آنے پر "جی ہاں" کہا۔ بچے ہنسنے لگے۔ مامی بچی کو تھپکتے ہوئے ہماری بے سروپا باتیں سن کر مسکرا رہی تھیں۔

☆☆☆

موسم نے ایک دم ہی نئی جھب دکھلائی تھی۔ سارا دن سرمئی بادل دن کو شام بنائے رکھتے۔ کالج میں بھی وقت شاندار گزرتا۔ گھر آکر تھوڑا بہت آرام کر کے ہم تینوں باہر گھومنے نکل پڑتے چونکہ ہمارے سمسٹر ختم ہوگئے تھے اور ماہ پارہ کے سمسٹر چل رہے تھے سو وہ ہمیں جوائن کرنے سے قاصر تھی احد اور موحد اس بات پر قدرے مطمئن تھے۔

ماہ پارہ جیسی ناک چڑھی لڑکی کو برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو مجھے بھی مستقبل کے ڈراوے دیتے تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے ماہ پارہ سے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا۔ وہ بچپن کی منگ تھی سو میں اس کو نارملی پسند کرتا تھا چونکہ دل کہیں اور لگایا نہ تھا سو جو ہے جیسے ہے کی بنیاد پر وہ مجھے قبول تھی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار مسلسل برس رہی تھی میں موحد اور احد ناشتہ کرنے کے ایک دوست کے فارم ہاؤس چلے آئے۔ وہاں سارا دن گزار کر ہم سہ پہر ڈھلے جب

www.pklibrary.com

واپسی کے لیے نکلے تو بارش موسلا دھار شکل اختیار کر چکی تھی۔

ہم ڈرائیو انجوائے کرتے شام پانچ بجے جب گھر پہنچے تو ایسا لگا جیسے رات ہو گئی ہو۔ کافی دیر ہارن بجانے کے بعد چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ میں تیزی سے گاڑی پورچ میں لے آیا۔ احد اور موحد تو جلدی سے اتر کر اندر چلے گئے۔ میں گاڑی کی کنڈیشن چیک کرنے لگا جس کو اب سروس کی اشد ضرورت تھی۔ جنریٹر کی بھدی آواز پر میں کان لپیٹ کر لان کی روش پر چڑھا۔

جلیل ماموں کا پورشن لان کی دوسری طرف تھا۔ سو بارش کی بوچھاڑ سے بھیگتا میں تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ تو دائیں طرف کسی انسان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ برستی برسات میں بینچ پر وہ کوئی بچہ ہی بیٹھا تھا۔ میں نے غصے کی لہر کو بمشکل روکا۔ یہ کوئی وقت تھا بارش میں نہانے کا۔ جبکہ ٹھنڈ بھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ میں سیدھا بینچ کی طرف آیا۔ قریب آنے پر انزلنہ کو وہاں بیٹھے پایا تو میرا غصہ سوا ہو گیا۔

"بے وقوف لڑکی اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو۔" میں نے اس کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"اندر چلو تو میں تمہیں بتاتا ہوں۔" میں اسے کھینچتا جلیل ماموں کے پورشن میں لے آیا۔ "اب بتاؤ کیا کر رہی تھیں وہاں۔" سیڑھیوں پر پہنچ کر میں نے اس سے سختی سے استفسار کیا۔ جواباً ہچکیوں سے رونا شروع ہو گئی تھی۔ سیور بلب کی روشنی میں اس کا گیلا لباس اور کانپتا وجود۔ مجھے کسی انہونی کا احساس ہوا اس کا بازو میرے ہاتھ میں دہک رہا تھا۔

"تمہیں تو شدید بخار ہو رہا ہے۔" میں گھبرا گیا اور اسے لے کر نانو کے کمرے میں چلا آیا۔ جو غالباً نیند سے ابھی اٹھی تھیں۔

"انزلنہ میری بچی۔ تو برسات میں کیوں گئی۔" وہ حیران سی ہو کر انزلنہ کو دیکھنے لگیں۔ میں نے الماری کھول کر انزلنہ کو اس کے کپڑے دیے۔ وہ کانپتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔

"آپ کے پاس بخار کی میڈیسن ہے۔" میں نانو کی دواؤں کو کھنگالنے لگا۔

"کیا انزلنہ کو بخار ہے۔ پاگل کیوں گئی کرکٹ کھیلنے ---" نانو کی بات پر میں چونک اٹھا۔

"یہ کرکٹ کھیل رہی تھی۔"

"ہاں دائم آیا تھا بلانے۔ میں عصر کی نماز پڑھ کر لیٹی تو نیند آ گئی۔" وہ پریشانی سے انزلنہ کو دیکھنے لگیں جو واش روم سے نکل کر اب اپنے بستر میں گھس رہی تھی۔

"یہ کھا لو۔" میں نے گولی اس کے منہ میں ڈال کر پانی کا گلاس اسے دیا۔ وہ جھٹ سے گولی نگل گئی۔ میں نے اس پر پاس پڑا کمبل ڈالا۔

"میرے سر میں درد ہے مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔" وہ لرزتی آواز میں بولی تو میرا غصہ عود کر آیا۔

"اور انجوائے کرو برسات کو۔ کرکٹ کھیل کے بچے واپس آ گئے تم وہاں بینچ سے چپک گئیں۔"

"ہم...... میں خود سے نہیں بیٹھی تھی۔ ماہ پارہ باجی نے مجھے پنش کیا تھا۔" انزلنہ نے سسکی بھری تو میں حیرت سے ساکت رہ گیا۔

"کیوں پنش کیا؟"

"ہم کرکٹ کھیل رہے تھے تو نیر بھائی نے غلطی سے گیند ماہ پارہ باجی کی کھڑکی پر مار دی۔ کھڑکی کے شیشے میں کریک آ گیا۔ وہ ہم پر بہت غصہ ہوئیں۔ انہوں نے دائم اور نیر بھائی کو آدھا گھنٹہ پنش میں بینچ پر کھڑا کیا اور مجھے کہا تم چار گھنٹے یہیں کھڑی رہو گی ورنہ تمہارا سر توڑ دوں گی۔" وہ روتے ہوئے بتانے لگی تو میں نے مٹھیاں بھینچ کر بمشکل اپنا غصہ کنٹرول کیا۔

"خدا ہی پوچھے گا ماہ پارہ سے۔ یتیم بچی کو اذیت پہنچا رہی ہے۔" نانو بھی تڑپ کر انزلنہ کے پاس چلی آئیں اور اس کو بانہوں میں بھر لیا۔

"ماہ پارہ اتنی سخت دل ہے۔ اس نے جان کر انزلنہ کو ٹھنڈ اور برسات میں کھڑا رکھا تاکہ یہ......" اس سے آگے کی سوچ میرا طیش بڑھا گئی۔

www.pklibrary.com

"بچی کے سارے بال گیلے ہو رہے ہیں۔" نانو نے اپنی چادر سے ازلنہ کا سر پونچھنا شروع کیا۔

"میں نے کہا تھا نا بالاج۔ یہاں اس کا کوئی سجن نہیں۔ سب دشمن ہیں۔" وہ دلسوزی سے بولیں تو میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ ازلنہ، نانو کے سینے پر سر رکھے ہلکے ہلکے سسک رہی تھی۔

"اس کا بخار نہیں اتر رہا اتنی دیر ہو گئی۔" نانو نے تشویش کا اظہار کیا تو میں نے ازلنہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو ابھی بھی دہک رہی تھی۔

"نانو دوا اثر کرتے کچھ وقت لیتی ہے آپ پریشان نہ ہوں۔" میری تسلی پر وہ مطمئن ہو گئیں۔ آدھے گھنٹے بعد تھرمامیٹر سے چیک کیا۔ ازلنہ کا بخار کم ہوا تھا میں نے نانو کو ان کے بستر پر واپس بھیج دیا اور ازلنہ کا سر تکیے پر رکھا۔

"آپ فکر نہ کریں میں یہاں بیٹھا ہوں۔ ازلنہ کا بخار پھر سے بڑھا تو دوا دے دوں گا۔ صبح تک اگر یہ ٹھیک نہ ہوئی تو اسپتال لے جاؤں گا۔" میں نے ان کو بھرپور تسلی دی تو وہ اپنے بیڈ پر چلی گئیں اور میں ازلنہ کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس کے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

ازلنہ بچی نیند میں بھی وقفہ وقفہ سے سسکاری بھرتی تھی۔ آنسوؤں کے نشانات ابھی بھی اس کے گلابی گالوں پر تھے۔ مڑی ہوئی لمبی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

میں بغور اس کے معصوم چہرے کو تک رہا تھا۔ اللہ نے اس لڑکی کو اتنا حسن دے کر نصیب سے تشنہ کر دیا تھا۔ والدین کی وفات کے بعد دوسروں کے رحم و کرم پر آ پڑی تھی۔ اس گھر میں جہاں زیادہ تر افراد کے دلوں میں اس کے لیے نفرت تھی، عناد تھا۔ میں سوچتے سوچتے نجانے کب غافل ہو گیا۔ نجانے کتنی دیر گزری کہ کسی نے نرمی سے مجھے ہلایا تھا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھولیں۔

"پیاس لگی ہے۔" ازلنہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر ڈسپنسر سے پانی بھر کر گلاس اس کو دیا۔ وہ غٹاغٹ پی گئی۔ میں نے اس کا ماتھا چھوا جو پسینے سے تر تھا۔

"شکر تمہارا بخار کنٹرول ہوا۔" میں نے ٹائم دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ چار گھنٹے سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے میں سویا ہوا تھا تو اب کمر اکڑ گئی تھی۔

"تم اب آرام سے سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں۔" میں نے تکیہ اٹھا کر صوفہ پر رکھا اور سیدھا لیٹ گیا۔ ازلنہ بستر سے اتر آئی اس کے ہاتھ میں کمبل تھا جو اس نے مجھ پر ڈال دیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"تھینک یو گڈ گرل۔" میں نے کہہ کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

دوسری صبح میں کالج سے سیدھا ماہ پارہ کے پاس چلا آیا۔ وہ شام کی چائے لان میں پی رہی تھی۔ ساتھ موحد اور احد بھی تھے۔

"تمہارے اندر ذرا سی بھی انسانیت ہے کہ نہیں۔" میں اس کے سر پر کھڑا سخت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

ماہ پارہ نے متحیر ہو کر مجھے دیکھا۔ احد اور موحد بھی چونک اٹھے۔

"کیا مطلب؟" وہ ابرو سکیڑ کر بولی۔

"کل شام کو موسلا دھار بارش میں تم نے ازلنہ کو چار گھنٹے کھڑے رہنے کی سزا دی۔ تم کیسی سخت دل لڑکی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اس ٹھنڈے موسم میں دیر تک بھیگنے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے کڑی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سرخ ہو گئی۔

"اچھا تو اب تم اس دو ٹکے کی لڑکی کے وکیل بن کر مجھ سے لڑنے آئے ہو۔" وہ اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ جما کر بولی تو مجھے طیش آ گیا۔

"اپنی لینگویج درست کرو۔ تم کو نہ بات کرنے کی تہذیب ہے، نہ انسانیت ہے۔"

www.pklibrary.com

"اوہ۔ تو اب تم مجھے سکھاؤ گے، مجھے کیسے بات کرنی ہے۔ بائی دا وے تم اچانک اس لڑکی کے ہمدرد کیوں بن گئے ہو۔" وہ چائے کا کپ میز پر پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں اس کا ہمدرد ہوں یا نہیں۔ تم اس معصوم بچی کی مکمل دشمن ہو۔ آئندہ اگر تم نے انزلنہ کے ساتھ کوئی بھی ایسی حرکت کی تو یاد رکھنا بہت برا ہوگا۔" میں نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

"تمہارا کیا واسطہ ہے انزلنہ سے۔ میں کچھ بھی کروں، میری......"

"تم اسے چھو کر تو دکھاؤ۔ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا پھر۔" میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ کر کہا تو موحد اور احد گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بالاج ریلیکس یار۔" موحد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔"

"ہاں کیا دو ٹکے کی لگا رکھا ہے۔ شرم نہیں آتی کسی انسان کے دام مقرر کرتے۔ تم خود کتنے ٹکوں کی ہو بتاؤ مجھے۔" موحد کا ہاتھ جھٹک کر میں اونچی آواز میں چیخا۔

"تم اتنی دیر سے میری انسلٹ کر رہے ہو۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے مسٹر بالاج! ہاں۔" وہ میرا کالر پکڑ کر مجھ سے اونچی آواز میں چیخی تھی۔

"بالاج۔ ماہ پارہ یہ کیا پاگل پن ہے۔" احد نے آگے بڑھ کر ماہ پارہ کے ہاتھوں سے میرا کالر چھڑوایا۔ موحد نے مجھے پرے دھکیلا، میرا تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ یہ دونوں درمیان میں نہ آتے تو شاید میں ماہ پارہ پر ہاتھ اٹھا دیتا۔

"چلو ماہ پارہ تم اندر جاؤ شاباش۔" احد نے ماہ پارہ کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا جو شیرنی بنی ہوئی تھی۔ موحد میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے پورشن میں لے آیا اور پانی کا گلاس تھمایا جو میں ایک ہی سانس میں پی گیا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے بالاج۔ اتنا غصہ کیوں دکھا رہا ہے۔" اس کے استفسار پر میں نے شکوہ بھری نظر اس پر ڈالی۔

"تو نے سنا نہیں ماہ پارہ نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ کیا کیا ہے۔"

"بالکل سنا۔ بہت بری حرکت کی ماہ پارہ نے اور اس کے رویہ کی وجوہات سے بھی واقف ہوں۔ لیکن تیرا جذباتی پن سمجھ میں نہیں آیا۔"

"کیا مطلب۔ وہ اس بچی کو نمونیا سے مارنے کا پلان کیے بیٹھی تھی، میں یہ دیکھ کر خاموش رہتا۔" میں نے چیخ کر کہا تو احد بغور مجھے دیکھنے لگا۔ "اتنے سارے خونی رشتے ہونے کے باوجود وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ ناتواں کمزور سہارا انزلنہ کو دنیا کے سرد و گرم سے نہیں بچا پائے گا احد۔ اسی لیے انزلنہ کی ذمہ داری میں نے لے لی ہے۔" میں نے بالآخر سچ کہہ دیا۔

"سوچ لے بالاج۔ بہت بھاری ذمہ داری اٹھا لی ہے۔" احد نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"سوچ لیا ہے احد! اور اب سے انزلنہ پر کسی نے نفرت کی نگاہ ڈالی تو میں وہ آنکھیں نکال دوں گا۔" میرے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ احد بالکل خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

پھر بہت دن ماہ پارہ مجھ سے خفا رہی لیکن میں نے اسے منانے میں پہل نہ کی۔ اس نے غلطی کی تھی اس کا احساس اسے ہونا چاہیے تھا۔ احد اور موحد نے اس بار پھر سے ہمیں دوستی کرنے پر مجبور کیا۔

ان دونوں کی ہی کوششوں سے ہم دونوں سب کچھ بھول کر بنا معافی تلافی من گئے تھے۔ میرا دل صاف ہو گیا تھا مگر ماہ پارہ کے دل میں گرہ پڑ چکی تھی۔ وہ اب مجھ سے کھنچی کھنچی سی رہتی۔ میں نے زیادہ پرواہ نہ کی۔ میڈیکل کی پڑھائی ایک بار پھر میری توجہ کی متقاضی تھی۔ سو میں اس میں منہمک ہو گیا تھا۔

انزلنہ اب مجھ سے اچھی خاصی بے تکلف ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی ہر بات اپنا ہر مسئلہ مجھ سے ڈسکس

www.pklibrary.com

کرتی تھی۔ میں نانو کے پاس جاتا تو خوش دلی سے میرا استقبال کرتی۔ بلکہ اب تو وہ خلیل ماموں کے پورشن میں بھی چلی آتی تھی۔ میں اور احد بھی کمبائن اسٹڈی کر رہے ہوتے۔ کبھی ٹی وی دیکھ رہے ہوتے یا میں موبائل میں مصروف ہوتا۔ وہ آکر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاتی۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ۔

کبھی ایسا ہوتا کہ میں اس کی طرف لحظہ بھر بھی توجہ نہ دیتا اور وہ اٹھ کر چپ چاپ وہاں سے چلی جاتی۔ پر دن میں ایک مرتبہ وہ آتی ضرور تھی۔ موحد اکثر ہنس کر کہتا۔

”بلاج! تمہاری فین روز تمہیں دیکھنے آتی ہے۔ جس طرح کسی سپر اسٹار یا کرکٹر کو دیکھا جاتا ہے اسی طرح تمہیں دیکھتی رہتی ہے۔“ میں اس کو دھپ مارتا تو وہ اور ہنستا۔

☆☆☆

انزلنہ کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈال کر نانو تو مطمئن ہو گئی تھیں لیکن میں بعض دفعہ مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ انزلنہ کے اسکول میں پی ٹی ایم ہوتی تو مجھے بہ طور گارجین جانا پڑتا۔

اس کی ٹیچرز مجھے دیکھ کر حیران ہوا کرتیں۔ وہ انزلنہ کے پیرنٹس کے ساتھ ہوئے حادثے سے واقف تھیں۔ لیکن اتنا ینگ گارجین ان کی سوچ کے برعکس تھا۔ جب وہ انزلنہ سے میرا رشتہ پوچھتیں تو میں خود گڑبڑا جاتا۔ انکل کہوں یا بھائی یا پھر کزن کیونکہ انزلنہ میرا نام لیتی تھی۔ نانو کے بارہا ٹوکنے پر بھی اس نے میرے نام کے ساتھ بھائی نہ لگایا بہرحال انزلنہ کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا۔ ہر ٹیچر اس کی تعریف کرتی نہ صرف وہ پڑھائی میں اچھی تھی بلکہ بہت باادب اور تمیزدار بچی تھی۔

میرا دل ان تعریفوں پر خوش ہوتا تھا۔ پھر انزلنہ کی شاپنگ بھی میرے سر تھی۔ اس کو ہر ماہ میں اپنے ساتھ لے جا کر کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں دلوا دیتا تھا۔

شروع میں وہ بنا نخرے میری پسند سے چیزیں لے لیتی تھی رفتہ رفتہ اس میں لڑکی پن انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور وہ مجھے شاپنگ مال کی ایک ایک دکان کا دیدار کروانے لگی۔

میں جو میڈیسن کی خشک پڑھائی سے بھنایا ہوا ہوتا۔ جی بھر کر بیزار ہوا کرتا۔ پر میری تھوڑی سی ڈانٹ پر جو اس کے نان اسٹاپ آنسو نکلتے تھے ان کے ڈر سے میں چپ چاپ اس کے ساتھ پھرتا رہتا۔

☆☆☆

وہ میرے میڈیکل کے چوتھے سال کا اختتام تھا۔ میں ایگزام سے فارغ ہوا تو صبح سویرے نانو کی طرف چلا آیا۔ نانو خلاف توقع سو رہی تھیں اور انزلنہ اس وقت اسکول جانے کی تیاری میں تھی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی سفید شلوار قمیص پر براؤن کلر کی چوڑی سی وی کندھوں پر پنوں کی مدد سے سیٹ کر رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے سلکی گولڈن شولڈر کٹ بالوں کی پونی بنائی۔

آئینے میں اپنا عکس دیکھتے اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ اچھل کر مڑی۔

”بلاج۔ آپ اتنی صبح صبح۔“ وہ خوشی سے مسکرائی۔

”ہاں بس فارغ تھا تو سوچا نانو سے مل آؤں۔“ میں نے اس کا کھلتا چہرہ دیکھ کر کہا۔

”چلیں آپ آ ہی گئے ہیں تو میرا ایک کام کر دیں۔ میری چوٹی بنا دیں۔“ وہ کنگھا لے کر میرے پاس آئی تو میں ہکا بکا رہ گیا۔

”چوٹی؟“

”ہاں چوٹی۔ وہ اصل میں نانو سے بنواتی ہوں پر وہ سو رہی ہیں نا۔“ انزلنہ میرے سامنے فرش پر پیٹھ پھیر کر بیٹھ گئی۔ میں جو صوفہ پر اطمینان سے بیٹھا تھا ایک دم سیدھا ہوا۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر کے مجھے کنگھا تھمایا جسے میں نے تذبذب میں پکڑا۔

”باندھیں نا۔“ وہ تھوڑا رخ موڑ کر بولی تو میں نے اس کے ریشمی بالوں کو اناڑی پن سے اپنے

www.pklibrary.com

دونوں ہاتھوں میں سمیٹا۔ پھر کنگھا پھیرنے لگا۔

"اُف۔ آپ تو کھینچ رہے ہیں کنگھی، آرام سے کریں۔" وہ چیخی تو میں گھبرا گیا۔

"انزی! تم خود کرو چوٹی۔" میں نے کنگھا اس کی طرف بڑھایا۔

"بالاج۔ مجھ سے چوٹی ڈھیلی ہو جاتی ہے نا۔ آپ کس کر باندھ دیں پلیز!" وہ ملتجی لہجے میں بولی تو میں نے موبائل پر گوگل کھولا اور چوٹی باندھنے کا طریقہ لکھ کر سرچ کیا۔ پل بھر میں کئی ویڈیوز سامنے آگئیں۔ میں نے ایک ویڈیو دیکھ کر آئیڈیا لیا اور کنگھا اٹھایا۔ انزلہ ترچھی ہو کر میری کارروائی دیکھتی رہی پھر مطمئن ہو کر دوبارہ پیٹھ پھیر لی۔

میں نے اس بار بالوں کو ہلکے ہاتھ سے سلجھایا اور تین حصوں میں بانٹ کر چوٹی کی شکل میں باندھ دیا۔ پھر چوٹی کے آخری سرے کو بینڈ سے جکڑا۔

"اب ٹھیک ہے۔" میں اپنی کارکردگی پر ستائش کا متمنی ہوا۔ وہ زمین سے اٹھ کر فوراً ڈریسنگ ٹیبل تک گئی اور تنقیدی نظروں سے خود کو دیکھنے لگی۔

"کیسی بنائی ہے۔" میں نے پھر پوچھا۔

"بس ٹھیک ہی ہے۔" وہ کچھ غیر مطمئن نظر آئی۔ میں خاموش سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر صوفے پر رکھا بیگ اٹھا کر کاندھے پر رکھا پھر میری سنجیدہ صورت دیکھی۔

"کھول کر واپس پونی باندھ لو۔" میں روکھا ہو کر بولا۔

"ارے اب اتنی بھی بری نہیں بنی۔ آپ کے ہاتھ سے بندھی ہے۔" وہ چوٹی کو پیار سے سہلا کر بولی تھی۔

"اُف میرے اسکول کا ٹائم نکل رہا ہے۔ اوکے بائے بائے۔"

پھر وہ گھڑی دیکھ کر چونکی اور بہ عجلت مجھے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں نے ایک بار پھر نانو کو دیکھا جو گہری نیند میں تھیں۔ اور وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

☆☆☆

پھر دو دن بعد ہی نانو کی طرف میرا چکر لگا۔

اماں نے ملازم کے ہاتھ خالص شہد اور سرسوں کا تیل بھیجا تھا۔ میں نانو کو دینے آیا تو حسب عادت نانو تسبیحات میں مشغول تھیں اور انزلہ اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوم ورک میں منہمک تھی۔

نانو گاؤں کی سوغات دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

"ملیحہ کو اللہ حیاتی دے۔ بڑی فرماں بردار بیٹی ہے میری۔ کل ہی ان چیزوں کا کہا آج بھجوا دیں۔" وہ خوش ہو کر بولی تو میں مسکرا دیا۔

"ادھر آؤ انزلہ! تمہارے سر میں تیل لگا دوں۔ بال کتنے روکھے ہو رہے ہیں۔" انہوں نے انزلہ کو مخاطب کیا جو ہوم ورک چھوڑ کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔

"نہ...... نہیں دادو۔ میرے بال ایسے ہی ٹھیک ہیں۔" وہ ایک دم بدکی تھی۔

"لو جھاڑ اٹھائے پھر رہی ہو۔ آؤ شاباش۔" وہ شیشی ہاتھ میں لے کر پچکارنے والے انداز میں بولیں پر انزلہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"بالاج! تم ہی کہو اسے۔ تیل لگوا لے۔ بہت ضد کرتی ہے۔" نانو نے مجھے دہائی دی۔

"انزلہ تیل لگوا لو۔" میں نے اس کے سنہری الجھے بال دیکھ کر کہا جو چوٹی سے نکل کر لٹوں کی صورت بکھر رہے تھے۔

"نہیں یونہی ٹھیک ہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا کر اپنی بکس پر جھک گئی۔ مجھے اس کی ضد پر حیرت ہوئی۔

"دو دن ہو گئے مجھ سے چوٹی بھی نہیں بنوائی۔ اس صبح آنکھ لگ گئی تھی۔ میں جان کر نہیں سوئی تھی۔" نانو نے جیسے صفائی پیش کی۔

"دو دن پہلے تو مجھ سے چوٹی کروائی تھی۔" میں نے ان کو بتایا۔

"تم سے؟ تم نے کیا چوٹی کی ہوگی۔" نانو ناک پر انگلی رکھ کر ہنسی تھیں۔

"آجاؤ بچی۔" انہوں نے ایک بار پھر انزلہ کو پچکارا۔

www.pklibrary.com

"انزی ضد مت کرو۔ بری بات ہے۔ آجاؤ شاباش۔" اس بار میں نے سختی سے کہا تو وہ بے بس سی ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی اور نانو کے بستر پر چلی آگئی۔

"آجا میری بچی۔" نانو نے اس کو پاس بٹھایا اور چوٹی کے بل کھولنے لگیں۔ انزلہ رونے جیسی ہوگئی۔

"چچ چچ...... اتنی بڑی ہو کر تیل لگوانے پر روتی ہو۔" میں نے مذاقاً کہا۔

"تیل لگوانے کی بات نہیں ہے۔" وہ دھیمی سی آواز میں کہہ کر خاموش ہوگئی۔

"پھر کیا بات ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

"مجھے یہ چوٹی نہیں کھولنی۔ آپ نے باندھی ہے نا۔" وہ روانی سے کہہ کر ایک دم چپ ہوگئی۔

"تو؟ میرے فکر پر نقش مٹانا نہیں چاہتیں۔" میں نے شرارتاً کہا تو وہ سر جھکا کر بیڈ شیٹ کو دیکھنے لگی۔

مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ پھر نانو سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے یہ احساس میرے ساتھ رہا۔

☆☆☆

وقت کی ریل اپنی رفتار سے منزل کی طرف گامزن تھی۔ میرے میڈیکل کے پانچ سال مکمل ہوگئے۔ احد بھی میرے ساتھ پاس آؤٹ ہوا تھا۔ ان ہی دنوں میری بہن کی شادی طے پاگئی اور اماں بہ طور خاص بھائیوں کو بلاوا دے کر گئیں کہ سب کو ضرور ہی آنا ہے۔

ویسے تو سب تیار تھے۔ لیکن چونکہ میرے گھر کی شادی تھی سو مجھے چودہ دن پہلے پہنچنا تھا۔ نانو لاڈلی نواسی کی شادی میں میرے ساتھ ہی جانے کو تیار تھیں۔

انزلہ کے میٹرک کے پیپرز ختم ہوگئے تھے سو وہ بھی فارغ تھی اور ہمارے ساتھ چلنے کو پُرجوش بھی۔ ہم تینوں گاؤں پہنچے تو بڑی حویلی میں خوب گہما گہمی تھی۔ سب نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مائدہ میری چھوٹی بہن گالوں پر گلال لیے شرماتی پھر رہی تھی۔ کھانے کے بعد فرصت سے مجھے گھیر کر بیٹھ گئی۔

"چاچو میں یسریٰ ہوں، یہ نمید ہے اور یہ سونی۔"

"ہاں ٹھیک ہے بس۔ میں پہچان گیا سب کو۔" میں نے ہاتھ کھڑا کر کے اپنی آٹھ سالہ بھتیجی کی چلتی زبان کو روکا۔ جو۔۔۔ تنے میرے سے سب بچوں کا تعارف کروا رہی تھی۔ میں چونکہ کم کم گاؤں کا چکر لگاتا تھا سو میرے ذہن سے بچوں کے نام محو ہو جاتے تھے۔ ہاں تعداد البتہ پوری یاد تھی کہ ان کے لیے تحائف لانے میں آسانی ہو۔

"مجھے تو سب بچوں کے نام ان کی شکلوں سمیت یاد ہوگئے ہیں۔" انزلہ نے نعرہ لگایا۔

"اب خوش ہو یسریٰ۔" اس نے یسریٰ کا اترا منہ دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس وقت روایتی طرز کے ہال کے بڑے پنگھے (لکڑی کا جھولا) پر بیٹھی پیر جھلا رہی تھی۔

میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا بچوں میں تحائف بانٹ رہا تھا۔

"آپ سب بچوں کو اپنے چاچو کا نام تو یاد ہے نا۔ بس یہی کافی ہے۔" میں نے تین سالہ روبی کے پھولے گال کو تھپتھپا کر کہا تو وہ کھلکھلائی۔

"ہاں۔ آپ بڑا چاچوں ہیں اور یہ چاچی انذلہ۔" روبی نے اپنی ننھی انگلی سے اشارہ کر کے توتلی زبان میں کہا تو ہم دونوں ہی چونک گئے تھے۔

"ارے نہیں روبی۔ یہ چاچی نہیں ہیں۔" یسریٰ نے آگے بڑھ کر بہن کو سمجھایا۔ میں نے بچی کی بے وقوفی پر ہنس کر سامنے نظر کی تو قد آدم آئینے میں میرا اور انزلہ کا عکس نظر آیا۔ وہ بھی آئینے میں مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

"چاچی۔ کتنا پیارا لفظ ہے نا۔" انزلہ کی آواز سرگوشی سے اونچی نہیں تھی۔ اب کی بار میں نے بے یقینی سے گردن موڑ کر براہ راست انزلہ کو دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر سادہ انداز میں مسکرائی تھی۔ خوب صورت چہرے پر شباب اور معصومیت کا عجیب سا امتزاج نظر آ رہا تھا۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا ہی رہا۔ مجھے وہ اچانک ہی بہت بڑی بڑی سی دکھائی دی تھی۔

☆☆☆

مائدہ کو شادی سے آٹھ دن پہلے مایوں بٹھایا گیا

اور ابٹن تیل کی رسم کے ساتھ چہرے پر گوٹے کناری سے مزین الکھیاں (ایک ریشمی کپڑا جس میں صرف آنکھیں ہی نظر آتیں) باندھا گیا۔ اب اس کو شادی کے دن تک یہ الکھیاں چہرے پر باندھے رکھنا تھا۔ انزلنہ بہت دلچسپی سے تمام رسوم دیکھ رہی تھی لیکن جس وقت چہرے پر الکھیاں بندھا وہ حیران سی ہوگئی یہ سن کر اس کی حیرت دوچند ہوئی کہ اب شادی کے دن تک مائدہ کو دن رات یہ کپڑا چہرے پر باندھے رکھنا تھا۔

"اف کتنی الجھن ہوگی مائدہ کو۔" وہ جھرجھری لے کر بولی تو سب ہنسنے لگیں۔

"کیوں الجھن ہوگی، شادی تک چہرہ گرد و غبار سے بچا رہے گا پھر جب یہ اتارے گی نا تم دیکھنا کتنی رونق ہوگی اس کے چہرے پر۔" بھابھی نے کہا تو انزلنہ نے بغور الکھیاں میں سے جھانکتی مائدہ کی آنکھوں کو دیکھا۔

"دلہن بننا آسان نہیں ہے انزلنہ بی بی!" بڑی بھابھی نے ____ آنکھ دبائی تو دونوں ہنسنے لگیں۔

"لیکن اس میں سے کھانا پینا کتنا مشکل ہوگا۔" انزلنہ کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"ہو جاتا ہے بابا۔ اچھا تمہیں ہم دوسری طرح کا الکھیاں باندھیں گے جس میں دو کے بجائے تین سوراخ ہوں گے تاکہ تم آسانی سے کھانا بھی کھا سکو۔" بھابھی نے انزلنہ کو خود سے لگایا تو وہ شرما گئی۔

میں کسی کام سے ہال کمرے میں آیا تھا اور اب خالص عورتوں کی محفل میں ہوتی شوخ جملے بازی کو سن کر بے اختیار مسکرا رہا تھا۔

"میرے الکھیاں میں تین نہیں پانچ سوراخ رکھیے گا تاکہ میں کانوں میں ایئر فون ڈال کر میوزک بھی سن سکوں۔"

انزلنہ کے معصوم سے مطالبے پر محفل زعفران زار بن گئی۔ میں نے غلطی سے چہرہ نکال کر سامنے نظر کی۔ سوسی کی شلوار اور کڑھائی والی میرون قمیص میں ملبوس وہ چادر شانے پر ڈالے ہاتھ سے پراندہ جھلاتی انزلنہ کافی بے فکری سے مائدہ کے برابر میں بیٹھی تھی۔

روایتی سندھی لباس میں وہ اپنی گوری رنگت سبز آنکھوں اور سنہری بالوں سے "مغربی حسن مشرقی لبادے میں" کی مکمل تفسیر لگ رہی تھی۔ آس پاس بیٹھی گندمی رنگت اور کھڑے نقوش والی پرکشش لڑکیوں سے بالکل مختلف "ویسٹرن بیوٹی"۔

میں یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

"اب خیر سے بالاچ کی شادی ہوگی نا تو تمہارے مشورے پر ماہ پارہ کو عمل کروائیں گے۔ اس کے الکھیاں میں ایئر فون کے لیے بھی سوراخ دیں گے۔" درمیانی بھابھی نے قہقہہ لگایا تو انزلنہ کے چہکتے مسکراتے چہرے پر ایک دم تاریکی چھا گئی۔ اس نے ایک دم مجھے دیکھا تھا۔ اس کی سبز آنکھوں میں نمی سی ابھری تھی۔

"کیوں بالاچ۔ میں نے صحیح کہا نا۔" بڑی بھابھی نے اونچی آواز میں مجھ سے تصدیق چاہی۔ میری نظریں انزلنہ پر جمی تھیں۔ صبح صادق جیسے پرنور چہرے پر رات کے سائے بہت برے لگ رہے تھے۔

"ارے ماہ پارہ سے یاد آیا۔ کب آرہی ہے بہو رانی۔ شادی کے دن پہنچے گی کیا۔" درمیانی والی بھابھی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو میں نے بمشکل انزلنہ سے نظر ہٹائی اور بنا کوئی جواب دیے کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اس رات مجھے عجیب بے چینی رہی۔ کروٹ پر کروٹ بدلتا میں کسی سوچ سے فرار کی سعی کرتا رہا۔ زندگی میں بعض دفعہ اچانک ہی آگہی کے در کھل جاتے ہیں یوں کہ بندہ اذیت کے پل صراط سے گزرنے لگتا ہے۔ ایک نرم گرم سا جذبہ دل کے نہاں خانے میں کہیں برسوں سے پل رہا ہوتا ہے اور آپ بے خبر ہوتے ہیں۔ اس جذبے کو محبت کی کھاد اور احساس کا پانی چپکے چپکے سے مل رہا ہوتا ہے اور آپ کو پتا ہی نہیں چلتا۔ پھر ایک دن وہ جذبہ جب تناور درخت بن کر آپ کے وجود سے اپنی شاخیں نکالنا

شروع کر دیتا ہے تب آپ گھبرا جاتے ہیں اور کسی طریقے سے اس جذبہ کی نفی کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور اب مجھے اس جذبہ کی نفی میں ہلکان ہونا تھا کیونکہ اس کو قبول کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔

☆☆☆

شہر سے ماموؤں کی فیملیز آ پہنچی تھیں۔ احد موحد نے آتے ہی رونق لگا لی۔ وہ ڈھولکی پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے اور اپنی بے سری آوازوں کا جادو جگانے لگے۔ "لونگ چھوڑ تھالی میں آوں کھیوں پئی اچان (لونگ الائچی تھالی میں میں لے کر آ رہی ہوں) راڑل کنجی اگ میں آوں نچیو پئی اچان (شہزادی میرے آگے ہے میں ناچتی آ رہی ہوں)"

موحد نے تان لگائی تو سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

"گانے کی صنف تو دیکھو۔ لڑکیاں گاتی ہیں یہ گانا۔"

کزن نے شرم دلائی تو موحد خاموش ہوا۔

"اچھا۔ پھر یہ سنو۔ ہو جمالو جیکو کبھی آیو خیر سان ہو جمالو۔" وہ اٹھ کر لڈی ڈالنے لگا تو احد اور نہال نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"او ڈاکٹر آ جا ہمیں جوائن کر۔" موحد نے مجھے گھسیٹا تو میں نے بازو چھڑا لیا۔

"نہیں یار۔ میرا موڈ نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے معذرت کر لی۔

"ہیں۔ تو ہی تو اس پنڈال کا ہیرو ہے پگلے۔ مامدہ کا اکلوتا کنوارہ بھائی۔ باقی تو اپنی بیویوں کے عتاب کے مارے ہیں۔ کہاں انجوائے کر سکتے ہیں۔"

موحد کی بات پر بھابیاں احتجاجاً شور مچانے لگیں۔ میں ان کو بحث کرتا چھوڑ کر چپکے سے دالان میں نکل آیا۔ کھلے آسمان میں چودھویں کا چاند روشنی بکھیر رہا تھا۔ ستاروں کے جھرمٹ جا بجا کالے آکاش پر موتیوں کی طرح ٹکے ہوئے تھے۔ میں مبہوت ہو کر یہ منظر دیکھنے لگا۔

"بالاج۔" دفعتاً مجھے کسی نے شانہ ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں یہ لمس اور آواز لاکھوں میں پہچانتا تھا۔

"یہ دیکھیے بالاج۔ مول نے مجھے کیسی پیاری مہندی لگائی۔" انزلنہ نے اپنی گوری ہتھیلی میرے آگے کی جس پر مہندی کے خوب صورت گل بوٹے بنے تھے۔

"اچھی لگ رہی ہے نا؟" اس نے اصرار کیا تو میں نے چاند سے نظر ہٹا کر اس پر ٹکا دی۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں انزلنہ کا صبیح گول چہرہ دمک رہا تھا۔ سبز ساحر آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ بھری بانہیں اور متناسب سراپے نے اس کو مکمل لڑکی کا روپ بخش دیا تھا۔ میں نے بے اختیار نظریں چرائیں۔

"ہاں اچھی ہے۔" میری تعریف پر وہ کھل اٹھی۔

"تھینک یو بالاج۔ میرے لیے سب سے قیمتی آپ ہیں اور آپ کے منہ سے نکلا ہر لفظ۔" وہ اٹھلا کر بولی تو میں خاموش رہا۔

"ویسے یہاں آ کر آپ بھی ان ٹریڈیشنل ڈریسز میں بہت جچ رہے ہیں۔" انزلنہ کا اشارہ میرے شلوار قمیص پہننے کی طرف تھا۔

"اور یہ اجرک آپ کو اتنا سوٹ کرتی ہے بالاج! کہ میرا دل چاہتا ہے آپ ہر وقت اسے اوڑھ کر رکھیں۔" اس نے میری اجرک کو ہاتھوں سے سہلایا پھر اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ مجھے جیسے کرنٹ سا لگا۔ اس کے چمک دار بالوں سے اٹھتی مہک میرے ہوش اڑانے لگی تھی۔

"انزلنہ!" میں نے اپنی کیفیت سے گھبرا کر جھٹکے سے اسے دور ہٹایا تو انزلنہ نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

"اب تم بڑی ہو گئی ہو انزی۔ اس طرح بچیوں والا بیہیویر ٹھیک نہیں ہے۔" اس کی سبز آنکھوں میں اترتے موتی دیکھ کر میں کچھ نرم پڑا۔

"آپ نے مجھ سے ایسے کیوں بات کی بالاج؟ آپ نے مجھے تحقیر سے پرے دھکیلا ہے۔"

www.pklibrary.com

وہ بھرائی آواز میں کہہ کر بے دردی سے اپنے آنسو صاف کرتی اندر کی طرف دوڑ گئی۔

''اوہ میرے خدا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔'' میں نے شرمندگی سے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر کافی دیر بے چینی سے میں وہیں ٹہلتا رہا۔

آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نانو کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں نانو کے ساتھ ازنلہ ٹھہری ہوئی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ نانو بیڈ سے ٹیک لگائے عشاء کی نماز کے بعد کے وظائف میں مشغول تھیں۔ میں نے ان کے برابر والے بیڈ پر نظر کی جہاں چادر میں لپٹی ازنلہ اوندھی ہو کر سو رہی تھی ایک بازو پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا۔

میں دھیرے دھیرے اس کے بیڈ کے پاس آیا اور جھک کر اس کا بازو اٹھا کر احتیاط سے بیڈ پر رکھا تو اس کی کلائیوں میں پڑی کانچ کی چوڑیاں بج اٹھیں۔ پھر میں نے چادر میں سے جھانکتے اس کے ادھ کھلے چہرے پر نظر کی۔ سنہری بالوں کی لٹیں اس کے گیلے گالوں سے چپکی ہوئی تھیں اور پلکیں نیند میں بھی لرز رہی تھیں۔ غالباً وہ روتے روتے سوئی تھی۔

میرے دل کو کسی نے زور سے دبایا۔ اس کے بال پیچھے کر کے میں نے اس کا سر تکیہ پر رکھا۔

''پتا نہیں آج جلدی کیسے سو گئی ہے۔ ورنہ تو جب سے آئی ہے آدھی رات تک سب کے ساتھ دھما چوکڑی میں شامل رہتی ہے۔''

نانو نے تسبیح ایک طرف رکھتے اظہار خیال کیا۔

''یہ بازو لٹکا کر اوندھا ہو کر سونے کی عادت اس کی بہت بری ہے، کئی بار ٹوک چکی ہوں پر نیند میں پھر اوندھی ہو جاتی ہے۔'' انہوں نے ازنلہ کو محبت سے دیکھ کر کہا۔

''کب تک اس کے سرہانے آ کر تم تکیہ رکھتے رہو گے۔'' پھر ہنس کر بولیں تو میرے دل میں آیا کہہ دوں ''ہمیشہ'' لیکن پھر سختی سے خود کو ٹوکتا ان کے پاس آ بیٹھا۔

''کل سے اس کی سگی چاچیاں بھی آئی بیٹھی ہیں۔ پر رویہ ایسا ہے کہ بچی کو جانتی ہی نہ ہوں۔ بھابھی حیات ہوتیں تو شاید خون جوش مارتا۔ یہ تو نانو جذبات سے عاری پتلے ہیں۔ میں نے بھی زیادہ توجہ نہیں دلائی ازنلہ کی طرف۔ بچی پہلے ہی رشتوں کی ترسی ہوئی ہے وہ خوامخواہ کوئی ایسی ویسی بات بول دیتیں تو دل پر لے لیتی۔''

نانو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو میری شرمندگی میں اضافہ ہوا۔

''یہاں آ کر بہت خوش ہے۔ ہنستی بولتی گڑیا لگتی ہے۔ اللہ نصیب بھی اس کی صورت کی طرح خوب صورت کرے۔''

''آمین۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''یہ بھی اچھا ہے میرے پاس آ گئی۔ اچھا کھا پکا رہی ہے۔ اچھا پڑھ رہی ہے۔ میں نے ایک فلیٹ اور کچھ زمین، زیور اس کے نام پر رکھ دیے ہیں۔ آگے کا کسی کو کیا معلوم۔ دعا ہے کوئی بہت محبت کرنے والا ساتھی اس کو نصیب ہو جو بچی کی محرومیوں کا ازالہ کر دے۔''

نانو دھیمی آواز میں کہتی رہیں۔ میں سنتا رہا۔ اور ایسا تو اکثر ہوتا تھا۔ ہم دونوں مل بیٹھتے تو ازنلہ کی باتیں کیا کرتے۔ اس کا ماضی اس کا حال اور اس کا مستقبل۔

☆☆☆

دوسری صبح میں دیر سے اٹھا۔ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے سر دکھ رہا تھا۔ کچن میں آیا تو احد اور موحد ناشتا کر رہے تھے۔

''آجا شیر! ناشتا کر۔'' احد نے قیمہ پراٹھا کھاتے آفر کی۔

''نہیں۔ شمسہ بوا ایک کپ چائے بنا دو۔'' میں تھکا تھکا سا کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے بالاج۔ کچھ اپ سیٹ دکھ رہا ہے۔'' احد نے تشویش سے پوچھا تو میں سنبھل کر سیدھا ہوا۔

''بس یار! بے آرامی بہت ہے۔''

www.pklibrary.com

"کیسی بے آرامی، بستر پر کھٹمل گھس آئے ہیں کیا؟" موحد نے ٹھٹھا لگایا تو احد بھی مسکرانے لگا۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" ماہ پارہ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں جمائی لیتی کرسی پر آ بیٹھی۔

"گڈ مارننگ کزن۔ تمہیں تو نیند اچھی آئی نا۔" موحد نے پوچھا تو ماہ پارہ تعجب سے دیکھنے لگی۔

"ہاں کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔ شمسہ بوا مجھے دو گلاس اور نمکین لسی چاہیے۔" موحد نے چائے رکھتی شمسہ بوا کو کہا تو وہ سر ہلاتی ہٹ گئی۔

"خدا کو مان موحد بھابھی کی بنائی ساری لسی تو پی گیا ہے۔" احد نے اسے آنکھیں دکھائی۔

"کبھی کبھار تو خالص چیز ملتی ہے یارا اور بڑی بھابھی کی بنائی لسی ختم ہوئی تو کیا چھوٹی بھابھی دوسری بنا لیں گی۔" وہ ماہ پارہ کو دیکھ کر بڑی تیزی سے مسکرایا۔

"کسی بھول میں مت رہنا، میں تمہیں چار جوتے مار سکتی ہوں لسی نہیں پلا سکتی۔" ماہ پارہ فوراً بات سمجھ گئی۔

"اپنے سرتاج کا دل جیتنے کے لیے ہی سیکھ لو کچھ۔ ہمارا بالاج کتنا خوش خوراک ہے اور تمہیں سوائے اسپیگھٹی کے کچھ بنانا نہیں آتا۔" موحد نے اسے شرم دلائی۔

"میں کوئی باورچن نہیں، نہ ہی گاؤں میں رہنے والی کم تعلیم یافتہ لڑکی۔ جس کو پکانے کے سوا کچھ نہ آتا ہو۔" وہ تمسخر سے گردن اکڑا کر بولی تو میں نے لب بھینچ لیے۔

"اور بائی دا وے۔ مجھے بالاج کے دل میں اترنے کے لیے ان اسٹوپڈ چیزوں کی ضرورت نہیں میں آل ریڈی اس کے دل میں ہوں۔" وہ میز پر رکھے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی تھی۔

"جسٹ اسٹاپ اٹ یار۔ پہلے ہی میرا سر درد کر رہا ہے پھر تم لوگ فضول بحث میں لگے ہو۔"

میں ماہ پارہ کے ہاتھ کو جھٹک کر بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تینوں مجھے استعجاب سے دیکھنے لگے اور میں وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا۔

☆☆☆

شادی کا دن بہت گہما گہمی والا تھا۔ مختلف روایتی رسومات نے اس یادگار دن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ نکاح کے بعد دولہا دلہن کو فرش پر بچھے ریشمی لال گدے پر ایک دوسرے کے سامنے بٹھا دیا اور ایک آئینہ دونوں کے درمیان رکھ دیا گیا۔ پھر ایک زرتار دوپٹہ ان کے اوپر ڈالا گیا تاکہ وہ نکاح کے بعد باقاعدہ میاں بیوی کے طور پر ایک دوسرے کے عکس آئینے میں دیکھ سکیں۔

پھر لائیوں کی رسم شروع ہوئی (لائیوں میں رشتہ دار اور احباب آ کر دلہن دلہا کا سر تین بار ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ کچھ منچلے یہ عمل زور سے کرتے ہیں جس کی وجہ سے سروں پر چوٹ لگنے کے خدشے کے پیش نظر ایک خاتون اپنا ہاتھ ان کی پیشانی کے بیچ میں رکھ دیتی ہے)

بڑی بوڑھی خواتین کے بعد نوجوان لڑکے لڑکیوں کی باری آئی تو احد فوراً آگے آیا اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے ہاتھ دلہن دولہا کے سروں پر رکھے۔ شرارت اس کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ جیسے ہی اس نے سر ٹکرائے بھابھی نے اپنا ہاتھ درمیان میں رکھ دیا۔

"بھابھی یہ فاؤل ہے۔" احد جھنجھلایا۔

"ہاں جی تم ان کے سر پھوڑ دو، میں ہاتھ بھی نہ رکھوں۔" بھابھی چمک کر بولیں تو وہ بدمزہ ہوا اور بے دلی سے رسم کر کے پیچھے ہٹ گیا۔

"انزلنہ اب تم آؤ۔" بھابھی نے آواز لگائی تو ایک طرف بیٹھی انزلنہ کھڑی ہوئی اور دھیرے سے چل کر قریب آئی۔ میں نے اس کے ستے ہوئے چہرے کو بغور دیکھا۔ پیازی رنگ کے سندھی کڑھائی والے سوٹ میں اس کی سنہری رنگت دمک رہی تھی۔ سبز آنکھوں میں کاجل کے ساتھ اداسی کے رنگ رچے تھے۔ اس نے آہستہ سے مائدہ اور عزیر کا سر ٹکرایا۔

"ازلنہ۔ ذرا زور لگاؤ۔ جان نہیں ہے کیا ہاتھوں میں۔" احمد نے اکسایا۔
"کیوں احمد اپنی ناکامی کا بدلہ بچی کے ہاتھوں لینا چاہتے ہو۔" بھابھی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ ازلنہ نے دوسری بار بھی ہلکا سا ٹکرایا۔
"بھئی مزہ نہیں آرہا۔ یہ اتنا ہلکا ہاتھ کس کا ہے۔" اس بار دولہا چیخا تو سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہوا۔
"اسے دیکھو مزہ چاہیے۔"
"تو اور کیا انجوائے کرنے ہی بیٹھے ہیں۔" احمد پھر شیر بنا۔ ازلنہ رسم کر کے دور ہٹی تو میں اپنی جگہ سے رسم کرنے اٹھا۔ وہ الٹے قدموں پلٹ رہی تھی میں اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا اچانک اس کا پیر کسی چیز سے الجھا اور وہ توازن کھو کر پیچھے کی طرف گرنے لگی میں نے فوراً اس کو بانہوں میں تھام لیا۔ ایک نرم گرم سا احساس میرے وجود سے لپٹ کر دل تک آ پہنچا۔ میں نے اس کو بزور خود سے الگ کیا اور اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ مگر وہ یک دم رخ موڑ کر لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتی وہاں سے چلی گئی۔ چند لمحوں کی بات تھی جس نے میرے اندر برسوں کی قیامت برپا کر دی تھی۔ میں نے بے دلی سے رسم پوری کی اور اس شور شرابے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

مائدہ کی شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی لیکن میں ایک کشمکش لے کر شہر لوٹا تھا۔ میرا دل کسی بچے کی طرح ایک ہی خواہش میں اٹکنے لگا تھا۔ میں جتنا دل کو روکتا وہ اتنا ہی بضد ہوتا۔ میں دن بدن چڑچڑا اور بد مزاج سا ہوتا جا رہا تھا۔ جو مجھ سے بات کرتا پچھتاتا۔ امی ابو بھی میرے رویے سے پریشان ہو گئے۔ انھوں نے بارہا میرے رویے کی وجہ جاننا چاہی پر میں ٹال جایا کرتا۔
ازلنہ جو مجھ سے کئی سال چھوٹی تھی۔ جو کل تک میری ذمہ داری تھی۔ میں جس کو ایک بچی کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ اب کیسے اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کو دیکھنے کی اور دیکھتے ہی رہنے کی طلب مجھے ہر دم بے چین رکھتی۔ اس کے وجود سے نظریں ہٹانا دنیا کا مشکل ترین کام لگتا۔ اس کی سبز ساحر آنکھوں میں ڈوب جانے کو دل کرتا تھا۔ میں اپنی اس کیفیت سے گھبرا کر گھر سے باہر نکل آتا اور گاڑی بے وجہ سڑکوں پر دوڑاتا پھرتا۔

☆☆☆

ہاؤس جاب کمپلیٹ کرتے ہی میں نے ایف آر سی ایس کرنے کے لیے ملک سے باہر جانے کو پر تو لے۔ میں نانو کو اپنا ارادہ بتانے آیا تھا۔ وہ میری بات سن کر کچھ دیر کو خاموش رہ گئیں۔
"جاؤ بیٹا خیر سے اللہ کی امان میں۔" پھر دھیمی آواز میں بولیں۔
"دادو! یہ سوپ پی لیں۔" اتنے میں ازلنہ کمرے کے اندر داخل ہوئی پھر مجھے دیکھا تو ٹھٹک گئی۔
"ازلنہ! بالاج بیٹا مزید پڑھنے ملک سے باہر جا رہا ہے۔" نانو کی بات پر ازلنہ کے ہاتھوں میں سوپ کا پیالہ لرزا۔
"اچھا......" وہ نانو کے دوسری طرف آ بیٹھی۔ اتنے دنوں سے میرے سرد رویے نے اس کو سنجیدہ سا کر دیا تھا۔
"ایف آر سی ایس کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔
"کتنے عرصے کے لیے؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔
"دو سال۔ شاید اس سے زیادہ۔" میں نے نظریں چرائے جواب دیا۔
"اللہ بخت بلند کرے جہاں جاؤ کامیابی سمیٹو۔" نانو دعا دے کر سوپ پینے لگیں۔
"کل رات دادو کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ خلیل انکل شہر سے باہر ہیں، میں نے آپ کو بہت کالز کیں لیکن آپ نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔" ازلنہ

www.pklibrary.com

نے شکوہ کیا تو میں نے چونک کر نظر اٹھائی۔ وہ نانو کو میڈیسن کھلا رہی تھی۔ میں کرسی سے اٹھ کر نانو کے سامنے جا بیٹھا۔

"کیا ہوا تھا آپ کو۔"

"ارے ایسے ہی سانس کا مسئلہ تھا۔ بچی خوامخواہ پریشان ہو جاتی ہے۔" نانو نے ہنس کر کہا۔

"میرا یہاں آپ کے سوا ہے ہی کون دادو۔ آپ کے لیے پریشان نہ ہوں تو کس کے لیے ہوں۔" ازلنہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی سبز آنکھوں سے جھلکتی شکایت مجھے جلانے لگی۔ میں نے نگاہیں پھیر لیں۔

"بالاج بیٹا اس کو آج کل وہم کی بیماری ہو گئی ہے، رات کو بار بار اٹھ کر میرا سانس چیک کرتی ہے کہ زندہ ہوں یا مر گئی۔" نانو کا انداز مزاحیہ لیکن لہجہ شکستہ تھا۔ میری نظریں پھر ازلنہ پر اٹھیں۔

"اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔" میں نے نانو کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

"کیا کرنا ہے لمبی حیاتی کا بیٹا۔ بس جو آخری فرض سانسوں پر دھرا ہے اس کے لیے مہلت چاہیے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ازلنہ کو دیکھنے لگیں۔

"اچھا نانو! چلتا ہوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"جانے سے پہلے مجھ سے ملنے ضرور آنا۔"

"ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ ضرور آؤں گا۔" میں نے الوداعی نظر ان پر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ الوداعی نظر سدا کے لیے الوداعی بن جائے گی اور میں اپنی نانو کو دوبارہ کبھی سانس لیتے، باتیں کرتے نہیں دیکھ پاؤں گا۔

وہ رات ان کی فانی دنیا میں آخری رات ثابت ہوئی۔ ایک قیامت تھی جو ہم سب پر ٹوٹی تھی۔ کتنی خاموشی سے وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر دل غم سے لبریز تھا۔ سارا خاندان جمع ہو گیا تھا۔ سب کو نانو سے پیار ملتا تھا شفقت ملی تھی۔ ہم لڑکے دل کا غم دبا کر تعزیت کرنے والوں کی نشست و برخاست کے انتظامات میں مشغول رہے۔

نانو کا سوئم بھی گزر گیا۔ میں فرصت پا کر ان کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں ہر طرف ان کی خوشبو بکھری تھی۔ میں ان کے بستر پر بیٹھ کر بھیگی آنکھوں کے ساتھ یہ خوشبو محسوس کرتا رہا۔ میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

آنسو صرف عورت کی میراث نہیں ہوتے دکھ کی گھڑی میں مرد کی آنکھوں میں بھی چلے آتے ہیں۔ دفعتاً میری نگاہ دائیں جانب زمین پر بیٹھی ازلنہ پر پڑی۔ جو نانو کے بیڈ پر بازو بچھائے ان پر اپنا سر رکھ کر اداس بیٹھی تھی۔

"زندگی نے ہمیشہ میرے بہت اپنے مجھ سے چھین لیے۔ پہلے میرے ممی پاپا اور اب نانو......" وہ بھرائی آواز میں بڑبڑائی تھی۔ میں نے ساکت ہو کر اسے سنا۔ میں اپنے دکھ میں بھول گیا کہ ازلنہ کا دکھ مجھ سے بڑا ہے۔ میری دنیا سے نانو چلی گئی تھیں۔ لیکن اس کی تو دنیا ہی نانو سے تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ازلنہ کی طرف چلا آیا۔

"ازلنہ۔ اٹھو شاباش۔" میں نے اس کے سنہری بکھرے بالوں کو چہرے سے ہٹایا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے۔

"آپ جائیں یہاں سے۔ مجھے آپ کی ہمدردی نہیں چاہیے۔" اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ازلنہ۔ آئی ایم سوری۔ مجھے معاف کر دو۔" میں اس کے ساتھ زمین پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

"آپ مجھے اپنے سرد رویے کی مار نہ ماریں بالاج۔ ایک ہی بار گلا دبا کر مجھے مار دیں۔ ویسے ہی اب دادو بھی نہیں رہیں تو میں جی کر کیا کروں گی۔" وہ میرا کالر پکڑ کر بولی۔

"میں ہوں نا ازلنہ۔ میں ابھی زندہ ہوں تو...... تم کیسے مر سکتی ہو؟" میرے کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"آپ ہی تو ہیں۔ میرے ہر طرف۔ میرے

www.pklibrary.com

دل میں۔ میری روح میں۔ میری سوچوں میں۔"
اس نے جذباتی ہو کر کہا تو مجھے جھٹکا لگا۔

"مجھے آپ سے محبت ہے بالاج! ہم...... میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں زندگی بھر۔ آپ کی بن کر۔" وہ بھیگے لہجے میں بولتی میرے ہوش اڑا گئی۔

"نانو کے بعد بھری دنیا میں اب میرے اپنے صرف ایک آپ ہیں بالاج۔ آپ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جایئے گا میں مر جاؤں گی سچ میں مر جاؤں گی۔" وہ میرے بازو کو سختی سے دبوچ کر بولی۔

اس سمے میرا دل چاہا ازنلہ کو اپنے دل کے اندر یوں چھپا لوں کہ دنیا کا ہر دکھ باہر رہ جائے۔

"ازنلہ۔" میں نے دل کی خواہش دبا کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"پلیز خود کو سنبھالو۔"

"نہیں آپ وعدہ کریں کہ آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔" وہ اور شدت سے میرے قریب ہوئی۔ میرے اندر قیامت سی برپا ہوگئی۔

"ازنلہ۔ میرا امتحان مت لو۔" میرا دل کرلایا۔

چھوٹی مامی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ میں فرش سے اٹھ کر خوامخواہ اپنی پینٹ جھاڑنے لگا۔ جبکہ ازنلہ کی سوالیہ نظریں میرے ساتھ اوپر اٹھی تھیں۔

"سب ٹھیک تو ہے۔" مامی نے ازنلہ کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔ نانو کو یاد کر رہے تھے ہم دونوں۔" میں نے سانس بھر کر کہا۔

"ہمم...... اماں اب کس کو بھولیں گی۔ بہت شفیق اور نرم دل ساس تھیں میری۔" مامی چھوٹے قدم اٹھاتی بیڈ کے پاس آئیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ اگر بتیاں تھیں جو وہ جلا کر سائڈ ٹیبل پر رکھ رہی تھیں۔

"ازنلہ! تم بجائے رونے کے سپارے پڑھ کر ان کے ایصال ثواب کی دعا کرو۔ اس طرح تمہارا دل بھی ہلکا ہوگا اور اماں کی روح کو بھی آرام ملے گا۔"

مامی نے ایک گہری نظر ازنلہ پر ڈال کر مشورہ دیا۔ جو ابھی بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مسلسل یک ٹک۔ میں مامی کے سامنے خفت سی محسوس کرنے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں مامی۔ ازنلہ! تم رو رو کر ان کی روح کو تکلیف دے رہی ہو۔ اب اٹھو ادھر سے شاباش۔ اوپر بیٹھو۔" میں نے نرمی سے اس کا بازو پکڑا تو وہ چپ چاپ اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں اب بھی مجھ پر تھیں۔

"تمہیں احد ڈھونڈ رہا ہے بالاج!" مامی نے کہا تو مجھے اس سچویشن سے نکلنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

"اوہ۔ اچھا۔" میں نے کمرے سے باہر آنے میں دیر نہ لگائی۔ پھر سارا دن میرے ذہن میں ازنلہ کا کھلا اعتراف اور اس کے الفاظ گونجتے رہے۔

یہ چھوٹی سی لڑکی کس سفر پر چل نکلی ہے۔ جہاں صرف خار ہی خار ہیں۔ میں نے اذیت سے سوچا۔ اپنے دل کی آواز سے تو میں بھاگ ہی رہا تھا اب مجھے ازنلہ کی باتوں سے بھی دامن چھڑانا تھا۔ یہ میرے لیے دہری اذیت تھی۔

☆☆☆

زندگی ایک دم پھیکی اور بے رنگ سی ہوگئی تھی۔ نانو کے جانے سے سب ہی اداس تھے۔ لیکن قانون قدرت ہے کہ وقت کے ساتھ ہر زخم بھر کر خشک ہو جاتا ہے اور حال کی اذیت ماضی کی کسک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سو آہستہ آہستہ سب اپنی روٹین کی طرف واپس آ گئے۔ ازنلہ نے بھی کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ بہت اداس رہنے لگی تھی اور واپس اپنے آپ میں سمٹ گئی تھی۔ جیسے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اظہار کر تو لیا پھر اس کا مثبت جواب نہ پا کر بددل ہوگئی ہو۔ میں بھی تو کترانے لگا تھا اس سے۔ صرف انتہائی ضرورت کے وقت اسے مخاطب کرتا اور یہ مخاطب کرنا بھی قیامت ہوتا وہ میری

www.pklibrary.com

طرف ایسی شاکی نظروں سے دیکھتی کہ میں شرمندہ سا ہو جاتا۔

چھوٹی مامی نے خلاف توقع ماموں کے جانے کے بعد اس سے تغافل نہ برتا تھا۔ ویسے بھی اتنے سالوں ساتھ رہنے سے وہ گھر کی ایک فرد لگنے لگی تھی۔ مامی کے چاروں بچے اس کے بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔

وہ مزاج کی بھی بہت اچھی اور کام سے نہ گھبرانے والی لڑکی تھی۔ مامی کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹاتی اور گھر کی ذمہ دار بیٹی کی طرح رہتی تھی۔ میرا ایف آر سی ایس کے لیے باہر جانے کا پلان ہنوز تھا۔ انزلنہ کی طرف سے یہ اطمینان تھا کہ مامی اب اس کو بیٹی کی طرح رکھے ہوئے تھیں۔ سو میرے تین چار سال کے لیے باہر جا کر رہنے سے اس کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ ماموں نے اس کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تھی اور قدرت نے اس کی محبت میرے دل میں ڈال دی۔ میں دونوں سے ہی دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ سو جس دن ویزا لگا میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

☆☆☆

بڑے ماموں کی بات تھی یا دھماکہ میں کچھ دیر کو سن رہ گیا۔

”بیٹا! ماہ پارہ تمہاری منگ ہے اب اتنے برس کے لیے باہر جا رہے ہو تو نکاح کر کے جاؤ۔ ہمیں بھی اطمینان رہے گا۔“ انہوں نے سکون سے کہہ کر میرا سکون غارت کر دیا۔

”ماموں میں واپس آ جاؤں پھر شادی کروں گا۔“ میں نے اپنی بے چینی چھپا کر کہا۔

”اتنا عرصہ ہم بیٹی کو بچپن کی منگ پر بٹھا کر رکھیں۔ کوئی پکا رشتہ تو ہونا چاہیے۔ دنیا کو کیا معلوم کہ وہ تمہاری زبانی منگ ہے۔“ وہ میرے گرد جال کسنے لگے تھے۔

”اتنے برس بھی تو رہتی آ رہی تھی میری منگ بن کر۔“ میں نے دل میں سوچا۔ کہہ نہ سکا۔

”فیملی گیدرنگ رکھ لیتے ہیں۔ نکاح بھی ہو جائے گا اور اکٹھے ہنس بول بھی لیں گے۔ اماں کے بعد تو جیسے سب اپنے میں مگن ہو گئے ہیں۔“ وہ پروگرام طے کیے بیٹھے تھے۔

”نہیں ماموں۔ دنیا کو بتانا ضروری ہے تو آپ باقاعدہ منگنی رکھ لیجیے۔ باقی نکاح رخصتی ایک ساتھ ہی ہو گی۔“ میرے لہجے میں ضد سی تھی۔

ماموں کتنی دیر مجھے دیکھتے رہے۔

”اوکے پھر ہوٹل کی بکنگ وغیرہ کروا کر فنکشن ارینج کر لیتے ہیں۔“ وہ جیسے ہار کر بولے تھے۔

میرا دل اس بات پر بھی ڈوب کر ابھرا تھا۔ اگر میری محبت کسی اور طرف رخ نہ کرتی تو میں اس فیصلے پر ضرور مطمئن ہوتا مگر اب عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ گھر میں فوراً منگنی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اداس ماحول میں جیسے تازگی کی ہوا ابھر گئی۔

ماہ پارہ تو آسمانوں پر محو پرواز لگتی تھی۔ اگرچہ ہماری بات چیت کزنز کی طرح ہنوز برقرار تھی مگر منگیتروں والی گرم جوشی اور جذبات میری طرف سے مفقود تھے اور ماہ پارہ تو تھی ہی فطرتاً نک چڑھی۔ وہ چاہتی تھی بس میں ہی اس کے نخرے اٹھاؤں جو میں نے کبھی نہیں اٹھائے تھے۔ اس بات سے وہ نالاں رہتی تھی مگر اب ایک طرح سے مجھے زنجیر ہوتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔

میری نیلی بھی گاؤں سے شہر آ پہنچی۔ بابا والوں نے اپنا بنگلہ کھول کر اس میں قیام کیا۔ میں بھی وہیں آ گیا۔ مجھے انزلنہ کا سامنا کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ جو اپنا دل کھول کر بیٹھ گئی تھی اور میں جو اپنے جذبوں کی نفی میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

منگنی کا فنکشن شہر کے بہترین ہوٹل میں تھا اور انتظامات بہت اعلا کیے گئے تھے۔ ماہ پارہ بھی مہنگے ترین لباس اور میک اپ میں اچھی لگ رہی تھی اس کا پرغرور انداز دیدنی تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھی وہ اترا اترا کر سب کو دیکھ رہی تھی۔

رسم کے بعد میں فوٹو سیشن کروا کر اسٹیج سے اتر

آیا اور احد وغیرہ کے ساتھ آبیٹھا۔ کس گیدرنگ تھی۔ میں نے نظریں گھماتے کسی کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔

"ازلنہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا تو احد نے کندھے اچکائے۔

"نمیر! ادھر آؤ، ازلنہ کدھر ہے؟" اس نے پاس سے گزرتے نمیر کو پکڑا۔

"وہ بیمار ہے۔ آپ کو نہیں پتا اس کو بہت تیز بخار ہوگیا ہے، اسی لیے وہ گھر پر ہے۔" نمیر نے بتایا تو مجھے جھٹکا سا لگا۔

"کیا...... اسے بخار ہے اور وہ گھر میں اکیلی پڑی ہے تم سب یہاں آگئے ہو۔" میں بے چینی سے کھڑا ہوگیا۔

"نویدہ ماسی کو اس کے پاس چھوڑ کر آئے ہیں۔" نمیر کہہ کر چلا گیا۔ میں نے کار کی چابی اٹھائی اور قدم آگے بڑھائے۔

"ارے تو کہاں جارہا ہے بالاج! تقریب چھوڑ کر۔" موحد نے مجھے پکارا لیکن میں ان سنی کرتا کار میں آبیٹھا۔ گھر پہنچ کر میں تیز قدموں سے چھوٹی مامی کے پورشن کی سیڑھیاں چڑھتا اوپر نانو کے کمرے میں آیا۔ جہاں سامنے ہی بیڈ پر ازلنہ نڈھال پڑی تھی اور نویدہ ماسی کرسی پر اونگھ رہی تھی۔ میں دھیمے قدموں سے چلتا اس کے سرہانے کھڑا ہوگیا۔ ازلنہ کا گلاب چہرہ بخار کی حدت سے تپ رہا تھا الجھے بال پونی سے نکل کر بکھرے ہوئے تھے وہ بے چینی سے سر ادھر ادھر پٹخ رہی تھی۔

"ازلنہ!" میں نے بے قراری سے اسے پکارا تو اس نے اپنی نیم وا آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کئی آنسو پلکوں سے بہہ نکلے۔

"ازلنہ کیا ہوا ہے تمہیں۔ اتنا بخار کیوں چڑھا لیا۔" میں نے اس کے سنہری بال سنوارتے کہا۔

"دوا کھلائی ہے بالاج بابا۔ لیکن بخار پھر بھی نہیں اتر رہا۔" میری آواز پر نویدہ ماسی چوکس ہوئی۔

"مجھے میڈیسن دکھاؤ جو دی ہے اور کتنا وقت ہوا کھلائے۔" میرے سوال پر اس نے گولیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"جی گھنٹہ بھر ہوگیا ہے۔ بی بی دے کر گئیں تو میں نے کھلادیں۔" اس نے مامی کا حوالہ دیا۔

"ہمم......" میں نے اٹھ کر سائیڈ کے خانے سے میڈیسن باکس نکالا اور کچھ اور ٹیبلٹس نکالیں۔

"ازلنہ! اٹھو شاباش، یہ کھالو۔" میں نے اس کو کندھوں سے پکڑ کر تکیہ سیدھا کرکے بٹھایا۔ وہ بالکل نڈھال ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ میں گولی ڈال کر پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کرکے پی گئی۔

"ٹھیک ہو جاؤ گی ان شاء اللہ۔" میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کمبل درست کیا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ میں ہمدردی اور محبت سے اسے دیکھتا رہا۔ آج نانو حیات ہوتیں تو وہ اتنی تنہا نہ ہوتی۔ اچانک میرا سیل بجنے لگا۔ اسکرین پر ماہ پارہ کالنگ لکھا آرہا تھا۔ میں نے سیل واپس رکھ دیا۔ کال مسلسل آرہی تھی فون کٹتا پھر بجنا شروع ہو جاتا۔

"آپ چلے جاؤ تقریب میں۔ میں ادھر ہوں صاحب۔" نویدہ ماسی آخر بول اٹھی۔

"نہیں ماسی۔ ازلنہ کو اس حالت میں چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے موبائل آف کرکے رکھ دیا۔ ماسی تعجب سے مجھے دیکھتی رہی۔ ایک گھنٹے بعد ازلنہ کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوگئی تھی۔ اس کی حرارت میں کافی فرق آیا اور چہرے کی سرخی بھی کم ہوئی تھی۔ میں اس کو کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔ وہ کسمسائی تھی پھر اس نے قدرے ہوش میں آکر مجھے دیکھا میں مسکرادیا۔

"بھوک لگ رہی ہو تو کچھ کھالو۔ سلائس وغیرہ۔" میں نے پوچھا تو اس نے لب بھینچ لیے۔

"آپ اپنی منگنی چھوڑ کر یہاں کیوں آئے۔ مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ چلے جائیں یہاں سے۔" بھرائی آواز میں بولی تو میں ٹھہر رہ گیا۔

www.pklibrary.com

”انزلنہ۔ تم ریلیکس رہو۔ پلیز۔“

”نہیں چاہیے نا آپ کی ہمدردی نکل جائیں میرے کمرے سے۔“ وہ نحیف آواز میں چلائی تو میں نے خفت محسوس کی۔

”انزلنہ پلیز۔ ابھی تو سنبھلی ہو۔“

”میں کبھی نہیں سنبھل سکتی بالاج۔ کبھی نہیں۔ آپ ماہ پارہ کے پاس جائیے۔“ وہ میری بات پر بھڑک اٹھی، میں نے ماسی کو دیکھا جو بہت کچھ سمجھنے کی کوشش میں تھی۔ میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا اور سر پکڑ کر لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

”تم فنکشن سے منہ اٹھا کر یہاں چلے آئے اور وہاں تمہارے نام کی ڈھنڈیا مچی ہوئی ہے۔“ احد کی آواز پر میں نے سر اٹھایا۔

”یہ حد نہیں ہوئی ویسے۔ محفل جس کے نام تھی وہ اڑن چھو ہو گیا، پیچھے اس کٹ کھنی بلی کو ہمیں سہنا پڑ رہا۔ چچی نے روک رکھا ہے ورنہ اسی ٹائم تمہاری کلاس لینے آ رہی تھی۔“ وہ میرے برابر میں بیٹھ گیا۔

”انزلنہ کی طبیعت خراب تھی احد!“ میں نے جیسے اسے جتایا۔

”ادھر کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہے، ماسی کی اپنی اولاد بخار سے پھنکتی تو کیا اسے چھوڑ کر وہ پارٹی میں چلی آتیں۔“ میری بات پر احد چپ چاپ دیکھتا رہا۔

”تا تو نے مجھے ذمہ داری سونپی تھی انزلنہ کی اور......“

”تا تو نے تجھے ذمہ داری سونپنے کے بجائے تجھے انزلنہ کا ہاتھ دے دیا ہوتا تو اچھا تھا۔“ احد کی بات پر میں متحیر رہ گیا۔

”کیا بات کر رہا ہے یار۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ اس وقت تو وہ بچی تھی۔“ میں نے کہا تو احد نے مجھے تاسف سے دیکھا۔

”ماہ پارہ تیری اس ذمہ داری کو چٹکیوں میں اڑا دے گی۔ اسی لیے میری بات مان۔ اس ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لے۔ دوسری صورت میں اس کو اپنا لیتا تا۔“ احد کی باتیں مجھے چونکا رہی تھیں۔

”احد! آج کیا ہو گیا ہے یار تجھے۔ کیسے مشورے دے رہا ہے۔“

”ایسے ہی تیرا مستقبل سوچ کر خیال آ گیا۔ جس سے تو شادی کر رہا ہے وہ تو صاف انزلنہ کی دشمن ہے، اب تو اسے چن چکا تو بس بھول جا انزلنہ اور ذمہ داری وغیرہ کا ٹنٹنا۔ ورنہ زندگی اجیرن کروانے کو تیار ہو جا۔“ احد نے سانس بھر کر کہا تھا۔ اب خاموش ہونے کی میری باری تھی۔

”تو باہر جا رہا ہے اچھا ہی ہے ایک طرح سے۔ انزلنہ کو تیرے بغیر جینے کی عادت ہو گی۔ اس کو دنیا کا اکیلے مقابلہ کرنا ہے بالاج۔ دادو کے جانے کے بعد یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ خود سے جینا سیکھے۔ شادی کے بعد تو اسے کسی قسم کی سپورٹ نہیں کر سکتا، یہ چیز جتنی جلدی وہ سمجھ جائے بہتر ہے۔“ احد کی باتیں میرا دل چیر رہی تھیں۔

میں وہاں سے اٹھ کر سیدھا اپنے بنگلے پر چلا آیا اور اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ گھر والے نجانے کب لوٹے۔ میں مگر ساری رات ماہ پارہ سے منگنی پر پچھتاتا رہا۔

☆☆☆

صبح اماں بابا نے میری اچھی خاصی کلاس لی۔ بھائی الگ بھرے بیٹھے تھے۔ میری آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اسی لیے میرا اپنی طبیعت خرابی کا بہانہ کارگر گیا کہ سب کو میرے ایکدم وہاں سے چلے آنے کی اصل وجوہات کا علم بھی نہ تھا۔ ماہ پارہ تمام ناراضی کے باوجود بھی مجھ سے لڑنے چلی آئی تھی۔

میں نے حسب سابق اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتی تھی میں ایسا ہی ہوں۔ نہ مناؤں گا نہ شرمندہ ہوں گا۔ بہت دیر بک جھک کر کے وہ خود ہی واپس چلی گئی۔

دو تین دن کے لیے میں واقعی بیمار ہو گیا سر درد اور بخار۔ سو میری تیمارداری میں ہی سب اپنا غصہ بھول بھال گئے۔

اسی افراتفری میں میرے جانے کا دن بھی آپہنچا۔ میری رات دو بجے کی فلائیٹ تھی۔ احد، موحد اور ماہ پارہ مجھے سی آف کرنے ایئرپورٹ چل رہے تھے۔ میں بڑے ماموں سے مل کر چھوٹے ماموں کے پورشن میں آیا۔

مامی، ماموں اور ان کے بچوں سے مل کر الوداع کہا مگر ازلنہ نظر نہ آئی۔ میں نانو کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ بیڈ پر سر جھکائے اپنے رجسٹر پر کچھ لکھ رہی تھی میں اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

''ازلنہ۔'' اس نے میری آواز پر سر نہیں اٹھایا تھا۔ ''یہ اے ٹی ایم کارڈ اور بینک کے چیکس وغیرہ ہیں۔ میں نے تمہارے نام سے بینک اکاؤنٹ کھلوایا ہے۔ جب ضرورت ہو اس میں سے پیسے نکلوا لینا اور یہ لاکر کی چابی۔ اس میں تمہارے نام کے زیور نانو نے سنبھال رکھے تھے۔ یہ فلیٹ کے کاغذات جو نانو نے تمہارے نام کیا۔'' میں نے ایک ایک کر کے ازلنہ کی امانتیں اس کے آگے رکھنا شروع کر دیں۔

''اس کے علاوہ جب بھی کوئی مسئلہ ہو بے جھجک واٹس ایپ یا اسکائپ پر مجھ سے شیئر کرنا۔'' میں نے مزید کہا تو اس نے اپنا سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور زخمی نظروں سے دیکھتی ہی رہی۔ میں بے نا تا نرز ہونے لگا۔

''بہت بہت شکریہ۔ یہ احسانات میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' ازلنہ نے لٹھ مار انداز میں کہا تھا۔

''احسانات کیسے۔ یہ تو میرا فرض......''

''کیسا فرض مسٹر بالاج! آپ میرے لگتے کیا ہیں جو فرائض کی بات کریں۔'' اس کی آنکھوں سے چھلکتا غصہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس پر مستزاد مخاطب کرنے کا انداز۔ میں بے طرح بے چین ہوا۔

''نانو نے تمہاری ذمہ داری مجھے دی تھی اور......''

''اب نانو اس دنیا میں نہیں اور آپ جیسے جذباتی انسان کو کیا ذمہ داری نبھانی آئے گی جو اپنے ہی جذبات سے منہ چھپاتا پھر رہا ہو۔'' وہ تلخی سے بولی تو میں ساکت رہ گیا۔

''آج سے میں خود آپ کو اپنی ذمہ داری سے آزاد کرتی ہوں۔ مجھے اپنا اچھا برا اچھے سے سمجھ میں آگیا ہے اور اب میں بچی نہیں رہی۔'' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی ازلنہ مجھے ساکت کر گئی۔

''آپ جا سکتے ہیں۔'' وہ دوبارہ رجسٹر پر جھک گئی۔ میں کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں یہاں سے دور جا رہا ہوں ازلنہ۔ خدا حافظ بھی نہیں کہو گی۔'' میں نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا تو وہ استہزائیہ ہنسی۔

''ماہ پارہ باجی نے آپ کو بہتر طریقے سے خدا حافظ کہہ دیا ہو گا۔ میرے کہنے کی کیا ضرورت۔ آپ کے بہت اپنے آپ کے پاس موجود ہیں بالاج۔ آپ کی فکر کرنے کے لیے۔ آپ کو یاد کرنے کے لیے۔ ایسے میں ایک بے آسرا اور تہی دست لڑکی آپ کو یاد کرتی ہے یا نہیں اس سے آپ کو کیا فرق پڑے گا۔'' وہ بھرائے ہوئے لہجے میں کہہ کر ایک دم اٹھی اور بھاگتی ہوئی واش روم میں جا کر بند ہو گئی۔ اس کے الفاظ میرا دل چیر گئے۔

''ازلنہ پلیز دروازہ کھولو۔'' میں واش روم کا دروازہ تھپتھپانے لگا۔

''بالاج بھائی آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔'' مدبر کمرے میں آیا تھا۔ میرا دل ازلنہ کو یوں چھوڑ جانے پر راضی نہ تھا۔ پر فلائیٹ کا ٹائم ہونے والا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے ہٹ کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

میں بھاری دل سے انگلینڈ آ گیا۔ بوجھل دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتے ہمہ وقت ازلنہ کا اداس چہرہ نظروں کے سامنے رہتا۔ اس کی آواز اس کے الفاظ۔ میں کھل کر اسے یاد کرتا۔ یہاں نہ کسی کے چہرہ پڑھ لینے کی پریشانی تھی نہ دل کا راز افشاں ہو جانے کی فکر۔ میں نے خود سے مکرنا چھوڑ دیا تھا۔

ازلنہ میرے دل میں بسی تھی اس بات کا انکار کر کر کے میں تھک چکا تھا سو اقرار میں ہی عافیت تھی۔ میں نے ازلنہ کی تصاویر سے موبائل گیلری بھر رکھی تھی۔ یہ میری لاشعوری کوشش تھی اس کو قریب رکھنے کی۔ میں رات دیر تک ان تصاویر کو دیکھا کرتا۔ کیونکہ خود تو وہ نہ ویڈیو کال اٹینڈ کرتی نہ وائس کال۔ وہ مجھ سے متنفر ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ ماہ پارہ مجھے دن میں کئی مرتبہ میسج کرتی اور کالز ملاتی۔ میں کبھی جواب دے دیتا، کبھی نہ دیتا۔ احد موحد وغیرہ سے بھی زیادہ بات نہ کرتا۔ میں خود میں اتنا الجھ گیا تھا کہ کسی سے خوش گوار رابطہ رکھ نہیں پا رہا تھا۔ دانستہ میں نے خود کو پڑھائی میں مصروف کر لیا۔ اس طرح اذیت میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ دن پھر بھی کٹ جاتا مگر رات کاٹنے کو دوڑتی تھی۔

☆☆☆

وقت بڑا بے نیاز ہے۔۔ آپ کے دکھ سکھ کی پرواہ کیے بغیر گزر جاتا ہے۔ میرا بھی وقت گزر رہا تھا۔ میں یہاں ایڈجسٹ ہو گیا تھا۔ دل کی بے چینی میں بھی کچھ کمی واقع ہوئی تھی۔

پاکستان میں احد وغیرہ سے رابطہ اب بھی واجبی سا تھا۔ ماہ پارہ سے تو کبھی زیادہ بات کی ہی نہیں تھی۔ وہ میرا گریز بھانپ کر اب روٹھ گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے میرے لیے اچھا تھا۔ مجھے اب شدت سے احساس ہوتا کہ میں نے باقاعدہ منگنی کر کے ایک غلط فیصلہ لیا ہے۔ ازلنہ کے سوا میرے دل میں کسی کی جگہ نہیں بن سکتی۔ وہ نہیں تو کوئی نہیں۔ میں دانستہ سب سے کٹ گیا تھا۔ ایف آر سی ایس کے دو سال اسی طرح گزر گئے۔ مجھے ڈگری مل گئی اب وطن جانا تھا۔ لیکن میرا دل راضی نہ تھا۔ میں اس ان چاہے بندھن سے جڑ کر اذیت میں تھا اب یہ اذیت مستقل مجھ سے جڑ جانی تھی شادی کی صورت میں۔ سو میں چپکا بیٹھا رہا۔ پاکستان سے میری واپسی کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر کوئی اب اسی بات کے لیے بہ طور خاص فون کرتا کبھی میں اٹینڈ کر لیتا کبھی نہ کرتا۔ ایک دن بابا بغیر اطلاع کے آ گئے اور آتے ہی میری کلاس لینا شروع کر دی۔ میرا سب سے لاتعلق انداز۔ ماہ پارہ سے لاپرواہی۔ وغیرہ وغیرہ۔

”چاہتے کیا ہو آخر؟“ انہوں نے میری مسلسل خاموشی پر جھنجھلا کر پوچھا۔

”بابا میں ماہ پارہ سے اپنا رشتہ نبھا نہیں سکتا۔“ میں نے صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”کیوں؟ کسی اور کو پسند کر لیا ہے۔ ایسا ہی کرنا تھا تو اتنی دھوم دھام سے منگنی کیوں کی۔“ وہ اچھے خاصے برہم ہوئے۔ میں نے لب بھینچ لیے کیا کہتا پسند کوئی آج سے تو نہیں کیا۔ برسوں کی سلگتی آگ کو ہوا ملنے کی دیر تھی وہ بھڑک اٹھی۔۔۔ اور اسی آگ کے پھیلتے شعلوں سے گھبرا کر میں ایک اور آگ میں کودا تھا۔۔ پر اب میرا پچھتاوا ناقابل برداشت تھا۔ بابا میری چپ سے نجانے کیا سمجھے۔

”یوں منہ چھپا کر بیٹھنے سے مسائل بڑھتے ہیں کم نہیں ہوتے بالاج۔ وہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس سے ملواؤ۔ پھر دیکھتے ہیں کچھ۔ زور زبردستی کے رشتوں کا میں قائل نہیں۔“ بابا نے رسان سے کہا تھا۔ میرے چہرے کی بے بسی اور کشمکش ان کو پگھلا رہی تھی میں جوان کا چھوٹا لاڈلا بیٹا تھا۔ میں اور بے چین ہو گیا۔

”بابا مجھے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔“ میں نے پست لہجے میں کہا۔

”ہمم...... “ بابا سوچ میں پڑ گئے۔ پھر وہ اسی خاموشی سے دو دن رہ کر واپس چلے گئے اور میں اس بے چینی کا سدباب کرنے کو ایک اور ڈگری کے حصول میں لگ گیا۔

☆☆☆

دو سال مزید اسی خاموشی سے گزر گئے۔ میں اپنی ذات میں کچھ اور سمٹ گیا پیچھے والوں سے رابطہ کچھ اور کم ہوا۔

احد کی شادی میں بھی پاکستان نہیں گیا۔ تو وہ باقاعدہ مجھ سے ناراض ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دل کی کچھ

باتیں شیئر ہو جاتی تھیں اب وہ بھی نہ ہوتیں۔ موحد آسٹریلیا چلا گیا تھا۔ باقی کسی سے میں اتنا فرینک نہیں تھا۔

ازلنہ کو دیکھنے کی چاہ روز بروز شدت پکڑتی جارہی تھی۔ اکثر آدھی رات کو میری آنکھ کھل جاتی اور میں دیر تک اس کی یاد میں جاگتا رہتا۔ دن میں بھی ہر وقت وہ ذہن پر سوار رہتی۔ وہ کامرس میں بیچلرز کر رہی تھی احد نے اپنی شادی سے پہلے اطلاع دی تھی اب تو غالباً اس کا بیچلرز مکمل ہو گیا ہوگا۔ میں دل میں اندازے لگاتا۔ اس شام کو میں واکنگ اسٹریٹ پہ چہل قدمی کرتے ہوئے ازلنہ کو ہی سوچ رہا تھا اور یونہی سورج ڈھل گیا۔

رات کا کھانا میں اکثر کسی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ سے کھا لیتا تھا، اس وقت بھی ایک ریسٹورنٹ میں جا کر ریسپشن پر آرڈر دینے کھڑا ہو گیا۔ چونکہ یہاں سیلف سروس تھی سو نمبر کی چٹ لے کر سامنے لگے مانیٹر پر اپنا آرڈر نمبر دیکھا لگا جو جس آیا چاہتا تھا۔ وقت گزاری کو میں پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے مخصوص یونیفارم میں ملبوس خوش اخلاق لڑکے لڑکیوں کو آرڈر وصول کرتے دیکھنے لگا کہ ریسپشن کے پیچھے بنے ایک دروازے کو کھول کر باہر آتی لڑکی کو دیکھ چونک اٹھا۔ اس نے بھی مخصوص یونیفارم کے ساتھ سر پہ کیپ پہنی ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے کچن سی کاؤنٹر پہ آئی اور ٹرے رکھی۔ میں پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ازلنہ......“ میری حیران آواز پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی۔

”ازلنہ تم یہاں۔“ میں ایک دم قریب آیا اور وہ فوراً واپس پلٹ کر اسی دروازے میں غائب ہو گئی۔ میں بے قرار ہو گیا کاؤنٹر درمیان میں نہ ہوتا تو میں اس کے پیچھے جاتا۔

”ویری ایکسکیوزمی۔ آئی وانٹ ٹو ٹاک مس ازلنہ۔ شی از مائی کزن پلیز ٹیل ہر۔“ میں نے قریب کھڑی ایک لڑکی سے کہا۔

”اوکے۔“ وہ سر ہلاتی اندر چلی گئی۔ ”سوری سر۔ شی ڈونٹ وانٹ ٹو ٹاک ود یو۔“ تھوڑی ہی دیر میں وہ جواب لے کر واپس آئی۔

”اٹس اوکے۔“ میں اپنا آرڈر لے کر اپنی میز پر آ گیا۔ دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی آنکھوں دیکھے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ازلنہ پاکستان سے ادھر کب اور کیوں آئی؟ کسی نے مجھے بتایا کیوں نہیں اور ادھر اتنی معمولی جاب کرنے پر اسے کس نے مجبور کیا۔ سوال تھے جیسے قیامت۔ مجھ سے چند نوالے مشکل لیے گئے۔ میں جانتا تھا وہ مجھ سے نہیں ملے گی سو میں ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا اور کچھ دور ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

رات گہری ہونے لگی شور و غل ماند پڑا۔ فضا میں خنکی بھی بڑھتی رہی۔۔ میں جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اب ٹہلنے لگا تھا۔

ازلنہ کچھ لڑکیوں کے ساتھ ریسٹورینٹ سے نکلی۔ میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکیاں کچھ آگے جا کر اپنی راہ بدل گئیں۔ وہ اکیلی پیدل چلتی رہی۔ لانگ کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے سر ڈھکے اس قدر ٹھنڈ میں وہ چلتی جارہی تھی۔ میں نے قدموں کی رفتار تیز کی اور تقریباً دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔

”ازلنہ۔“ میری آواز پر وہ ذرا سا چونکی پھر بھی سر جھکائے چلتی رہی۔

”ازلنہ......پلیز میری بات سنو۔“ میں نے اس کا بازو پکڑا تو وہ جھٹکے سے رکی۔

”ہاؤ ڈیئر یو ٹچ می۔ یہ پاکستان نہیں ہے مسٹر۔ یہاں میری ایک کال پر آپ تھانے میں ہوں گے۔“ اس نے درشتی سے کہہ کر اپنا بازو میرے ہاتھ سے آزاد کیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ اس کا اجنبی لہجہ میرا دل چیر گیا تھا۔

”اوہ۔ او کے ہاتھ نہیں لگاتا۔ پر میری بات تو سن لو۔ پلیز۔“ میں نے مصلحتاً نرمی سے کہا۔

www.pklibrary.com

"مجھے آپ سے کچھ کہنا سننا نہیں۔" وہ ایک بلڈنگ کے سامنے رک گئی تھی۔ انٹرنل لاک کھولا اور تیزی سے اندر چلی گئی پیچھے اسی تیزی سے گیٹ بند ہوا۔ میں ہکا بکا اس دو منزلہ عمارت کو دیکھتا رہ گیا۔

اس کی ماں کا تعلق لندن سے تھا اور وہ یقیناً اپنے ننھیال آگئی تھی مگر اس کو ادھر بھیجنے کی اجازت کس نے دی۔ اور ننھیال میں آکر اس سے یہ بیگار کیوں کروایا جا رہا تھا۔ کیا وہ اتنی ارزاں تھی کہ اسے یوں رول دیا گیا۔ میری شریانیں سوچ کی شدت سے پھٹنے لگیں۔

"تم تھے نا اس کے گارجین۔ نانو نے اس معصوم کی ذمہ داری تمہیں دی تھی نا۔ اپنی ذمہ داری کو سنگ دلوں کے سپرد کرکے یہاں منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ تو اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔"

میرے اندر سے کوئی بولا تو میں شرمندگی کی اتھاہ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

گھر آکر میں نے اسی وقت اسکائپ پر احد کو کال ملائی۔ میرا بی پی حد درجہ بڑھا ہوا تھا سو اس کے کال اٹھاتے ہی میں پھٹ پڑا۔

"احد تم لوگوں سے ایک بچی نہ سنبھالی گئی۔ دادو کے جاتے ہی اسے اور بے آسرا کر دیا۔ کس نے حق دیا تم لوگوں کو انزلنہ کے متعلق فیصلہ لینے کا۔ وہ میری ذمہ داری ہے نا۔ مجھ سے پوچھے بغیر اسے اس کے ننھیال کے حوالے کر دیا تم لوگوں نے!" میں سرخ چہرہ لیے اس پر چڑھ دوڑا جو ویڈیو کال پر جیسے میرے روبرو ہی موجود تھا۔ وہ میری بات پر چند لمحے خاموش ہو گیا۔

"بالاج...... تو تو اس کی ذمہ داری سے دستبردار ہو گیا تھا نا۔ تین سال سے باہر بیٹھا ہے۔" پھر وہ سرد سی آواز میں بولا۔ "باقی رہی بات اس کے متعلق فیصلہ لینے کی تو یہ فیصلہ خالص اس کی مرضی پر ہوا۔ اس کے ماموں اس سے ملنے آئے اور انہوں نے اس کو لے جانے کی بات کی۔ وہ ایک دم راضی ہو گئی۔"

"مامی نے اور میں نے بہت سمجھایا لیکن چار پانچ ماہ کے عرصے میں اس نے اپنی ضد تبدیل نہ کی۔ وہ بچی نہیں جو ہم اس کو پکڑ کر بٹھا لیں۔ آخر اس کی ضد سے ہار کر ہم نے اسے جانے دیا کہ بہرحال ہم اس کے سگے رشتوں سے بڑھ کر نہیں ہیں۔"

اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ہاہ۔ سگے رشتے جنہوں نے آج تک پلٹ کر خبر نہیں لی اس کی۔ اچانک کہاں سے پیار جتانے چلے آئے اور میں نے آج اسے جس حالت میں دیکھا ہے میرا دل تڑپ اٹھا ہے۔ نانو کیا سوچتی ہوں گی کہ میں نے ان کے وعدے کا پاس نہیں کیا۔ میں نے ان کی پیاری انزلنہ کو رلنے کے لیے چھوڑ دیا۔" میں ٹیبل پر ہاتھ مار کر بولا تھا، میرے لہجے میں پچھتاوے تھے۔

"اچھا تو اب بھی مرے جا رہے ہو اس دو ٹکے کی لڑکی کے پیچھے۔ اس کے ساتھ برسوں کی ہمدردی چلی آ رہی ہے تمہاری۔ مجھ سے منگنی تو مارے باندھے کی۔ اصل میں تو وہ چڑیل تمہیں اپنے حسن کا دیوانہ بنا چکی ہے۔" اچانک اسکرین پر ماہ پارہ نمودار ہوئی اور غصے سے بولی۔ میں چونک گیا۔

"تڑپ رہے ہو اس کی محبت میں۔ دیوداس بن بیٹھے تھے۔ اب خوشی ملی ہو گی وہ تمہارے پاس پہنچ گئی۔ کتنی ہوشیار لڑکی ہے پتا چلا تم انگلینڈ میں ہو تو ملاقاتیں کرنے چلی گئی۔ یہاں بھی ہر وقت اس کو خود سے لگائے رکھتے تھے نا۔ اب وہاں بھی۔"

"ماہ پارہ جسٹ شٹ اپ۔" میں اس کی بے لگام زبان پر زور سے چلایا۔

"کیوں برا لگ رہا ہے؟" وہ پھنکاری۔

"یہ احد بیٹھا ہے نا تمہارا رازدار۔ اسی نے راہیں نکالی ہیں تمہاری معشوقہ کو تم تک پہنچانے کی۔" ماہ پارہ کے الزام پر احد حیرت زدہ رہ گیا۔

"میں ابھی اور اسی وقت تم سے اپنی منگنی ختم کرتی ہوں۔" ماہ پارہ نے اپنی انگلی سے منگنی کی

www.pklibrary.com

انگوٹھی اتار کر وہ بے رحم پر پھینکی۔

"اس ناگن کی ماں نے میری خالہ کی جان لی اور یہ میرا نصیب چھیا رہی ہے۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں خالہ کی طرح موت کو گلے لگالوں گی میرے لیے لڑکوں کی کمی نہیں۔ میں تف بھیجتی ہوں تم پر اور تمہاری اس ہونی سوتی پر۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں کہہ کر کال ہی کاٹ گئی۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے روز میں پھر اسی ریسٹورینٹ میں موجود تھا۔ آج میں اپنا آرڈر لے کر خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھ گیا تھا۔ انزلنہ بے نیازی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ لینے کے باوجود انجان تھی۔ میں مسلسل اس کو نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ شام گہری ہو کر رات میں تبدیل ہو گئی۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے۔ آخر کلوزنگ کا وقت آن پہنچا۔ میں باہر نکل کر ٹہلنے لگا۔ انزلنہ ریسٹورنٹ سے نکلی۔ آج وہ اکیلی باہر نکلی تھی۔ اور ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس آیا اور اسی کی طرح تیز چلنے لگا۔ اس نے اچانک اپنے قدم روک لیے۔ میں بھی رک گیا۔

"کیا چاہتے ہیں آپ۔ اس طرح میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں پولیس کو کال کروں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"کرلو فون۔ اچھا ہے مجھے پولیس لے جائے۔ ایٹلیسٹ تم ریلیکس تو فیل کرو گی۔ ورنہ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے کندھے اچکا کر کہا۔ وہ گہری سبز آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی۔

"ہم...... پچھلے تین سالوں سے آپ میرا پیچھا ہی پکڑے ہوئے تھے نا۔" وہ طنزیہ بولی۔ کل کی نسبت آج وہ میرے سامنے اطمینان سے کھڑی تھی۔

"تمہارا پیچھا تو میرا دل برسوں سے کر رہا ہے انزلنہ۔ میں ہی اس کو جھٹلا رہا تھا۔ پر اب میں نے ہار مان لی ہے اور دل کے ساتھ اپنے قدموں کو بھی تمہارے پیچھے لے کر چلا آیا ہوں۔" میں نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔

"بڑی جلدی دل کی مان لی۔" وہ بدستور آف موڈ میں تھی۔

"مجھے معاف کردو انزلنہ۔ تم سے ان تین سالوں میں جو دانستہ دوری اختیار کی۔ اس پر میں خود تم سے زیادہ بے قرار رہا ہوں۔ یقین مانو میں یہاں آکر ایک لمحہ بھی تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا۔ ہر پل ہر دم تمہیں سوچا ہے۔ اور زندگی میں صرف تمہیں ہی چاہا ہے۔" میں نے اس کا نرم ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ جھکی پلکیں جھپکتی مجھے دیکھتی رہی۔

"پلیز انزلنہ!" میں نے التجا کی۔

"اب ایسا ممکن نہیں بالاج!" اس نے کہا۔

"کیوں۔" میرا دل گھبرا سا گیا۔ "کیونکہ میں اپنے ماموں زاد کزن سے شادی کر رہی ہوں۔" انزلنہ کی بات پر میں ششدر رہ گیا۔

"تم اپنے کزن سے کیسے شادی کر سکتی ہو۔ وہ تو کرسچن ہے نا۔"

"وہ اپنا مذہب بدلنے کو تیار ہے۔ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے بالاج! اور محبت میں لوگ قربانیاں دیا ہی کرتے ہیں۔" انزلنہ نے عجیب سے لہجے میں مجھے جتایا۔

"انزلنہ۔ تم ابھی بچی ہو۔ زمانے کی چالوں سے ناواقف۔ وہ تمہیں ٹریپ کرنے کی کوششوں میں ہے۔ اس طرح کسی لڑکی کی خاطر مذہب تبدیل کرنا کوئی احسن عمل تو نہیں۔ مذہب کو خالص اللہ اور رسول ﷺ کے لیے دل کی پوری آمادگی سے قبول کرنا ہی اصل بات ہے۔ آج وہ تم سے نکاح کے لیے یہ عمل کر رہا ہے کل وہ مکر بھی سکتا ہے۔ مرتد بھی ہو سکتا ہے۔ پھر تم کہاں جاؤ گی۔" میں بے طرح بے چین ہو کر اس کو سمجھانے لگا۔ جو اسٹریٹ پول پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

"آپ کے پاس پھر بھی نہیں آؤں گی بے فکر رہیں۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر تیز تیز چلنے لگی۔

"انزلنہ۔ بات کو سمجھو۔ تمہارا یہ فیصلہ مناسب نہیں۔ تمہیں [illegible] گا تو نانو کی روح پریشان

ہوگی۔" میں نے اس کو پھر سے جالیا۔

"آپ میرے لیے فکرمند نہ ہوں، پاکستان واپس جائیں اور ماہ پارہ سے شادی کر کے مزے سے رہیں۔" اس نے اس بار سختی سے کہہ کر تقریباً دوڑتے ہوئے روڈ کراس کیا اور کل والی عمارت میں گھس گئی۔ میں بے بس سا ہاتھ ملتا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے کئی دن میرے انتہا کی بے چینی میں گزرے۔ کیونکہ اس ریسٹورنٹ سے انزلنہ نوکری چھوڑ کر جا چکی تھی۔ میں نے اسے اس کی ننھیال میں جا کر ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بے رخی میں نے کبھی دیکھی نہ تھی۔ وہ میرے گرد پروانوں کی طرح چکراتی تھی۔ بالاج بالاج اور بس بالاج۔ سارا دن اس کے لبوں پر میرا نام مچلتا تھا۔ میں اپنے جذبوں سے گھبرا کر اس سے دور ہوا۔ تب بھی وہ مرجھائی ضرور مگر ایسی کج ادا نہ ہوئی جیسی اب ہو گئی تھی۔ میرے اقرار محبت سے بھی اس کو سرمو فرق نہ پڑا تھا اور اب بخوشی وہ کسی اور کی ہونے جا رہی تھی۔

یہ خیال ہی سوہان روح تھا۔ میں نے اس نہج پر تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کہ کبھی وہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے۔ میں اس کو اس اقدام سے روکنا چاہتا تھا۔ میں کس طرح اس کو کسی اور کا بنتے دیکھ سکتا تھا؟

☆☆☆

"میری بچی فاریہ مجھے بھولتی نہیں۔ وہ ایک سعادت مند لڑکی تھی عام نوجوان لڑکیوں کی بہ نسبت انتہائی حساس اور سمجھ دار۔ یونیورسٹی میں اس کا دل پاکستانی لڑکے پر آ گیا۔ میں نے اور اس کے پاپا نے بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ مانی۔ ہم تنگ نظر نہیں تھے۔ لیکن اس کا مذہب تبدیل کر کے غیر ملک جانے کا فیصلہ ہم پر بجلی بن کر گرا۔ وہ بہت ضدی تھی۔ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔"

اس ستر سالہ بوڑھی عورت نے ایک سانس بھری تھی۔

"اس کے پاپا خفا تھے پر میرا رابطہ تھا میری بیٹی سے۔ ہمارا داماد بہت اچھا تھا۔ ایک بار ملنے آئے تھے دونوں مجھ سے۔ تب وہ عائشہ بن چکی تھی۔ اس کی گود میں دو سالہ انزی بھی تھی۔ میری تو دنیا ہی وہ بچے تھے ایک فاریہ دوسرا جوزف۔ دونوں کی خوشی میری خوشی۔ پھر اچانک پتا چلا وہ ایک ایکسیڈنٹ میں شوہر کے ساتھ ختم ہو گئی۔ میں بہت دکھی ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا انزی کو اس کے دادا، دادی اون نہیں کر رہے۔ میں نے مسٹر رابرٹ (شوہر) کو بہت کہا ہم انزی کو یہاں لے آئیں وہ رضا مند نہیں ہوئے۔

برسوں بیت گئے۔ جوزف ایک سال قبل انڈیا جا رہا تھا تو میں نے کہا انزی سے مل لینا۔ پھر اس کی زبانی معلوم ہوا "انزی پاکستان میں ناخوش ہے" تو میں نے اس سے کہا اسے یہاں بلوا لیتے ہیں۔"

وہ متواتر بول کر پھر خاموش ہو گئیں۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے مسز رابرٹ! مگر اب جو آپ کرنا چاہتی ہیں وہ بالکل مناسب نہیں۔" میری بات پر انہوں نے بھنویں اچکا کر مجھے دیکھا۔

"آپ اپنے پوتے سے انزی کا رشتہ جوڑ کر عائشہ ماں کی کہانی دہرانا چاہتی ہیں۔" میری بات پر ان کا منہ ہلکا سا کھلا۔

"جوزف اولاد کی نعمت سے محروم ہے مسٹر بالاج!" انہوں نے انکشاف کیا تو مجھے جھٹکا لگا۔

"لیکن انزلنہ تو......" میں کچھ کہتے کہتے چپ ہوا۔

"وہ تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہتی اسی لیے اس نے ایسا کہہ دیا۔ وہ مجھے بتا لی ہے ادھر پاکستان میں اس کی خالہ دادی کی وفات کے بعد اسے بہت کچھ سہنا اور سننا پڑا۔ تم اس کے کزن تھے نا۔ اسے بے آسرا کر کے یہاں آ گئے۔ تمہاری فیملی نے اس کا جینا حرام کر دیا۔ تمہارے اور اس کے بیچ کے ریلیشن شپ کو اس نے انزی کے لیے طعنہ بنا دیا۔ اسے اتنا ستایا کہ انزی نے گھر چھوڑ کر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔" وہ اچھی خاصی برہمی سے بولیں۔ تو میں ماہ پارہ کو سوچ کر خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

"مسز رابرٹ! میں اپنے کیے پر شرمندہ

www.pklibrary.com

ہوں۔ انزلنہ میری پہلی محبت ہے۔ ماہ پارہ سے میری منگنی ختم ہو چکی ہے۔ اب میں انزی کو اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ آپ اسے سمجھائیے کہ وہ میرے ساتھ پاکستان واپس چلے۔'' میں نے عجالت سے کہتے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''دیکھو بالاج! وہ سمجھ دار اور بالغ ہے اس پر زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ تم اس کو کنوینس کر لو، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ نرمی سے بولیں تو میں نے ایک سانس بھری۔

میری بے بسی پر مسز رابرٹ کو غالباً ترس آیا تھا تب ہی انہوں نے آنکھ کے اشارے سے کچن کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں فوراً اٹھ کر کچن کی طرف چلا آیا۔ انزلنہ سامنے ہی ایک کیبنٹ سے ٹیک لگائے بازو سینے سے لپیٹے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میرے قدموں کی آہٹ سے اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ میں دھیمے انداز میں چلتا ہوا اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے رخ موڑ لیا۔

''انزلنہ!'' میں نے پکارا۔

''فرمایئے۔'' وہ اجنبی لہجے میں بولی۔

''انزی! مجھ سے خفا ہو؟'' میں نے ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

''میرا آپ کا رشتہ کیا ہے جو میں آپ سے خفا ہوں۔'' وہ بے رخی سے بولی۔

''رشتہ تو برسوں پرانا ہے انزی! اور سب سے مضبوط رشتہ ہے۔ دل کا رشتہ۔''

''آج انکشاف ہوا ہے آپ پر۔'' وہ چیخ کر بولی تھی۔

''نہیں۔ بہت پہلے ہو گیا تھا۔ تمہاری محبت بارش کی بوندوں کی طرح دل کی زمین پر برسی تھی۔ پہلے نرم پھواری پھر موسلا دھار برسات بن کر۔'' میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''بس اس بات کا اقرار کرنے میں جھجک تھی۔ لیکن آج دل کی سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ تمہارے سوا کسی کو نہیں چاہا انزی۔'' میرے لہجے میں جذبوں کی سچائی تھی۔

انزلنہ کی آنکھوں میں نمی چمکی۔

''میں اب تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا انزلنہ! پلیز میرے ساتھ واپس چلو۔ ہم پاکستان جا کر شادی کریں گے۔'' میں نے جذبات سے مغلوب لہجے میں اصرار کیا تو انزلنہ نے ایک تیکھی نظر مجھ پر ڈالی۔

''پہلے میرے وہ چار سال مجھے لوٹائیں جو میں نے آپ کی جدائی میں لمحہ لمحہ اذیت میں کاٹے ہیں۔'' وہ بھرائی آواز میں بولی تو میں اس کے مطالبے پر سٹپٹا گیا۔

''ابھی لوٹائیں مجھے۔'' وہ بضد ہوئی۔

''انزلنہ! میں ازالہ کروں گا نا۔ میں شرمسار ہوں اور معافی کا طلب گار بھی۔'' میں نے بے بس ہو کر اسے دیکھا۔ جو ناراض چہرہ لیے سلیب پر رکھی ایک پلیٹ میں نگٹس نکال رہی تھی۔ اس وقت ضد کرتی ہوئی وہ بالکل چھوٹی بچی لگ رہی تھی۔

''اوکے۔'' میں نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا اور پھر نگٹس کی پلیٹ میں سے ایک نگٹ اس کے منہ میں ڈالا۔ وہ میری حرکت پر ایک دم حیران رہ گئی۔

''چلو پھر تمہارے گزرے سال لوٹانے کی شروعات اسی وقت سے کرتے ہیں، جب ہم دونوں پہلی بار ملے تھے۔ تم نو دس سالہ چھوٹی بچی تھیں اور میرے ہاتھ سے چار پانچ نگٹس مزے سے کھا گئی تھیں۔'' میں نے مسکرا کر پیار سے کہا تو انزلنہ کے تنے ہوئے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ نگٹ کھانے لگی۔ میں نے وارفتگی سے اسے دیکھا۔

''آئی لو یو انزلنہ!'' میں نے بے خود ہو کر کہا تو اس کے چہرے پر گلال چھا گیا۔

''اب تو ناراضی ختم نا۔'' میرے استفسار پر وہ بے ساختہ کھلکھلائی تھی اور پاس کھڑی محبت بھی ہمیں دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

☆

افشین نعیم

یار دل کا حقدار

''نہال بھائی، بچوں کو کہیں گھمانے پھرانے گھر سے باہر لے کر گئے ہوئے تھے۔ بھابھی میرے سر ہو گئیں کہ امی کے ہاں چلو، امی اور مصباح (بھابھی کی بہن) کب سے تمہیں یاد کر رہی ہیں۔''

عادل نے سانس لینے کے لیے کچھ دیر توقف کیا۔

''جب سے تیری نوکری لگی ہے تب ہی سے یاد کر رہی ہوں گی۔'' حیدر نے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

عادل نے کندھے اچکاتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''بس جی کھینچ کھانچ کے لے گئیں مجھے اپنے میکے۔''

''بڑی ہمت ہے ویسے۔'' احسن نے بات کاٹی۔

عادل سمیت سب ہی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''کس کی ہمت کی بات کر رہے ہیں احسن بھائی؟'' انس سے رہا نہ گیا تو پوچھ لیا۔

''بھابھی کی ہمت کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی آسان کام ہے اس جیسے سانڈ کو کھینچ کر کہیں لے جانا۔''

''یا تو جگتیں مار لے یا خاموش ہو کر میری بات سن لے۔'' عادل اسے غصے سے گھورتا ہوا بولا۔

''خاموش ہو کر بات سن لیتا ہوں۔''

وہ سر ہلا کر خاموش ہوا تو عادل نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔

''پھر جناب! بھابھی کی والدہ، جن سے میری سلام دعا سے زیادہ بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس قدر والہانہ انداز میں مجھ سے ملیں کہ مجھے شک سا ہونے لگا کہ یہ واقعی بھابھی کی والدہ ہیں یا میرے بچپن میں مجھ سے کسی میلے ٹھیلے میں بچھڑنے والی ماں ہیں۔

اس کے بعد جو لوازمات، چائے کے ساتھ انہوں نے میرے سامنے پیش کیے۔ اس سے میرا شک مزید پختہ ہوتا گیا کہ آیا یہ واقعی بھابھی کی والدہ ہیں؟''

عادل بول رہا تھا۔ باقی لوگ انتہائی انہماک سے اس کی بات سن رہے تھے۔ سوائے محب اللہ کے، جو اخبار کے مطالعے میں یوں غرق تھا گویا صبح پرچا دینا ہو۔

''ابھی میں ایک سموسہ کھا کر، کیک سے انصاف کر ہی رہا تھا کہ بھابھی کی بات پر وہ پیس حلق میں اٹک گیا۔

فرمانے لگیں، ''بڑی بھابھی تو عادل کے لیے اپنی بھانجی کا سوچے بیٹھی ہیں۔ پر میں نے صاف صاف بتا دیا کہ ہماری ساس مرحومہ نے اپنی وفات سے قبل کہا تھا کہ میرے عادل کی دلہن بنے گی تو صرف مصباح۔''

میں تو امی جان کی وفات کے اتنے برس بعد ان کی یہ وصیت سن کر ہکا بکا ہی رہ گیا۔

رہی سہی کسر محترمہ مصباح صاحبہ کی آمد نے پوری کر دی۔ بھابھی نے بتایا تھا کہ مقابلے کا امتحان دے رہی ہے۔

ان محترمہ کی صحت کے حالات سے لگ رہا تھا کہ مقابلہ یقیناً کھانے کا ہو گا جس کے وہ امتحانات

دے رہی ہیں۔

چلتی تھی تو لگتا تھا فٹ بال لڑھک رہی ہے۔

"عادل......!" محب اللہ نے اخبار سے نظر اٹھا کر ڈانٹنے والے انداز میں اسے پکارا۔

اس کی گھوری میں بھی ایک تنبیہ موجود تھی گویا کہہ رہا ہو۔ بری بات۔

"اچھا بابا! سوری۔" عادل نے فوراً کان پکڑے۔

"پھر امی جان نے بے تکلفی کی تمام حدیں پار کرتے ہوئے......"

اس کو درمیان میں ہی بریک لگانا پڑی۔

انس اور احسن ہنسی کر رہے تھے۔

"کیا ہے؟" عادل نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

"امی جان؟" حیدر نے ان کے ہنسنے کی وجہ بتائی۔

"اوہو بھئی، میرا مطلب ہے بھابھی کی امی جان......" فوراً سے پیشتر اس نے تصحیح کی۔

"نے بے تکلفی کی تمام حدیں پار کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ عادل بیٹا! تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے اپنی والدہ مرحومہ کی وصیت پر۔"

میں تو منہ کھولے حیران پریشان ان کی بات سن رہا تھا کہ وہ محترمہ اچانک اٹھیں۔ یقین مانو...... زلزلہ ہی آ گیا گویا......

پھڑ پھڑ کرتی غالباً شرما کر اندر بھاگی تھیں۔

"میرے پاس تو بھاگنے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔" عادل منہ بسورتے ہوئے بولا۔

"تو...... تو بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر بھاگ جاتا۔ حاضرین محفل کو بتا جاتا کہ میں بھی شرماتے جا رہا ہوں۔" حیدر اطمینان سے بولا۔

"تاکہ وہ اسی وقت قاضی بلوا کر نکاح پڑھوا دیتے میرا۔" عادل سر جھٹک کر بولا۔

"آخر مسئلہ کیا ہے؟ اب تو فرح کی جگہ بھی سونا سمجھتے ہوئے تمہیں ہونا بیٹا کک رکھ لیا ہے۔ ادھر بھی کوئی چانس نہیں ہے۔ ایسا کر تو اپنے بھائی کی سالی سے ہی شادی کر لے۔" احسن نے مفت مشورے سے نوازا۔

"یہ لے......" عادل نے معافی والے انداز میں دونوں ہاتھ احسن کے سامنے جوڑ دیے۔

"معاف کر دے مجھے، نہ مجھے نہال بھائی بننا ہے مستقبل میں، نہ ہی بھابھی کے خاندان میں شادی کرنی ہے۔"

تب ہی محب اللہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ذرا عشاء کی نماز پڑھ کر آتا ہوں۔"

"سن مولوی!" عادل کی آواز پر وہ رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔

"کوئی ڈھنگ کا مشورہ ہی دے دے۔"

"صاف انکار کر دے کہ مجھے نہیں کرنی شادی

ادھر۔ بات ختم۔''

اپنی دانست میں محب اللہ نے انتہائی معقول مشورہ دیا تھا۔

''او بھائی! ادھر شادی نہیں کرنی اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے کنوارہ مرنا ہے۔ صاف جواب دے دیا تو بھابھی نے میرا داخلہ بند کر دینا ہے گھر میں۔

پھر میرا رشتہ لے کر کون جائے گا لڑکی والوں کے ہاں؟''

محب اللہ کندھے اچکاتا، بغیر ایک لفظ کہے، مسجد کے لیے نکل گیا۔

''تو پھر تو کرے گا کیا؟'' حیدر نے پوچھا۔

''میں نہیں کروں گا...... تم تینوں کرو گے۔'' وہ پراسرار سے انداز میں ان تینوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہم......'' انس نے حیدر اور احسن کی طرف دیکھا۔

''ہم کیا کریں گے؟'' بولا تو لہجے میں پریشانی تھی۔

''تم تینوں اس منصوبے پر عمل کرو گے جو میں بتاؤں گا۔'' اس کے بعد بھابھی کی والدہ اور میری بھی نہ ہونے والی ساس خود ہی اس رشتے سے انکار کر دیں گی۔''

''کرنا کیا ہوگا؟'' حیدر نے ابرو چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ جس کے جواب میں عادل نے تفصیل سے سارا منصوبہ ان تینوں کے گوش گزار کیا۔

انس فوراً ہی بدک کر پیچھے ہوا۔ ''عادل بھائی! میں تو ہرگز کوئی مناسب انسان نہیں ہوں اس کام کے لیے۔ اس لیے مجھے تو رہنے ہی دیں۔''

''سوری یار!'' حیدر تکیہ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''میری تو اس اتوار دن، تاریخ طے ہونے جا رہی ہے۔ میرا وہاں ہونا ضروری ہے۔ اس لیے میری طرف سے تو معذرت قبول کر لے۔''

اب کے عادل، احسن کی جانب گھوما۔

''نہ بابا نہ......'' اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''میں تو شریف انسان ہوں۔ اس قسم کے پھڈے میں پڑ کر اپنی عزت خراب نہیں کر سکتا۔''

تینوں سونے کے لیے کمرے کی جانب بڑھ رہے تھے جب عادل کی آواز پر ان کے قدموں کو بریک لگے۔

''آدھے گھنٹے کے اندر اندر اپنا اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

تینوں ایک ساتھ عادل کی جانب گھومے۔

وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھا ٹانگیں سینٹر ٹیبل پر رکھے ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ تھی۔

''ہیں......؟''

''کیا......؟''

''کیوں......؟''

تینوں نے چونک کر پہلے عادل کو پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''میں نے کہا اپنا اپنا سامان سمیٹو اور مجھ سے گلے ملو آ کر۔ کل کی رات ہماری آخری رات تھی ایک دوسرے کے ساتھ۔ آج سے ہمارے راستے جدا ہو رہے ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

پھر حیدر بولا۔

''تو مذاق کر رہا ہے نا؟''

''ظاہر ہے......'' عادل ہنستے ہوئے بولا۔ ''ڈر گئے تھے نا تم لوگ۔''

تینوں نے ایک دم ہی سکون کا سانس لیا۔ واپس کمرے کی جانب رخ کیا۔

''ویسے تم لوگ بھی مذاق کر رہے تھے نا؟''

عادل کی بات پر ان کے قدم ایک بار پھر زنجیر ہوئے۔

''جا رہے ہو نا، اس اتوار میری نہ ہونے والی سسرال؟''

تینوں بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

''توبہ میرے اللہ! کیا بتاؤں نہال بیٹا تمہیں۔ شکل سے ہی غنڈے لگ رہے تھے تینوں۔

لمبی لمبی مونچھیں، عجیب و غریب قسم کے حلیے۔ عادل کی تصویر لے کر ایک ایک سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ اس شخص کو جانتا ہے کوئی۔ پہچان تو میں پہلی ہی نظر میں گئی تھی۔

www.paklibrary.com

پر بتانے کی غلطی نہیں کی۔" آنٹی سانس لینے کو رکیں۔
نہال بھائی اور بھابھی حیرت سے منہ کھولے ان کی بات سن رہے تھے۔
"میں نے یوں ہی سرسری سا پوچھا کہ بے چارہ کوئی بھلا مانس ہی لگ رہا ہے، آپ لوگ کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟"
"وہ تو مانو بھرے ہی بیٹھے تھے، بولے۔ ہماری بہن کو شادی کا جھانسا دے کر، لاکھوں کے زیور ہتھیا کر فرار ہوا ہے یہ آدمی۔ اب جیسے ہی کہیں ملے گا اس کی تکہ بوٹی کریں گے۔"
اللہ اللہ...... میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔ اکیلا لڑکا۔ وہ بھی بن ماں باپ کا۔ خدا جانے کیسی صحبت میں رہتا ہے۔
اب دیکھ لو، کیا چاند چڑھا کر بیٹھا ہے۔" ایک ہی سانس میں بولے گئیں۔
"نہال بیٹا...... معاف کرنا۔ تمہاری والدہ مرحومہ کی وصیت انتہائی قابل احترام ہے۔ پر مصباح کی شادی میں یہاں نہیں کر سکتی۔ میری طرف سے معذرت۔" وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ گئیں۔
اور اب بھابھی کی باری تھی۔ عادل کی کلاس لینے کی۔

☆☆☆

"یارو...... بھابھی سخت ناراض ہیں مجھ سے۔"
عادل ان تینوں کے پھولے پھولے، سوچ سوچ چہرے دیکھ کر محظوظ ہوتا ہوا بولا۔ جو پوری ذمہ داری سے اپنا مشن پایہ تکمیل تک پہنچا کر آئے تھے۔ پر آنے کے بعد سے لے کر اب تک اس سے ناراض تھے۔
عادل مسلسل کچھ نہ کچھ بول کر ان کو جواب دینے پر اکسا رہا تھا، پر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔
مطلب مکمل ناراضی۔
یعنی مکمل بائیکاٹ۔
"میں نے بہت کوشش کی" ان کو "یقین دلانے کی کر ان "سالوں۔" اس لفظ پر تینوں نے گھور کر اس کو دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔
"سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ پر وہ مان کر ہی نہیں دیں۔ مطلب کر قطرا کے بعد اب مصباح بھی میرے نصیب میں نہیں رہی۔"
ایک ٹھنڈی سانس اس نے جان بوجھ کر حلق سے خارج کی۔
"بہت افسوس ہو رہا ہے تو ہم جا کر غلط فہمی دور کر دیتے ہیں۔" آخر احسن بول ہی پڑا۔ اس سے زیادہ برداشت اس کے اندر نہیں تھی۔
"نہ...... نہ...... جو تم لوگوں نے کر لیا، کافی ہے۔ باقی کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔"
عادل تیزی سے بولا۔
"اچھا تو کیا کریں گے اب آپ؟" انس نے بھی آخر چپ توڑی۔
"میں دو ہفتے مکمل خاموشی اختیار کرنے کے بعد تحفے تحائف سے لدا پھندا گھر جاؤں گا تو بھابھی سب کچھ بھول بھال جائیں گی۔" وہ سکون سے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔
"اچھا......"
"اور سالوں کو نہیں دے گا تحفے، تحائف؟" یہ آواز حیدر کی تھی۔
عادل نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چھت کو گھورنا شروع کر دیا۔
"سالوں کے لیے تو......" تینوں کی گھوریوں پر اس نے فوراً جملہ تبدیل کیا۔
"یاروں کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔"
"پاس رکھ تو اپنی جان۔" احسن بولا
"ہمیں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کروا۔"
"ٹھیک ہے پھر ڈن ہو گیا۔" عادل بولا۔
"آج رات کا ڈنر میری طرف سے۔ جہاں تم لوگ کہو۔" تب ہی محب اللہ کمرے سے نکلا۔
"ڈنر...... کس خوشی میں؟"
"میری شادی نہ ہونے کی خوشی میں۔" عادل مسکراتے ہوئے بولا۔
محب اللہ نے ناسمجھی سے سب کو دیکھا۔
سب مسکرا کر رہ گئے۔

☆

ویسے تو ابا ایسے ہی تھے جیسے عام طور پر ہوا کرتے ہیں نرم گرم مزاج والے، کبھی دوپہر کی دھوپ اور کبھی ٹھنڈی چھاؤں...... لیکن جب سے اندر ہی اندر دس طرح کے روگ انہیں کھانے لگے، پہلی رپورٹ ہی ہوش ربا تھی۔ بے آواز چوبیس گھنٹے کام کرنے والے دونوں گردے ناکام ہو چکے تھے۔ بلڈ یوریا اور کریٹنائن دونوں ہی خطرناک حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

وہ انتہا درجہ کے رقیق القلب ہو چکے تھے...... بات بات پر آنسو پونچھنے لگتے۔ پوتے پوتیوں کی ہر چھوٹی بڑی فرمائش پوری کرتے، عبادت میں تو خشوع خضوع آیا ہی تھا معاملات بھی یکسر بدل گئے...... جن جن سے ناراضگیاں تھیں صلح میں بدل گئیں۔ لین دین کے چھوٹے چھوٹے معاملات درست کر لیے جو نہیں دے سکتے تھے اللہ واسطے معاف کر دیے جن کو دینا تھے شکریہ کے ساتھ لوٹا دیے۔

سب بچوں کو پاس بٹھا کر وصیت بھی کی اور نصیحت بھی۔ کچھ اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ اولاد کے کانوں میں منتقل کیا...... ایک معاملہ ابھی بھی ایسا تھا جس کو ابھی دانستہ یا نادانستہ موضوع بحث نہیں بنایا اور سب سے اہم نکتہ بھی وہی تھا۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے۔ ”تم میں سے کوئی اچھے کام کرتا رہتا ہے لیکن مرتے وقت ایک ایسا بول بولتا ہے کہ جہنم کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی ایسا بھی

قانتہ رابعہ

ناولٹ

www.pklibrary.com

ہے جو ساری زندگی غلط کام کرتا ہے لیکن مرتے وقت ایسا بول بول دیتا ہے کہ جنت کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔(مفہوم) جی ہاں ورثہ کی تقسیم......"

بالآخر ندیم محمود، حکیم محمود، نعیم محمود سے کئی کئی گھنٹوں کی طویل ملاقات کے بعد ابا ورثے کی تقسیم پر بھی اہل خانہ کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

تینوں بیٹے شادی شدہ تھے ہاں بیٹی ثناء محمود ایک ہی تھی۔ بیس بائیس سال کی عمر اور پڑھنے کی شوقین۔ اپنے بھتیجے سے ابا نے اس کی بات دو سال پہلے طے کی تھی۔ بھتیجے یعنی ارتضٰی اکرم کو پاکستان بلایا۔

"اپنے سامنے بیٹی کو رخصت کر کے سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔" ابا نے اپنی بہن سے کہا۔

ہفتہ بعد نکاح کی تاریخ مقرر کی گئی لیکن اس سے قبل ابا نے ثناء کو پاس بٹھا کے دل کی ڈھیروں باتیں کیں۔ پھر بتایا کہ اب تک ان کے خاندان میں لڑکیوں نے کبھی بھی ورثہ نہیں لیا۔ بہت شرم محسوس کرتی ہیں کہ اپنے باپ یا بھائیوں کی جائیداد میں بٹوارہ کریں۔ جہیز کے علاوہ عید بقر عید کی خوشی ہر موقع پر بیٹیوں کو ان کی توقع سے زیادہ دیا جاتا ہے شاید اس لیے بھی انہوں نے مانگنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی لیکن مجھے دین کا تھوڑا بہت علم حاصل ہوا اس کی رو سے میں سمجھتا ہوں کہ لڑکیاں اگر حصہ لینا چاہیں تو انہیں اس سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ تم دیکھ رہی ہو گی میں پچھلے کئی دنوں سے تمہارے بھائیوں کو قائل کر رہا تھا۔ بے شک باپ دادا کے طور طریقوں کو چھوڑنا بے حد مشکل کام ہے۔ مگر شکر الله کچھ کچھ راضی ہو ہی گئے ہیں۔ بس چھوٹا نعیم ذرا جذباتی سا ہے وہ خفا ہے۔ "کبھی منہ نہ دیکھنے کی دھمکی دے رہا ہے...... تم پریشان نہ ہونا ناخن کبھی بھی گوشت سے جدا ہوا ہے...... وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا کل وراثت کی تقسیم کے متعلق اسٹامپ پیپر پر دستخط کرنے کے لیے تمہیں بھی تحصیل دار کے پاس جانا ہو گا۔ ہاں اگر راضی خوشی بھائیوں کو ہبہ کرنا چاہو تو یہ تمہاری اپنی مرضی ہو گی......"

وہ ساری رات ثناء نے کروٹوں کے بل گزاری...... ماں موئی تے ٹک گئے پیکے پیہ۔ کڑیاں واجینا...... ماں تو پہلے ہی نہیں تھی ابا کے بعد بھائی بھی اگر سیدھے منہ بات کرنے کے روادار نہ ہوتے تو وہ کہاں جائے گی۔

اس نے جائیداد میں سے اپنا حصہ بھائیوں کو ہبہ کر دیا۔ یہ بھی بہت تھا کہ اس کے باپ نے اسے اس قابل تو سمجھا کہ ورثہ لینے کی بات کی ورنہ دادا کے بھائیوں نے تو کورٹ کچہری میں اپنی تین بہنوں کو مرحومہ قرار دے کے حصہ ہتھیا لیا تھا۔

خیر رات گئی بات گئی۔ وقتی طور پر بھائیوں کے بجھے چہروں پر زندگی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے اس کے نکاح پر قیمتی ساز و سامان دیا۔ نئی گاڑی، بھینس، فلیٹ کی چابی...... پھر کون سا ورثہ دینا بنتا تھا؟

☆☆☆

ابا نے بیٹی کے لیے بہن اور بھتیجے سے ملاقات کر کے بھاری حق مہر مقرر کروایا...... بڑی گلوگیر آواز میں بولے۔

"ساجدہ! ہمارے پرکھوں کو تو علم ہی نہیں تھا حق مہر کے نام پہ وہی سولہ آنے بتیس روپے دلواتے رہے...... یہ تو نری جہالت ہے یہ تو اسلام نے نکاح کی شرط رکھی ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہی دینا چاہیے......" پھر بھتیجے سے ماہانہ آمدنی سالانہ گوشوارے مرتب کروائے اور ایک ماہ کی تنخواہ کے علاوہ بری کا سونے کا زیور حق مہر میں لکھوایا۔

بہن کا بھی اکلوتا بھائی...... دم واپسی کی تیاریوں میں...... بھتیجا بھی تابع دار فرماں بردار...... "جی ماموں جان" کہہ کر حق مہر کے مطالبے کو انہوں نے تسلیم کر لیا۔ تیس بتیس لاکھ کی بھاری رقم سکہ رائج الوقت اس کا حق مہر بنتی تھی۔ بھائیوں نے چھیڑ چھیڑ کے نام میں دم کر دیا۔

"ارے ہماری ثناء تو بیٹھے بٹھائے مال دار ہو

www.pklibrary.com

گئی......"

ثناء کو دولت مند ہونے کی خوشی سے زیادہ ابا کے جانے کا غم تھا...... نکاح کے بعد ثناء کی گوجرانوالہ رخصتی ہوئی اور اگلے دن ابا کی واپسی کا سفر مکمل ہو گیا۔

جنہیں ابا کی بیماری کا علم نہیں تھا وہ بھی سمجھتے رہے کہ ثناء کی جدائی کا غم نہ سہہ سکے۔

☆☆☆

زندگی کے نئے دور میں داخلہ ہی اتنے بڑے سانحے سے ہوا کہ مدت تک وہ ہنس بول نہ سکی۔ اس کے بیٹے ابوبکر کی پیدائش نے اسے دوبارہ سے زندہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں تاروں کی جگمگاہٹ اور اس کے ہونٹوں پر مسکان واپس آئی۔ بلا تکان بولتی...... بچے کو دیکھ دیکھ جیتی۔

سال بعد ہی ابوبکر کی بہن روتے زمین پر آئی لیکن اس کی پیاری پھوپھو اس کی سانس زمین کے نیچے خاک تلے جا سوئیں۔ پردیس جاتے وقت ارتضیٰ نے ماں کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھا تھا۔ کفن میں لپٹا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ حوصلہ جمع کر کے پہنچ بھی جاتا تو منہ دیکھنا پھر بھی ممکن نہ تھا۔

دس بارہ دن وہ پردیس میں رہا لیکن ماں کی باتیں یاد کر کر کے مدتا، کرلاتا رہا—— کیسے لمبی لمبی کالز پر ایک ہی بات موضوع گفتگو۔ "تم چھوڑ کے آ کیوں نہیں جاتے؟"

ارتضیٰ نے حیرانی سے کہا......"اماں! آپ کیسی ماں ہیں، میرے سارے جاننے والے لڑکے یہاں ماؤں کے دھکے سے آئے ہیں۔ آپ کہتی ہیں میں واپس آ جاؤں؟"

"میں ویسی ماں نہیں بن سکتی۔ تم نے قرآن میں نہیں پڑھا۔ اللہ نے اپنے دشمن ولید بن مغیرہ کو دی ہوئی نعمتیں گنوائیں تو مال و دولت کے ساتھ "و بنین شھودا" حاضر باش بیٹے بھی بطور احسان گنوائے...... جو ڈالر یورو یا پونڈ کے بجائے خود ہی والدین کے پاس موجود رہتے تھے۔"

ماں کے جانے کے بعد تیرھویں دن اس نے لاہور ایئر پورٹ پر قدم رکھا تو وہ پردیس کی نوکری، مراعات سب کچھ چھوڑ کے آ چکا تھا۔ اسے اب باپ کا سہارا بننا تھا جو آنکھوں سے صحیح طرح سے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

دو قدم دن کی روشنی میں بھی چلتے ہوئے دس مرتبہ لڑکھڑاتے...... اپنے بچوں کی پرورش میں حصہ ڈالنا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں کو ماں سے کیے وعدہ کے مطابق بیاہنا تھا۔ سو وہ واپس آ گیا...... دو اڑھائی ماہ ماں کے صدمے سے نکلنے میں لگے جمع جتھا بھی تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ دونوں چھوٹے بھائی اور ایک بہن زیر تعلیم تھے۔ سمسٹر فیس کے نام پر ہزاروں نہیں لاکھ کے قریب نکل جاتا، خالی ہاتھ بیٹھنے سے تو قارون کے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملالِ زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

www.pklibrary.com

خزانے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

چودہ پندرہ سال پہلے اس کے پاس اتنی بڑی ڈگری تو نہیں تھی جیسا اب ٹرینڈ چل پڑا تھا۔ اینٹ اٹھاؤ تو ایم بی اے، بی اے، انجینئر ڈاکٹر...... چار چھ ماہ نوکری کے لیے دھکے کھائے، سرکاری نوکری کا کھاتہ بند ہو چکا تھا اور پرائیویٹ کمپنیوں والے جسم سے عرق نکال کے ہڈیوں کا گودا بھی نچوڑ لیتے۔

مزید دو اڑھائی ماہ کی جوتیاں خواری کے بعد اس نے دوست احباب کے کہنے پر کاروبار میں حصہ ڈالا۔ مگر جس آن بان شان سے کام شروع ہوا تھا حکومت تبدیل ہونے کی وجہ سے محنت مشقت کے بعد ذلت میں بدل گیا۔ پھر دوسرا کام شروع کیا مگر ناتجربہ کاری کے ہاتھوں منہ کے بل گرا...... نوبت یہاں تک پہنچی کہ مقروض ہو گیا۔

ثناء نے خاوند کی پریشانی دیکھتے ہوئے اچھی بیوی کا کردار ادا کرنے کی ٹھانی۔ اس نے گھر کے ایک کمرے کو ٹیوشن سینٹر میں بدل لیا...... اور کچھ نہیں دال دلیے کا بندوبست ہو گیا۔ پھر اس نے ایک قریبی اسکول میں بھی ملازمت کر لی۔ بچے ابھی بہت چھوٹے تھے انہیں ساتھ ہی لے جاتی۔ پرنسپل نے تعاون کیا اور اس کے شروع کے پیریڈ لگائے۔

بارہ بجے وہ نیند پوری کر کے اٹھتے اور دس ریں کا باجا بجاتے بچوں کو لے کے واپس آتی، اگلے چار گھنٹے گھر کے کام کاج، چار سے سات تک ٹیوشنز

......!

وہ مجسمہ ایثار و وفا بن چکی تھی۔ جہیز کے اتنے شان دار کپڑے موجود تھے اس نے اپنے کپڑوں کے لیے بازار جانا حرام سمجھ لیا...... بچوں کے بھی بس وہی جو عید بقر عید پر بھائی دلوا دیتے۔ بہت صبر اور اس سے بھی زیادہ شکر کے ساتھ دن گزر رہے تھے کبھی تنگی کا بول اس کے ہونٹوں تک پہنچا نہ دل میں گھسا۔

☆ ☆ ☆

اتوار کے دن جب وہ گھر کے کاموں میں مگن تھی اسے ارتضٰی کی فون کال آئی۔

"تیار ہو جاؤ گجرانوالہ سے باہر جانا ہے۔"

ثناء کے پوچھنے پر بھی اس نے نہ بتایا۔ ثناء نے "شاید سرپرائز دینا چاہ رہے ہیں" کا سوچ کے زیادہ اصرار نہ کیا...... بچوں کو جھٹ پٹ تیار کیا۔ خود بھی ہلکی سی لپ اسٹک لگا کے اپنے تئیں تیار ہو گئی۔ اتنے میں ارتضٰی بھی بڑی ترنگ میں گھر کے اندر داخل ہوا۔

"بچو! تیار ہو ناں بھئی آج ہم ملتان جا رہے ہیں آپ کی ننھیال......" بالآخر سرپرائز کے تھیلے میں سے بلی برآمد ہوئی۔

"ملتان؟ خیریت ہے بچوں کے دو دن بعد پیپر شروع ہو رہے ہیں۔" ثناء نے ناسمجھی سے سوال کیا۔

ہاں۔ تو ہم کون سا رہنے جا رہے ہیں گئے اور آئے والا معاملہ سمجھو۔" اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"مگر اتنا لمبا سفر ہے، کیا کوئی ایمرجنسی ہے؟ پھر چلے جائیں گے۔" ثناء کے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔

"کہا ناں، ایک از حد ضروری کام ہے۔" ارتضٰی نے کوفت سے کہا۔

"تو کیا ہمارا جانا ضروری ہے آپ اکیلے چلے جائیں، کرایہ کے نام پر ٹھیک ٹھاک رقم نکل جائے گی ویسے بھی مہینے کا آخر ہے...... مہینہ اخیر تے افسر...... فقیر۔" اس نے ہر ماہ کے اختتام پر اپنا مخصوص تکیہ کلام دہرا لیا۔

"ہاں تم سب کا جانا ضروری ہے، زیادہ جرح نہ کرو، رقم کے بندوبست کے لیے ہی تو جا رہا ہوں۔" ارتضٰی نے ذومعنی فقرہ اچھالا۔

"کون سی رقم؟ پتا نہیں آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی ہے؟"

وہ واقعی بہت پریشان تھی۔ کچھ دنوں سے ارتضٰی کا اٹھنا بیٹھنا بدل گیا تھا۔ پڑوس کے ملک صاحب نے بتایا تھا کہ اچھی شہرت والے لوگ نہیں جن سے ارتضٰی نے دوستی کی ہے۔

"...... ہوزری کے کاروبار بلکہ فیکٹری قائم کرنے کے لیے بگ اماؤنٹ کی ضرورت ہے اس لیے جا رہا

ہوں تم لوگوں کو ساتھ لے کے..... شاہ بیگم تم واقعی بے حد بے مروت خاتون ہو حق مہر کے نام پر پندرہ تیس تولے سونے پر قبضہ گروپ بنی بیٹھی ہو، مجال ہے جو کبھی جھوٹے منہ بھی کہا ہو کہ میں نے بھائیوں کو ورثہ ہبہ کر دیا تھا آپ کو بھی حق مہر معاف کرتی ہوں آپ زیور لے کے کسی کاروبار میں لگالیں ...... اتنا بھی خیال نہیں شوہر یا اپنے بچوں کا کہ ڈیڑھ دو کروڑ کا جو حصہ بھائیوں کے نام کر دیا اسی میں سے کچھ لے کے دے سکو...... ملنے بھی ہیں تو کیا عید پر دو دو ان سلے جوڑے...... مٹھائی کا ڈبا...... ہونہہ!"

اس نے نخوت سے سامنے پڑی کرسی کو یوں ٹھوکر ماری جیسے وہ چار ٹانگوں والی بے جان کرسی نہیں شاہ ہو۔

☆☆☆

بہت دیر تک شاہ سکتے کے عالم میں رہی۔ یہ اس کے میاں کے منہ سے نکلے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ...... ان فقروں کا دکھ بلکہ اذیت اتنی شدید تھی کہ دماغ ماؤف اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں۔

"کب تک مراقبے میں رہو گی؟ کیا بھائیوں سے اپنا حق مانگنا بہت تکلیف دہ لگا ہے؟ اٹھو اب" یہ ڈرامے بازیاں چھوڑو اور تیار ہو جاؤ......" شاہ آہستہ آہستہ ہوش و حواس میں آئی۔ اتنی تکلیف تو اسے ابا کے جانے کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اتنی ٹینشن اپنی رخصتی پر بھی نہیں ہوئی تھی ...... جیسے بٹھائے دو چکی کے پاٹوں میں پیس دیا...... کس منہ سے کن الفاظ میں بھائیوں سے اپنا حق مانگے......؟؟

بے جان لاشے کو گھسیٹ کر وہ تیار ہوئی۔ اللہ جانے جو آنسو ابا کے جانے کے دو ایک ماہ بعد رک گئے تھے وہ کہاں سے اُمڈ پڑے...... بار بار واش روم میں جاتی اور آنکھوں سے نکلنے والا گرم سیال بہا کے آتی۔ مگر جیسے سیل رواں تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ارتضیٰ کا موڈ خراب ہی تھا اس کے خراب موڈ کو درست کرنے کی ذمہ داری ہمیشہ سے شاہ پر ہی تھی۔

لیکن آج ارتضیٰ کے عجیب و غریب رویے نے ارد گرد دیکھنے کی مہلت ہی نہ دی۔

سارے راستے وہ ذہن میں فقرے ترتیب دیتی رہی۔ "ہائے بھائی کیا کہیں گے؟ اپنا حصہ ہبہ کر کے واپس لے رہی ہوں؟

"لالچی عورت تم ایسی تو نہیں تھیں؟" اندر ہی اندر سوال جواب کے سلسلے جاری رہے۔ ایک دم ذہن میں کوندا سا لپکا...... ہبہ کیا ہوا حصہ تو نہیں لے سکتی یہ تو شریعت نے بھی منع کیا ہے...... جیسے کتا قے کر کے چاٹ لے...... مگر وہ بطور قرضہ تو لے سکتی ہے...... خود ہی وہ جاب کر کے بی سی ڈال کے زیور بیچ کے جیسے مرضی وہ قرضہ اتار دے۔

یہ سوچ ذہن میں آتے ہی وہ یکسو ہوگئی۔ یکسوئی ملی تو چہرے کا اطمینان بھی تازگی بن کے جھلکنے لگا۔

سپاٹ چہرے کے ساتھ ڈرائیونگ کرتے میاں کو اس نے بہت نرمی سے مخاطب کیا۔

"دیکھیے آپ کو کتنی رقم درکار ہے؟"

"میرے کہے فقروں کے سوگ سے نکلنے میں بڑی دیر لگی ہے محترمہ کو۔" ارتضیٰ نے چبا چبا کے لفظ اس کی طرف اچھالے۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی...... آپ بتا دیں ناں، بھیا سے پھر اتنی رقم مانگ لوں گی۔"

"ورثہ میں تمہارا حصہ تو ڈیڑھ کروڑ سے اوپر کا ہی ہے لیکن نعیم سے تو ظاہر ہے اتنا نہیں مانگ سکتے۔ جتنے مناسب سمجھو مانگ لینا مجھے درمیان میں مت گھسیٹنے بیٹھ جانا" وہ پھر بڑبڑایا۔

"ٹھیک ہے......" ملتان کے لیے روانہ ہونے سے قبل اس نے بھائی کو میسج کر دیا تھا۔ چار گھنٹوں کے تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ نعیم بھائی کے ہاں پہنچے۔ بھابھی نے خوب آؤ بھگت کی...... جنت مکانی ابا زندگی میں ہی بیٹوں کے کان میں بات ڈال گئے تھے کہ ورثہ تو معاف کر دیا ہے لیکن خاطر مدارت معاف نہیں...... کبھی میری بیٹی کو شرمندہ نہ کرنا۔"

کھانے کے بعد ارتضیٰ اسے بات کرنے کا

www.pklibrary.com

اشارہ کر کے خود سونے کے بہانے گیسٹ روم میں چلا گیا۔

کپکپاتی ٹانگوں کو سہارا دے کے وہ بھائی کے پیچھے پیچھے ہی ڈائنگ روم سے باہر آ گئی۔

"بھائی جان آپ مصروف تو نہیں؟" اسے خود بھی اپنی آواز اوپری سی محسوس ہو رہی تھی۔

"نہیں گڑیا...... کیوں کوئی کام ہے؟" انہوں نے کہا۔

"وہ آپ سے کچھ کام تھا ضروری۔" اس نے انگلیوں کو مروڑتے ہوئے فقرہ مکمل کیا۔

"تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔ دو منٹ میں۔"

ثناء پھر اللہ سے مدد مانگتے ہوئے آنے والے مرحلہ کی ٹینشن لیے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ ابوبکر کتاب لیے لاؤنج میں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑھنے میں مگن تھے۔ بھائی کے بچے اور اس کے بچے کمرے میں کھیل رہے تھے۔ ریواڑی کا سوہن حلوہ اور شاپنگ کے بڑے بڑے شاپر بھی کمرے میں موجود تھے۔ اس کا مطلب ہے اس کی آنے کی اطلاع ملتے ہی بھیا نے بھابھی کو شاپنگ کے لیے بھجوا دیا ہوگا اسی لیے کھانا گھر کا کم ہی بنا تھا ہوٹل سے منگوایا معلوم ہو رہا تھا۔

دو تین منٹ میں بھائی اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ "خیریت تو ہے ثناء کچھ پریشان سی نظر آ رہی ہو؟"

انہوں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ ایک عام سا فقرہ تھا...... پر اسے بے طرح سے ابا یاد آ گئے۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہو گئیں۔

"بولتی کیوں نہیں ہو کیا بات ہے؟ کیا ارتضیٰ بھائی کی طرف سے پریشان ہو؟" انہوں نے تکا لگایا۔

"بھیا! ہمارے مالی معاملات بہت خراب ہیں۔" اس سے آگے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔

"اوہ...... تو بتایا کیوں نہیں میں چیک بھجوا دیتا تمہیں...... کمال کرتی ہو۔"

"چیک نہیں بھائی جان۔" ارتضیٰ کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں انہیں کچھ زیادہ رقم درکار ہے۔" اس کے ہر مسام سے پسینہ بہنے لگا۔

"بڑی رقم...... کتنی؟ میں کیسے دوں گا؟ مہنگائی بہت زیادہ ہے...... بڑی رقم کا تو بس میں بھی خواب ہی دیکھتا ہوں۔ آمد و خرچ میں توازن رکھتے رکھتے ہلکان ہو جاتا ہوں...... پر میں تو کسی کو نہیں بتا سکتا ناں۔" ان کے لہجے میں تلخی سی در آئی۔

"نہیں بھائی جان آپ سمجھے نہیں۔ میں آپ سے بطور قرضہ لینا چاہتی ہوں۔" وہ روہانسی ہو کے بولی۔

"بات تو ایک ہی ہے کان ادھر سے پکڑ لو یا ادھر سے۔ چاہیے تو تم لوگوں کو رقم ہی...... بھئی پانچ سات ہزار کی حد تک تو ٹھیک ہے کاروبار کے لیے لاکھوں میں کہاں سے دوں......؟" وہ سخت جھنجلا کے بولے۔

"وہ...... دراصل ارتضیٰ نے مجھے کہا ہے کہ بھائیوں سے حصہ لے کے آؤ۔" ہکلا ہکلا کے اس نے بات کہہ دی۔

کیا......؟ وہ طیش میں صوفے سے اٹھے۔

"ہر عید بقرعید پر اپنے بچوں سے زیادہ تمہارا خیال رکھتا ہوں۔ ہر آئے گئے کے ہاتھ موسم کی سوغات بھجواتا ہوں۔ کسی خوشی میں تمہارا حصہ پہلے نکلتا ہے کون سا حصہ مانگ رہا ہے...... وہ۔"

انہوں نے گالی نما لفظ آدھا نکال کے زبان اندر کی۔ ثناء بہت بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے ارتضیٰ کا مطالبہ من و عن اسی کے الفاظ میں دہرا دیا۔

جلے پاؤں کی بلی بلکہ بلے کی طرح وہ دو چار منٹ کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ پھر دونوں بھائیوں سے فون پر بات کی۔ ثناء دم سادھے سب

www.pklibrary.com

دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنے آپ سے بھی نفرت محسوس ہورہی تھی۔

"ٹھیک ہے کلیم بھائی کل آن لائن بھجوائیں گے پیسے ...... لے کے جاؤ گی یا میں چیک بھجوا دوں؟" کھردرے انداز میں وہ ثناء کی طرف دیکھے بغیر بولے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اسے بھائیوں پر غصہ تھا اور ارتضٰی سے نفرت ...... کس مقام پر اسے بیچ دیا ہے اس نے۔

"میں اپنی رقم کا بندوبست کرنے جارہا ہوں۔ تمہارا حق ہے تم لے جاؤ...... لیکن ثابت تم نے یہی کیا ہے کہ بھائیوں سے زیادہ حصہ عزیز ہے۔"

ثناء وضاحت کرتے کرتے رک گئی۔ اس کو اپنے مرحوم باپ کا قول یاد آ گیا۔ اگر بیٹھے نظر نہیں آتے تو کھڑے ہو کے مت دکھاؤ۔ اس وقت وضاحت کا مطلب بھائی کو مزید اشتعال دلانا تھا۔ وہ پتھر بنی بیٹھی رہی۔

اس کی طرف قہر آلود نظر ڈال کے وہ ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔ بھابھی کا رویہ بھی سخت تکلیف دہ تھا۔ ایک دم ان کے بچے بھی غائب ہو گئے۔ تین چار گھنٹے وہ ڈھیٹوں کی طرح اکیلی دوسروں سے بات کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

شام گئے اس نے بے رخی کے اس رویے سے بددل ہو کے واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ اسے کروڑوں کھربوں کی آبرو مٹی بنی نظر آئی۔

لفظ ذلت کا مطلب اسے آج سمجھ میں آیا تھا۔ بھابھی نے گلے لگایا نہ بھائی جان نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سوہن حلوے کے ڈبے شاپروں سے جھانک جھانک کے اسے استہزائیہ دیکھتے رہے۔ بچوں کے لیے خریدے کپڑے وہیں پڑے رہے...... خالی ہاتھ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

ارتضٰی کے ماتھے پر بھی بل ہی بل تھے۔

ملتان سے نکلتے ہی اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟"

"بھیا کل چیک بھجوا دیں گے...... بات کرلی تھی میں نے۔"

"اور کیا کہا......؟" اس نے قصہ کی تفصیل پوچھنا چاہی۔ ثناء خاموش رہی...... فی الوقت تو اس کا دنیا کے ہر رشتے پر اعتبار اور اعتماد اٹھ چکا تھا...... بھائی نہ شوہر دونوں مطلبی نکلے...... دونوں کو زن سے زر زیادہ عزیز تھا۔ رشتوں کی نزاکت کسے کہتے ہیں احساس کیا ہوتا ہے سب جائے بھاڑ میں۔

یہ زندگی کا ڈراؤنا مرحلہ اور اس سے بھی زیادہ دہشت ناک سفر تھا...... رات کے وقت سفر کرنا بھی ان دونوں میاں بیوی کو پسند نہیں تھا بھائی کا برا رویہ ناخنوں کو گوشت سے جدا کرنے سے بھی زیادہ دردناک تھا۔

☆☆☆

وقت رکتا نہیں ہے۔ دو دن ارتضٰی مسلسل رٹو طوطے کی طرح پوچھتا رہا...... نعیم بھائی نے چیک بھیجا؟ کوئی میسج یا فون آیا۔ ثناء کے پاس ان سوالات کا جواب سوائے خاموشی کے کچھ نہیں تھا...... ایک دو دفعہ معذرت اور معافی کے لیے اس نے بھائی بھابھی کا نمبر ملایا مگر نمبر اٹینڈ نہیں ہوا...... دو دن کے بعد ارتضٰی کی بے قراری کو قرار آ گیا...... اس کے ماتھے کی شکنیں مسکراہٹ میں بدل گئیں۔ اس نے زبان سے نہیں بتایا لیکن اس کا رواں رواں بتا رہا تھا کہ اسے چیک مل چکا ہے...... اس نے بہت فراخدلی سے ثناء کو آؤٹنگ کے لیے شمالی علاقہ جات جانے کی پیش کش کی۔ ثناء نے بچوں کی پڑھائی کا کہہ کے انکار کر دیا۔ ارتضٰی نے سونے کی چوڑیاں بریسلیٹ یا گولڈ کی کوئی چیز لے کے دینے کی پیشکش کی لیکن ثناء نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ دل کی خوشی اس سے روٹھ چکی تھی۔ اپنے ماں جائے بھائی اور اپنے دکھ سکھ میں ساتھ نباہنے کا دعویٰ کرنے والے شوہر دونوں کے لیے اس کے جذبات برف کی سل کی مانند تھے۔

اس نے میاں سے یہ بھی نہیں پوچھا رقم کتنی ہے اور کیسے، کس کی طرف سے ملی ہے؟ آیا یہ ایک بھائی کا

www.paklibrary.com

اظہار ناراضی ہے یا تینوں کا مشترکہ پلان......اس کا جواب اسے چند ہفتوں کے بعد مل گیا۔ اس کی کزن حرا کا فون آیا۔

''نعیم بھائی کے سسر فوت ہو گئے تھے تم نہیں آئیں......؟''

''کون فوت ہوا؟'' ثناء کو لگا جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''تمہاری ملتان والی بھاوج کے ابو......نعیم بھائی کے سسر۔ میں جنازہ اٹھنے تک دیکھتی رہی تم کہیں نظر ہی نہیں آئیں۔'' اس نے کہا۔

''سدرہ بھابھی کے ابو؟ کب فوت ہوئے وہ کیا ہوا تھا انہیں؟'' وہ چیخ کے بولی۔

''ہارٹ اٹیک ہوا تھا......سدرہ بھابھی بھی ان کے انتقال کے بعد ہی پہنچیں بہت رو رہی تھیں دو مرتبہ بے ہوش بھی ہوئیں۔ پچھلے پیر کی بات ہے۔ آج کیا دن ہے؟ ہفتہ گیارہ بارہ دن تو ہو گئے ہیں۔ کیا بات ہے ثناء کیا تمہیں نہیں بتایا......کوئی ناراضی چل رہی ہے یا......'' حرا اپنی دھن میں مگن بولے جا رہی تھی۔

ثناء کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے......

اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ اس نے حرا کو خدا حافظ کہا یا نہیں......بس یہ یاد تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے گول گول دائرے گھوم رہے تھے......یا شاید وہ خود گھوم رہی تھی کچھ یاد نہیں......ارتضیٰ آئے اس نے ان سے ذکر کیا، کھانا کھاتے کھاتے اس نے ثناء کی طرف دیکھا اور بے نیازی سے بولا۔

''اسی دن مجھے پتا چل گیا تھا ان کی ڈیتھ کا۔''

''کیا؟ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا......وہ تو پہلے ہی خفا ہیں مجھ سے کیا کہیں گے بھائی جان......''

وہ ذہنی شاک میں تھی۔

''نہیں، وہ کچھ نہیں کہیں گے بے فکر رہو۔ جو کہنا تھا وہ بہت دن پہلے کہہ چکے ہیں۔'' وہ تمسخر اڑاتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب۔'' اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو کے ایک دم ہی رک گئی۔ اس کی زبان پر کانٹے اگ آئے۔

''چیک کے ساتھ ایک میسج بھی تھا۔ اپنا حصہ یا بھائی ایک چیز ہی مل سکتی تھی۔ آئندہ ہمارا تمہاری کسی خوشی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

چھن سے کوئی چیز ثناء کے اندر ٹوٹی۔ اس کا شور اتنا شدید تھا کہ اس نے کانوں میں انگلیاں رکھ لیں۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

''ایسے نہیں ہو سکتا بھائی جان ...... بھائی جان!'' اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ آنکھیں صحرا بن گئیں بس ٹکر ٹکر ارتضیٰ کی شکل دیکھتی رہی۔

☆☆☆

''ماما! کیا بابا کہیں باہر جا رہے ہیں؟'' ثناء کی بیٹی عینا نے ایک دن رازداری سے پوچھا۔

''کیوں؟'' ثناء کے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔

''ٹی سی ایس سے ان کے کچھ کاغذات آئے تھے جرمنی کی ایمبیسی کی طرف سے۔ جب آپ پرسوں آنٹی فردوس کی طرف گئی تھیں تب بابا پاسپورٹ بھی بنوا کے لائے تھے...... مجھے لگتا ہے ان کی تیاریاں مکمل ہیں۔'' عینا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ہو سکتا ہے!'' ثناء نے بات ٹال دی۔

بھائیوں کی طرف سے بائیکاٹ کے سنگین فیصلے کے بعد اسے ہر اذیت ہر دکھ معمولی محسوس ہوتا۔ بڑی سے بڑی اور بری سے بری خبر بھی آسانی سے برداشت کر جاتی تھی۔ عینا کا گمان سچ ثابت ہوا اور ارتضیٰ ایک مرتبہ پھر باہر جانے کے لیے تیار تھا۔

ثناء ذہنی طور پر اتنی منتشر ہو چکی تھی کہ بولتی تو فقرے منہ سے بے ربط نکلتے۔ چلتی تو دو پاؤں آگے کو رکھتی دو پیچھے کو آتے۔ کھاتی تو لقمہ چباتے چباتے خیالوں میں کھو جاتی۔ کیا سہانے دن اور حسین یادیں تھیں۔ ندیم بھائی اس کے کرائم پارٹنر تھے۔ وہ ابا اماں دونوں کی لاڈلی تھی۔ ہر جرم میں اس کو بھلے انگلی برابر

شریک کرتے مگر اس کے سر پر سارا ملبہ ڈال کے بری ہو جاتے...... کلیم بھائی بے ضرر سے...... اس کی پونیاں لاتے، چوڑیاں پہناتے اور تو اور اس کے منے منے ہاتھوں پر مہندی بھی لگا دیتے۔ اس کے سر میں بادام کے تیل کی مالش کرتے۔ اس کی پسند کی تمام چاکلیٹس لے کے دیتے۔ "میری جگنو، میری گڑیا، تتلی، میری باربی ڈول، شہزادی، میری رانی۔"

اس کی یادوں کا سلسلہ یہاں تک پہنچتا تو وہ دل تھام کے بیٹھ جاتی...... اسٹور روم میں جا کے چھپ چھپ کے روتی...... جتنے آنسو پونچھتی اس سے زیادہ پھر نکل آتے۔ ان ڈیڑھ دو سالوں میں سوائے کلیم بھائی کے عید مبارک کے میسج کے اس کا رابطہ میکے سے منقطع تھا۔

اسے ابا یاد آتے۔ اماں یاد آتیں اور وہ رضائی میں منہ دے کے دھاڑیں مار مار کے روتی...... کبھی دل چاہتا اونچی آواز میں بین ڈالے اور دنیا کو بتائے۔ لوگو مرے ہوؤں پر صبر آجاتا ہے زندوں پر صبر نہیں آتا۔ اسے بہن کی کمی محسوس ہوتی۔ بھری دنیا میں کوئی کندھا نہیں تھا جس پر سر رکھ کے وہ اپنا غم ہلکا کر لیتی۔ پھر بس اس کا رب ہی اس کا غم سنتا۔ اس کو تسلی دیتا۔

"دیکھو مجھ سے مانگ کے بھی کوئی نامراد نہیں ہوا۔" (ط)۔

دیکھو پوری خلقت ایک ہی وقت میں اپنی اپنی زبان میں الگ الگ فرمائش کرے میں بلاشبہ سب کی سنتا بھی ہوں اور عطا بھی کرتا ہوں۔ میں صرف سمیع الدعوات ہی نہیں مجیب الدعوات بھی ہوں۔ ہاتھ اٹھانے والے کو خالی ہاتھ بھیجتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں مانگنے والوں کو عطا ضرور کرتا ہوں جو مانگتا ہے وہی دے دیتا ہوں اس کی بڑی مصیبت ٹال دیتا ہوں یا آخرت کے مشکل ترین دن کے لیے جمع کر لیتا ہوں۔"

بس یہ وہ سنگی ساتھی تھا جو اس کے رنج کو ہلکا کرتا۔ روتے بلکتے وہ اس کے در پر سر رکھتی۔ سر اٹھاتی تو اس کے اشک اس کا منہ چوم رہے ہوتے۔ اس کے الفاظ اور ان کا جواب اس کا قرار بن جاتے۔ وہ بیٹری چارج کروا کے جائے نماز لپیٹتی اور ظالم دھوکے باز زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتی۔

☆☆☆

ایک دو مرتبہ اس نے میاں کو بتائے بغیر نعیم بھائی سے رابطہ کی کوشش کی...... اس کا فون کاٹ دیا گیا۔ اس نے اسمارٹ فون لیا۔ وہ ایک دن بھائی کی ڈی پی پر ان کی تصویر دیکھتی اور اندر ہی اندر آنسو پیتی رہی...... پھر ڈی پی بھی صاف ہو گئی بالکل سفید ان کے خون کی طرح۔

عینا نے بتایا "امی ماموں نے آپ کا نمبر بلاک کر دیا ہے۔"

"نمبر بلاک کر دیا ہے؟ وہ کیوں؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ اور جب یاد آیا تو رونے کا وہ دورہ پڑا جو کبھی نہیں پڑا تھا۔

"شعب ابی طالب" کا مطلب اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ آپ غربت برداشت کر سکتے ہیں آپ مرنے والوں کا غم برداشت کر سکتے ہیں آپ بے عزتی بھی سہہ سکتے ہیں لیکن اپنے سگے رشتہ داروں کی لا تعلقی، ان کا سوشل بائیکاٹ برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔

اسے اب پتا چلا کہ مکہ کی ابتدائی زندگی میں ہی شعب ابی طالب کی آزمائش کیوں آئی تھی اس لیے کہ سیدہ خدیجہ اور پیارے چچا ابو طالب کے جانے کا دکھ بھی بعد میں ہلکا لگے...... اپنا جم پل مکہ چھوڑ کے جانا پڑے اپنے ساتھی چھوڑ کے جانا پڑیں تو ذہن پر بوجھ نہ ہو کہ شعب ابی طالب کا مرحلہ سب سے دشوار تھا۔

وہ بھی شعب ابی طالب کے فیز سے گزر رہی تھی......!!! میاں بھی جرمنی جا چکا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ چکا تھا۔ بچوں کی جی بھر کے فرمائشیں پوری کر چکا تھا۔ وہ گھر والوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہی جا رہا تھا ناں......! ثناء نے سمجھوتہ کر لیا۔ عینا بڑی ہو گئی تھی۔ ارتضیٰ کو قدرت نے

www.pklibrary.com

فراخ رزق کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ ارتضیٰ کے جانے کے بعد چار چھ ماہ میں اخراجات کو کنٹرول کر کے اپنے زیورات کو فروخت کر کے وہ اتنی رقم جمع کر چکی تھی کہ بھائیوں سے لیا قرضہ واپس کر سکے ...... اسے اپنے بھائی چاہیے تھے۔

☆☆☆

ارتضیٰ وہ اڑھائی سال کے بعد واپس آیا تو اس کا رویہ ثنا کے ساتھ بہت اچھا تھا...... اٹھتے بیٹھتے وہ ثنا کا معترف ہوتا جس نے میاں پر پیسہ بھی نچھاور کیا اور وقت بھی۔ قدرت نے ارتضیٰ کی دولت اور وجاہت میں اضافہ کیا تھا جبکہ ثناء کے وقار میں......

وہ ایک گریس فل لیڈی کے روپ میں ارتضیٰ کے ساتھ ملتان گئی ...... عینا اور چھوٹا بیٹا اس کے ساتھ تھے ......ابوبکر انجینئرنگ میں مصروف تھا۔ اس نے خود ہی جانے سے معذرت کرلی تھی۔ بھائی کے شہر میں پہنچ کے اسے گزرا عرصہ یاد آیا...... کئی ڈنک مارنے والی یادیں ...... سر جھٹک کے وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہوگئی۔

بھائی کے گیٹ پر اب رونق نہیں تھی پرانا بھدا گیٹ ...... جگہ جگہ سے اکھڑا سیمنٹ ...... پرانی دیواریں۔ عینا نے آگے بڑھ کے گیٹ کے ایک طرف لگی بیل پر انگلی رکھی۔ چند سیکنڈ میں بھتیجا باہر آیا...... شاید اس نے پہچانا نہیں تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا...... تینوں اندر داخل ہوئے۔ ثنا کی سانس رک رہی تھی۔ سخت سردی میں اسے پسینہ آ رہا تھا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ لاؤنج میں پہنچی۔ بھائی اخبار پڑھ رہے تھے۔ ارتضیٰ کے بدلے حلیے سے انہوں نے بھی شاید نہیں پہچانا۔

"بھائی جان میں ثناء ہوں۔" نمکین پانی سے گھلی آواز میں ثناء نے سر نیچے کیا۔ مرے مرے ہاتھوں سے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بیٹے نے کچن میں مصروف ماں کو شاید مہمانوں کی آمد کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ تحیر سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"السلام علیکم بھابھی جان۔" ثناء مودب ہو کے بولی۔ شاید ان کی ظاہری شان و شوکت سے وہ مرعوب ہوگئی تھیں۔

"بیٹھیے آپ کھڑے کیوں ہیں؟" وہ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

"ارتضیٰ جرمنی چلے گئے تھے اڑھائی سال کے بعد واپس آئے ہیں اب انہوں نے واپس جانا تھا میں نے سوچا میں آپ لوگوں سے مل بھی لوں اور آپ کی امانت بھی لوٹا دوں۔"

ثناء نے بات میں تجسس کا رنگ پیدا کرنے کے لیے بات ادھوری چھوڑ دی۔ نعیم بھائی کی آنکھیں ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوئیں پھر لاتعلقی کا رنگ نمایاں ہوگیا۔ ثناء نے ہینڈ بیگ سے ایک شاپر نکالا۔ نعیم بھائی کو شاپر تھمایا...... "یہ کچھ پرفیومز آپ کے لیے ہیں اور ملٹی وٹامنز ٹیبلٹ بھابھی کے لیے ...... بچوں کے لیے چاکلیٹ ...... یہ آپ کی امانت۔" اس نے ایک اور چھوٹا سا بیگ نکالا۔ "یہ آپ سے ادھار لی ہوئی رقم واپس کرنے آئی ہوں۔"

"کون سی رقم؟" فوری فقرہ نعیم بھائی کے منہ سے نکلا۔

"وہی جو پانچ سال قبل آپ سے ادھار مانگی تھی حالات بالکل اچھے نہیں تھے ہمارے ...... میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ میں آپ کو واپس کر دوں گی...... الحمدللہ! اللہ نے بہت کرم کیا ہے۔ یہاں پر جو دکان تھی اس کا کرایہ بھی لاکھ سے اوپر ہے بینک والوں نے وہ شاپ دس سال کے لیے رینٹ پر لے لی تھی...... ارتضیٰ تو الحمدللہ ویسے ہی بہت اچھی جاب پر ہیں وہاں ...... نہ بھی ہوتے تو رقم آپ کو میں نے واپس ہی دینا تھی۔ مجھے اپنے پیارے بھائی چاہئیں رقم یا جائیداد کسی کی بھی قبر میں ساتھ نہیں جاتی۔"

وہ نعیم بھائی کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دے کے جذباتی ہو رہی تھی۔

بھابھی گرما گرم چائے کے ساتھ لوازمات وافر مقدار لے آئی تھیں۔ "نہیں بس ہمیں اب اجازت دیں۔"

نعیم بھائی کے ہونٹوں پر تالے لگے ہوئے تھے

www.pklibrary.com

تھے۔ بھابھی تیزی سے آگے بڑھیں۔ ”ایسے ہی کیسے جانے دیں گی۔ میں جانے دوں گی تو جائیں گی ناں۔“ پھر میاں کی طرف چبھتی نظروں سے دیکھا۔

”ایک اکلوتی بہن آپ کے پاس آئی ہے آپ نے کیا گونگے کا گڑ ڈال لیا ہے منہ میں......“

نعیم بھائی نے گونگے کے گڑ کی ڈلی منہ سے نکال پھینکی اور قدرے خجالت سے بولے۔

”یہ رقم میں نہیں لوں گا۔“

”نہیں بھائی میں نے واپسی کا ٹکٹ لے لیا تھا لینا تو پڑے گی ورنہ میں جارہی ہوں۔“

”نہیں نہیں بیٹھو گڑیا۔“

انہوں نے جلدی سے رقم والا لفافہ تھام لیا...... چند ہی منٹوں میں منظر صاف شفاف تھا...... اگر درمیان کا پانچ سالہ عرصہ نکال دیا جائے تو رشک اور محبت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا...... ہنسی مذاق چلتے۔

ملتان میں رات قیام کرنے کے بعد وہ لوگ علی الصبح روانہ ہوئے۔ عمیر احسن نعیم ڈاکٹری کے آخری سال کا طالب علم تھا۔ ...... خوب صورت صبح ہی ان کے لیے بھرپور ناشتہ لے کے آیا۔ نذر کرکے دس طرح کی ملتان کی سوغات، تحفے تحائف، کپڑے سب ڈگی میں بھرے جاچکے تھے۔ ایک سیکنڈ کے لیے شاہ کو آخری مرتبہ اس گھر سے نکلنے کا منظر یاد آیا۔ ان کے لیے کی گئی شاپنگ ان کے حوالے نہیں کی گئی تھی...... بچے، ملنے سے منع کردیے گئے۔ بھابھی منظر سے غائب اور بھائی کی قہر آلود نظریں......!!

شاہ نے سر جھٹک کر ان مکروہ یادوں کو پیچھے پھینکا اور بھتیجے بھتیجیوں سے مل کے بھائی سے سر پہ ہاتھ پھروا کے شاہ لوگ ملتان سے آگئے۔

☆☆☆

بھابھی کیا خوش تھا بھرا آ گیا تھا آتے ہوئے وہ بھائی کو گجرانوالہ آنے کی دعوت دے کے آئی تھی...... جو ”کیوں نہیں“ ”ضرور آئیں گے“ کہہ کے قبول کرلی گئی تھی...... ارتضیٰ کی فلائیٹ سے ایک دن قبل نعیم بھائی، بھابھی بچے اس کی طرف آگئے۔ نیلے رنگ کی پیور شفون پہ کامدانی والا سوٹ...... ارتضیٰ کے لیے نفیس کڑھائی والے کرتا شلوار اور بچوں کے ڈھیروں تحائف۔

”بھابھی ابھی تین دن قبل تو اتنا کچھ دے کے بھیجا تھا آپ نے۔“ شاہ نے کہا۔

”لوتو پہلی مرتبہ آئے ہیں خالی ہاتھ آجاتے۔ کیسی بے گانوں والی باتیں کرتی ہو۔ ارے ہم تو غیروں کے ہاں بھی خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ تم تو پھر اپنی ہو۔ گڑیا گڑیا کرتے زبان نہیں تھکتی تھی تمہارے بھائی کی۔“

بھابھی محبت سے سرشار بولے جارہی تھیں۔

”یار ارتضیٰ! فلائیٹ کتنے بجے ہے تمہاری۔“ بھائی جان نے پوچھا۔

”کل صبح سات بجے۔“ ارتضیٰ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ہم ایئرپورٹ ساتھ ہی چلیں گے۔“ انہوں نے آئندہ کا پروگرام بتایا۔ ”بلکہ جانے سے پہلے ایک چیز لے کے جائیں گے۔“ انہوں نے پراسرار ذومعنی بات کی۔

”ایک امانت تم نے واپس کی ایک امانت ہم لینے آئے ہیں۔“ وہ شرارتی لہجے میں بولے۔

”ہمیں عینا دے دو...... عمیر احسن کے لیے۔“

خلاف توقع ارتضیٰ کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا لیکن شاہ کے چہرے پر محبت اور اقرار کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔

دوستانہ ماحول میں کھانا کھایا گیا...... ارتضیٰ ان سب کو لے کے رات گھومنے پھرنے نکل گیا۔ صبح اس کی فلائیٹ تھی، معذرت کرکے وہ واپس آتے ہی سونے کے لیے بیڈروم میں چلا گیا۔

نعیم بھائی نے شاہ کو پکڑا...... ”کیا بات ہے ارتضیٰ نے جواب نہیں دیا۔ مجھے تو لگتا ہے شاید وہ اس رشتہ کو پسند نہیں کررہا۔“

”نہیں نہیں بھائی جان ایسی کوئی بات نہیں سو وہ تین ماہ اپنوں میں رہ کے واپس جارہے ہیں۔ اس لیے چپ ہوں گے۔ مجھے پتا ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔ میرا آپ کے سوا ہے کون؟ کلیم بھائی تو افریقہ کے گھنے جنگلوں میں گم ہیں۔ ندیم بھائی

بھی کوئٹہ کبھی لورالائی کبھی سبی، آپ فکر نہ کریں میں منالوں گی اگر وہ کچھ کہیں گے تو۔" اس نے بھائی جان کو تسلی کی اچھی خاصی ڈوز دے دی۔

ایئر پورٹ پر سبھی گئے۔ بہت گرمجوشی سے بھائی کی فیملی نے انہیں رخصت کیا۔ ایئر پورٹ پر ہی کلیم بھائی اور ندیم بھائی سے ان سب کی ویڈیو کال کے ذریعے بات چیت بھی کروائی۔

ایئر پورٹ سے واپسی کے سفر میں ثناء ذہنی اور جسمانی طور پر بہت تھک چکی تھی۔ دل چاہتا تھا کوئی بڑا سا پنگھوڑا ہو وہ آنکھیں بند کر کے اس میں لیٹ جائے اور کوئی جھولا دیتا رہے۔ وہ جھولتے جھولتے اپنی نیند پوری کرلے۔ تین ماہ ارتضٰی کی مصروفیات نے اسے بھی ڈسٹرب رکھا۔ کبھی تیس تیس گھنٹے مسلسل جاگتے گزرتے اور کبھی دن میں وقفے وقفے سے سارا دن اونگھتی رہتی۔ نعیم بھائی لوگ واپس ادھر ہی آئے۔ حالانکہ لاہور ایئر پورٹ سے ملتان بھی جایا جاسکتا تھا۔ اونگھتے ٹہلتے اس نے سفر مکمل کیا۔ بھائی جان اسے ایسے ہی ٹریٹ کر رہے تھے جیسے بچپن میں ننھی سی گڑیا سمجھ کر کرتے تھے۔

"شاید یہ اتنے سالوں کی ندامت ہے جو اب بھرپور توجہ کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہے۔"

اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ عینا مسلسل ماموں مامی کی شفقتوں اور مہربانیوں کے مزے چکھ رہی تھی۔ دو دن کے بعد وہ لوگ ملتان روانہ ہوئے۔ جاتے ہوئے دس بار نعیم بھائی نے پوچھا۔

"ہاں بھئی ثناء تم نے بات نہیں کی ارتضٰی سے۔"

ثناء مسکرائی۔ "ہائے نہیں بھائی جان، ابھی کئی ہفتے وہ جا کے بچوں کی طرح مس کریں گے پاکستان کو۔ پھر کہیں جا کے کسی سنجیدہ موضوع پر بات ہو سکے گی۔"

ثناء نے دل میں سوچا اس سنجیدہ موضوع پر بات تو کر چکی تھی۔ لیکن اس نے بھائی بھابھی کے سامنے ظاہر نہیں کیا۔ پہلے تو ارتضٰی یہ سنتے ہی جھٹکے سے اکھڑ گیا۔

"ارے تم کیسی بھولی ہو۔ بھول گئی ہو ان کا بدترین رویہ؟ ہماری کسی بھی خوشی میں شامل ہوئے نہ اپنی کبھی خوشی میں کرنے دیا؟"

"لیکن بھائیوں کے سامنے تو کوئی اور رشتہ منظور نظر ہو ہی نہیں سکتا۔" ثناء کے دوٹوک موقف نے ارتضٰی کو چپ کروا دیا۔

بہر حال ثناء کو یقین تھا وہ قائل کر لے گی۔ اپنے طور پر اس نے عمیر احسن کے دوستوں سے معلومات بھی لے لی تھیں۔ ابو بکر سے کہہ کے اس کی فیس بک سے جتنی معلومات لے سکتی تھی اس کی پسند ناپسند اس کے دوستوں کی کمپنی سب اس کے علم میں آچکا تھا۔

وہ تو اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے نعیم بھائی اس کو اپنے بچپن میں لگتے تھے...... ندیم بھائی اور نعیم بھائی میں یہی فرق تھا...... اسی خوشی ان کی غلطیاں وہ اپنے سر پر لے لیتی تھی۔ اب بھی تاریخ ایک بار اپنے آپ کو دہرا رہی تھی اور وہ ایسا ہی کرنے جا رہی تھی۔

عمیر کی ہاؤس جاب مکمل ہونے پر دونوں کے رشتہ کی بات پکی کر دی گئی...... جوں ہی عمر کو مقامی ہسپتال میں نوکری ملی انہوں نے شادی کا پیغام بھیج دیا ...... ارتضٰی بھی وطن واپس آچکا تھا...... زور و شور سے دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں...... ثناء ماضی میں گزرے تلخ سالوں کی یادیں بھلا چکی تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا اس کے بھائی اسے مل گئے تھے وہ روزانہ ان کے رابطے میں تھی۔ وہ آپس میں ہر چھوٹے بڑے موضوع پر گھنٹوں بے تکان باتیں کرتے تھے۔ بالعموم اماں ابا کی یادوں سے گفتگو کی پٹاری کھلتی اور سب جانے والوں کو یاد کر کے موجودہ حالات نئی نسل ان کی دلچسپیوں اور مصروفیات کے تقابلی جائزے پر ختم ہوتی......!!

"اپنا مارے گا تو چھاؤں میں ہی پھینکے گا۔" جب بھی ثناء کے لیے غیروں سے ایک دو رشتے آئے اماں مرحومہ نے یہی کہہ کر رد کیے تھے۔ اب ثناء بھی عینا کے سامنے یہی فقرے گوش گزار کرتی......

"ماموں مامی اپنے ہیں پہلے سے پتا ہے کیسے

www.pklibrary.com

ہیں۔ غیروں کی تو پرتیں کھلتے کھلتے سال بیت جاتے ہیں۔ عینا ہمارے سامنے ہی تو پروان چڑھی ہے ہماری آنکھوں کے سامنے۔ یہ بھی تو چھاؤں میں ہی پنپے گا۔"

☆☆☆

ثناء کی شادی لیا کی بیماری اور پھر موت کی وجہ سے شادی تو نہ سکی تھی ہاں ازدواجی زندگی ضرور تھی۔

عینا کی شادی بہت اچھے حالات میں ہو رہی تھی۔

عینا کی ممی کے سوٹ جوتے جیولری یہاں تک کہ برائیڈل کے بارے میں واٹس ایپ پر سینکڑوں تصاویر موصول ہوتی تھیں۔ جس میرج ہال میں بکنگ کروائی تھی بھائی جان نے اس کے کئی ویڈیو کلپ بھیجے۔ دونوں گھرانے اس شادی کو "فل انجوائے" کر رہے تھے۔ ثناء بیٹی کی رخصتی اور جدائی کا سوچ کے رنجیدہ ہوتی تو بھائی جان لطیفے سنا سنا کے قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے۔

پھر عینا کی رخصتی کا دن آ گیا۔ ارتضیٰ نے زمانے بھر کی سہولتیں اسے فراہم کیں۔ داماد کو گاڑی تک سلامی میں دے دی باقی کیا رہ جاتا تھا...... عینا شادی والے دن بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ فطرتاً وہ معصوم اور سادہ تھی، عام لڑکیوں والی تو الشیر بہت کم تھیں۔ دل کی صاف تھی، میل آتا کسی کے متعلق تو فوراً اماں کو بتاتی۔ مشورہ کرتی اور عمل کر گزرتی۔

عینا کی رخصتی پر ثناء کا دل بہت بوجھل ہو گیا۔ کیا اس لیے نو ماہ پیٹ میں رکھا۔ پالا، بڑا کیا کہ دوسروں کے حوالے کر دے۔ رہ رہ کے دل میں ہول پڑتے۔ اس کا زرد رنگ اور آنسوؤں بھرا چہرہ دیکھ کے نعیم بھائی ملتان نہیں گئے...... رک گئے ارتضیٰ نے بہت کہا۔

"بھائی جان آپ کی ضرورت ہے وہاں...... ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

نعیم بھائی کی موٹی عقابی آنکھوں میں چشمہ نظر آ رہا تھا۔ پہلا قطرہ ان کے رخسار پر گرا...... وہ بولے "ثناء ہماری بہن ہی نہیں بیٹی بھی ہے۔ میں اسے ایسے مطلب اس حال میں چھوڑ کے کیسے جا سکتا تھا۔" ثناء نے بہت ضبط کیا، آنسو پونچھے بھائی کو کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ڈرائیو پر بٹھا کے آ گئی...... پھر پیچھے تھی ..... مرتبہ کال کی۔

"ثناء کیا حال ہے؟ گڑیا طاقت کی کوئی دوا لے لو۔ دیکھو میں جاتے ہی تمہاری عینا سے ویڈیو کال سے بات کروا دوں گا...... ثناء...... گڑیا...... ثناء۔"

ولیمہ رات کا رکھا گیا تھا۔ عینا حسب توقع بہت پیاری لگ رہی تھی۔

عینا کے میکے کو وی وی آئی پی ٹریٹ کیا گیا......

جس جس طرح ان کا استقبال ہوا۔ ارتضیٰ کے سنجیدہ چہرے پر بھی خوشی کی لہر دکھائی دی۔ کھانا بہت اچھا تھا...... سب رشتہ دار دیر تک بعد اکٹھے ہوئے تھے پتا ہی نہ چلا رات بھیگ کے نور کے تڑکے میں بدلنا شروع ہو گئی اور وہ آپس میں گپ شپ میں ہی مگن تھے۔

میرج ہال نعیم بھائی کے قریبی دوست کا تھا اس لیے وقت کی پابندی والا سلسلہ بھی نہ تھا۔ عمیر اور عینا کو لے کے وہ لوگ واپس آئے نعیم بھائی بھی ساتھ ہی تھے خود ہی قہقہہ لگا کے ارتضیٰ کو مخاطب کیا۔

"یار کل بھی تو عینا کو لینے آنا تھا میں نے سوچا آج ہی ساتھ چلوں۔" ارتضیٰ بھی ہنس پڑا۔

دو ماہ کے مزید قیام کے بعد ارتضیٰ جرمنی چلا گیا۔ ابوبکر کو پنجاب کے انتظامی شہر میں ملازمت ملی وہ مستقل وہیں رہائش پذیر تھا۔ چھوٹے دونوں ابھی نا سمجھ تھے۔ خالی ڈھانڈ گھر ثناء کو کاٹ کھانے کو دوڑتا دل چاہتا اڑ کے ملتان جائے اور عینا کو گلے لگائے۔ اسے پیار کرے اس سے باتیں کرے۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ عینا سے باتیں کر رہی ہوتی تو دونوں بچے اس کا مذاق اڑاتے۔

"ماما آپ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"کسی سے نہیں چلو ہوتم ہوم ورک کرو۔" وہ انہیں ٹالتی۔

"ہوم ورک تو ہم نے کر لیا ماما آپ پہلے بھی عینا آپی سے ایسے ہی اکیلے میں کئی مرتبہ باتیں کرتی رہتی ہیں۔" وہ اصرار کر کے پوچھنے لگے۔

"ماما آپ ایسے کیوں کرتی ہیں؟" آٹھ سالہ محسن نے کہا۔ "میں بابا کو بھی بتاؤں گی اور عینا آپی کو بھی۔ آپ ان سے اکیلے میں باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

www.pklibrary.com

”خبردار اگر ایسا کیا۔ پریشان ہو جائے گی بے چاری......“ لیکن ان فتنہ بازوں نے ماں کی دھمکی کی کوئی پرواہ نہ کی اور جونہی عینا کا فون آیا انہوں نے الف سے لے کے یے تک ماں کی کیفیت کا آنکھوں دیکھا حال سنا دیا۔

”بدتمیز! تم نے مجھے فوری فون کر کے کیوں نہیں بتایا۔“ اس نے آنکھیں دکھائیں۔ رات سے پہلے پہلے عینا ماں کی گود میں سر دیے بیٹھی تھی۔ ثناء شروع میں تو چاؤ...... لاڈ سے باتیں کرتی رہی، کھلانے پلانے میں مصروف رہی، جب گفتگو کے موضوعات کا اسٹاک ذرا کم ہوا تو بولی۔

”عینا بیٹے تمہاری شادی کو تین ساڑھے تین ماہ مکمل ہو چکے ہیں میں نے تم سے کبھی نہیں پوچھا ماموں مامی تمہارے ساتھ کیسے ہیں؟ عمیر کیسا ہے شوہر کی حیثیت سے، دیکھو مجھے ماں نہیں اپنی سہیلی سمجھ کے ہر بات بتانا......“ ثناء نے اسے کھوجا۔

”ماما...... ماموں لوگ میرے ساتھ تو بہت اچھے ہیں۔ محبت کے اظہار میں بھی کمی نہیں بلکہ ماموں تو ہر وقت میری اتنی کیئر کرتے ہیں کہ مجھے اپنے اوپر رشک آنے لگتا ہے۔ عمیر بھی بہت کوآپریٹو اور اچھے انسان ہیں مامی پہلے شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اب ان کے گھٹنوں کا بھی مسئلہ ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کے طور طریقے وہ تو نہیں جو ہم بچپن میں دیکھتے تھے۔

ماموں نے خاصی بڑی رقم انویسٹ کی تھی ایک کمپنی میں...... جو آپ نے ماموں کو لوٹائی تھی وہ ساری رقم ڈوب گئی کمپنی فراڈ کر گئی۔ روز اخبار میں بیان ہوتے ہیں متاثرین کے مگر سننے میں یہی آیا ہے کہ اب کچھ ہاتھ نہیں آنے والا۔ ماموں کو تین ہفتے قبل اسی ٹینشن میں انجائنا کا اٹیک بھی ہو چکا ہے۔ آپ سے اور مجھ سے تو وہ ٹینشن فری بات کرتے ہیں۔ ہر وقت ہنسی مذاق کے موڈ میں ہوتے ہیں ویسے گھر میں وہ خاموش رہتے ہیں ...... کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے۔

اکثر رات کو نیند نہیں آتی تو لاؤنج میں آ کے بیٹھ جاتے ہیں...... صرف اور صرف عمیر کی تنخواہ ہے اسی میں گزارا ہے۔ ماموں کو بہت زیادہ مالی مسائل ہیں جس کی وجہ سے سارا گھر ہی ڈسٹرب ہے اور آپ کو پتا ہے میرا ایمبرائیڈڈ سوٹ بھی مامی نے اپنی بھانجی کا منگوایا تھا ساتھ میں کلر میچنگ جیولری...... سب کچھ اسی کا تھا۔ شادی سے اگلے دن میرے سامنے مامی اسے واپس کر رہی تھیں شکریہ کے ساتھ۔“

”اوہ......“ ثناء کو پریشانی ہوئی۔ ”بھائی جان نے ذکر تو نہیں کیا اتنے سنگین حالات کا۔“

میری شادی کے بعد ہی زیادہ خراب ہوئے ہیں۔ آپ یقین کریں شادی سے دوسرے دن کدو ہوا اس سے اگلے دن بینگن کا بھرتہ...... شام میں آلو انڈے کا شوربہ...... یہ میری شادی کے ابتدائی دنوں کا مینیو ہے۔ ماموں تو چپ رہتے ہیں مامی بھی کبھار تنگی کا رونا روتی ہیں۔

عمیر نے بھی کہا بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات کے علاوہ امی ابو کی ماہانہ ادویات اور آئے دن ہونے والے ٹیسٹوں کا خرچہ ہزاروں میں پہنچ جاتا ہے۔ میں نے تو یہی بات ہے اپنا ایک لاکھ روپیہ حق مہر بھی معاف کر دیا آپ اس کی ٹینشن نہ لیں میں آپ سے نہیں لوں گی۔

ثناء کا دماغ قلابازیاں کھا رہا تھا...... اپنوں کا دکھ اسی وقت محسوس ہوتا ہے جب انہیں اپنا محسوس کیا جائے۔ جب اپنوں کو جڑ سے کاٹ دیا جائے تو دکھ بھی پرائے ہو جاتے ہیں جیسے میرے ساتھ ہوا تھا۔ نمکین پانی کا ایک قطرہ اس کی آنکھ سے حلق تک نجانے کیسے چلا گیا۔

☆☆☆

عینا تو وہ ایک دن کے بعد واپس چلی گئی۔ ثناء کو اب اٹھتے بیٹھتے بس یہی فکر لاحق ہو گئی وہ کون سا طریقہ ہو کہ بھائی کی مدد کر سکے...... اپنے آپ کو بہلاوا بھی دیتی کہ اسے پریشان کرنا نہیں چاہتے ہوں گے اس لیے نہیں بتایا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ماضی کی شرمندگی بھی ہو...... انہی حالات میں وہ مدد کے لیے بھائی کے در پر گئی تھی۔

ایک دم اسے خیال آیا کیوں نہ وہ آہستہ آہستہ وہ

ایک سالوں میں ارتضیٰ کو قائل کرے کہ ہم نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گزار لیا ہے۔ کیوں نہ ہم بچوں کے نام کوئی جائیداد ورثہ طے کر دیں تاکہ عینا کے لیے ہر ماہ مستقل آمدنی کی صورت بن سکے۔ لیکن اسے وہ مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ ارتضیٰ کو قائل کر لی۔ بہت بڑا ایشو بھی بن سکتا تھا یہ۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ اس کا اپنا بی پی شوٹ کر گیا تنگی کے حالات اس نے بھی برداشت کیے تھے اب اپنی بیٹی کے لیے یہ سوچا وہ پسند کا کیسے کھائے گی؟ اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔

بہر حال اس نے ارتضیٰ سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا کہ جو دکان مین بازار میں ہے اس کا آدھا رینٹ عینا کے نام کر دیں...... !!! ارتضیٰ کا نمبر بند جا رہا تھا۔ بے دھیانی میں اس نے عینا کا نمبر ملا دیا۔ اس کی آواز سنتے ہی عینا نے کہا۔ ”ماما آپ کیسی ہیں ہم گجرانوالہ پہنچنے والے ہیں پندرہ بیس منٹ تک۔“

”ارے مجھے پہلے بتا دیتیں، عمیر کی پسند کا کھانا بنا لیتی...... “ثناء نے کہا۔

”نہیں ماما ہم تھوڑی دیر کے لیے آ رہے ہیں ان کا کل سیمینار ہے ضروری واپس جانا ہے ہمیں۔“ عینا نے وضاحت کی...... ثناء ابھی کچن میں لہسن پیاز ڈھونڈ رہی تھی کہ عینا اور عمیر پہنچ بھی گئے۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد عمیر ضروری کام کے لیے گھر سے چلا گیا۔ عینا نے ٹانگیں پسار لیں۔

”ماما بہت ضروری بات ہے...... دل گردے جگر بڑا کر لیں۔“

”خیریت ہے؟“ ثناء کا دل کانپا۔

”ماموں کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کی سرجری کروانا ہے۔ مامی کے بھی گھٹنے سرجری کے محتاج ہو گئے ہیں۔ گھر کی رینوویشن کروا کے اوپر والا پورشن رینٹ پر دینا ہے اس کے لیے بھی کافی سرمایہ چاہیے آپ کے بھائی جان نے درخواست کی ہے کہ ثناء بیٹے ہو سکے تو جو آپ کا حصہ بنتا ہے اگر والدین سے وصول کر سکیں تو سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔“

عینا آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے بول رہی تھی۔ کرب اذیت دکھ سب پیچھے رہ گئے تھے۔ اک اشک تھے جو اس کے اندر کی داستان سنا رہے تھے...... اسے دکھیا ماں کے سامنے ماضی کی ڈسی عورت کے سامنے عریاں کر رہے تھے۔

”مامی نہیں مان رہی تھیں کہ کس منہ سے مانگیں گے آپ؟“

اور ثناء آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاید زلزلہ آیا یا دماغ کی کوئی نس پھٹنے کو تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گھومتا سر تھاما، بہن حصہ مانگے تو بری، بدمعاش، بائیکاٹ کر دو، وہ زخمی ہوئی۔

”یہ کس نے کہا عینا؟“ اس کی آواز دور کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

”ماموں نے...... “عینا بولی...... ”مامی آخر دم تک انہیں منع کرتی رہیں۔“

”اور عمیر نے کیا کہا......“ ثناء کو ماضی میں اپنا منظرنامہ یاد آیا۔

”یہ چپ رہے۔ نہ ماموں کی ہاں میں ہاں ملائی نہ مجھے حرف تسلی دیا۔ نیوٹرل سے......“

عینا، ماں کو دیکھ رہی تھی اور ماں قدرت کی اس ستم ظریفی کو جس نے ثناء کا ہی شکار کیا۔ پہلے بھی اب بھی۔ کون خسارے میں رہا، کون فائدے میں، اس کا فیصلہ تو وقت نے کر ہی دیا تھا۔ جو رقم اس نے بھائی کو لوٹا دی تھی۔ وہ کون سا ان کے پاس رہی۔ فراڈ کے ذریعہ نکل گئی...... کیا یہ نہیں سوچا بھائی نے؟؟

وہ سلگتی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے اس احساس کو بھی دبا رہی تھی جو اس وقت آزردہ کر رہا تھا۔ ورثہ لے کے اس نے برا کیا تھا یا ورثہ واپس دے کے برا کیا تھا۔

یہ فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔ ہاں ایک بات پر اسے یقین کامل تھا وہ یہ کہ اگر شروع سے سارا کام خدائی قانون کے مطابق ہوتا تو وقتی طور پر دلوں پر رنجش کی میل چڑھتی پھر خود ہی دھل دھلا جاتی لیکن اذیت اور جانچنی کے ان مراحل سے نہ گزرنا پڑتا جن سے وہ دوسری مرتبہ گزر رہی تھی۔

☆

رخسانہ نگار عدنان

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ وہ اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سر فراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد کمن بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

www.pklibrary.com

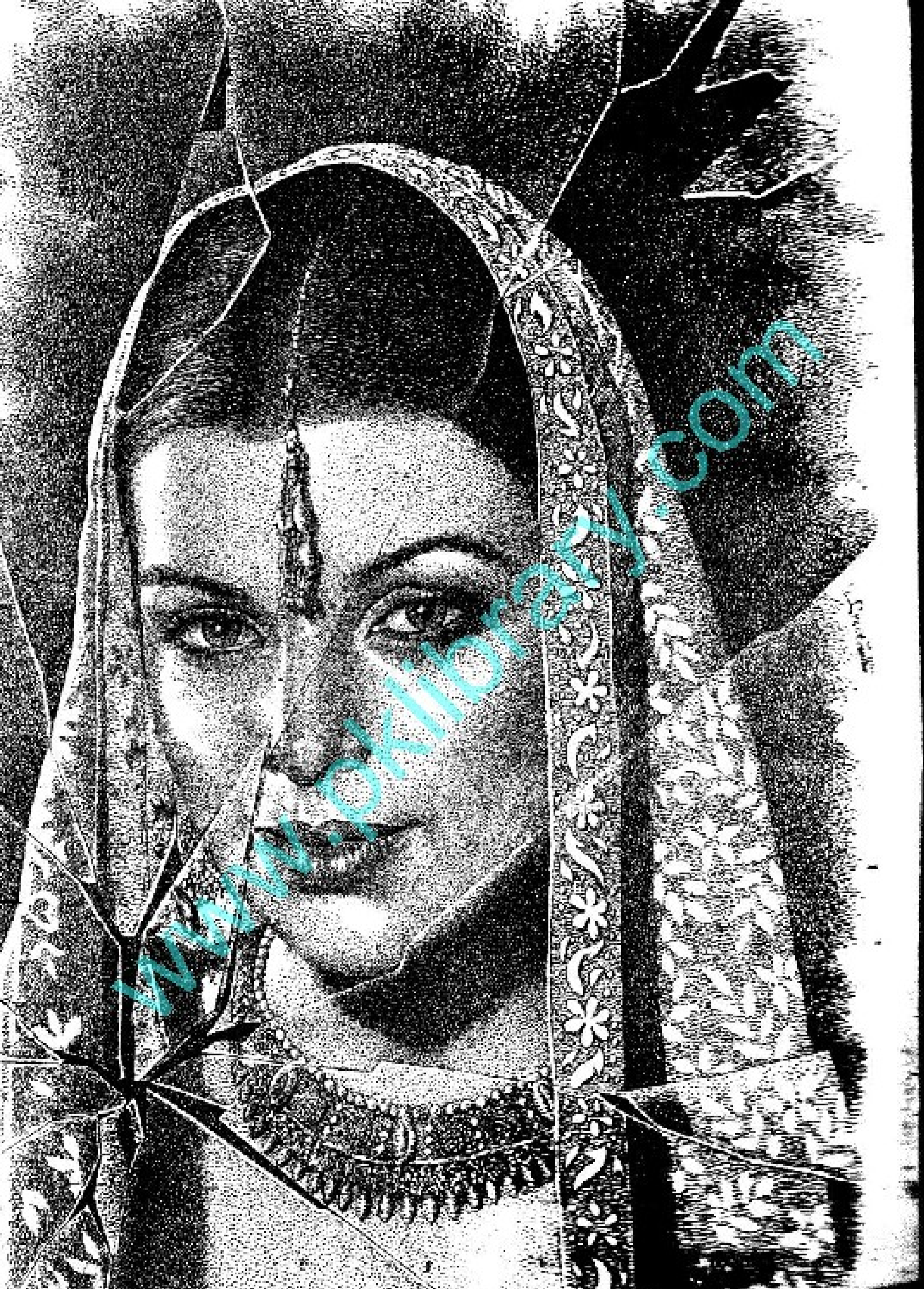
www.pklibrary.com

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میرو اسے منالے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آزر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ بلال اچھے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آزر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بد زبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیختا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے **پاگل خانے بھیج دیا جائے**۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میرو کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آزر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آزر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آزر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آزر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آزر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آزر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی

ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایماماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔

ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور بھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔

میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تئیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔

کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔

کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے تو ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔

کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آجاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بچے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔

حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آجائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔

موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زرین اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آجائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آجاتی ہے۔

موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زرین بہت دکھی ہوتی ہے وینا اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آجاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

تیرھویں قسط

خالی گھر میں ایک زوردار چھناکا سا ہوا تھا۔ لمحہ بھر کو تو ردا کو اپنی سماعتیں بہری ہوتی محسوس ہوئیں۔ یہ آواز اسے اپنے یقین اور گمان کے درمیان کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اتنی دور بھی نہیں تھی! وہ ان ہی قدموں پہ پلٹی تھی۔

وہ کتنے دنوں، گھنٹوں، ہفتوں بعد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بہت وقت ہوا جب اس نے یہ سب سوچنا چھوڑ دیا تھا اور وہ چلا آیا۔

"تم یہاں کس لیے؟" بہت جتن کے بعد اس نے لہجے میں کچھ تندی، کچھ رکھائی اور زیادہ اجنبیت سموئی تھی۔

"یہ سوال تمہیں زیب نہیں دیتا۔"

فرحان کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔ شکایت، دکھ، طنز اور شاید غصہ بھی!

"میں تم سے صرف یہ پوچھ رہی ہوں۔ تم یہاں کیوں آئے ہو پلیز۔" وہ دھیرے دھیرے خود کو کمپوز کر رہی تھی۔

"پلیز جانے کی ریکویسٹ نہیں کرنا۔ میں جانے کے لیے نہیں آیا۔" اس نے الفاظ ردا کے منہ سے گویا اچک لیے تھے۔

"واٹ؟" ردا کو پہلی بار گھر کے اکیلے پن کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ وہ ان ہی قدموں پر غیر محسوس انداز میں تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔

"ڈرو نہیں مجھ سے۔" وہ اس کے ارادے بھانپ کر تلخی سے بولا۔

"برے وقت سے ڈرنا ہی چاہیے مسٹر فرحان۔" وہ بھی جواباً اس کے لہجے میں بولی تھی۔

"جو مجھ پہ آ کر گزر گیا۔" وہ طنزاً بولا۔

"اور مجھ پہ شاید ٹھہر گیا۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

"اسی لیے تو...... اسی لیے ردا! میں اس برے وقت کو، ان منحوس گھڑیوں کو تم سے، خود سے، اپنی زندگی سے دور نکال پھینکنا چاہتا ہوں۔ پلیز میرا ساتھ دو...... میرے ساتھ چلو۔"

وہ جیسے یہ فاصلہ پھلانگ کر اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر التجا کر رہا تھا۔

ردا لمحہ بھر کو ساکت رہ گئی۔

"یہ کیوں بار بار اس کے لیے امتحان بن کر آ جاتا ہے۔ آخر کوئی کتنے امتحان دے سکتا ہے۔" وہ کراہ کر رہ گئی۔

"آخر امتحان لینے والے کو اس پہ رحم کیوں نہیں آ رہا۔"

"نہیں۔"

اسے انکار تو کرنا تھا۔ اب کسی بھی نئے امتحان میں داخلہ لینے سے، سو وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"تو کس بات کا بدلہ لیا ہے تم نے مجھ سے۔ کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا جو تم میری پرسکون زندگی کو طوفانوں کے حوالے کر کے اب خود اپنے ہاتھوں میں مہندی رچانے چلی ہو، یہ سوچے بغیر کہ تم مجھے محبت کے جھوٹے خواب دکھا کر برباد کر چکی ہو۔" وہ پھٹ پڑا۔ اس نے کچھ بولنے کے لیے ہونٹ ہلائے وہ چیخ پڑا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا میری بددعاؤں سے۔ میری آہوں سے اور میرے ٹوٹے دل سے جس سے تم کھلونے کی طرح کھیلیں؟"

اس کی آنکھیں سرخ بوٹی کی طرح لال ہو رہی تھیں۔

ردا کو خوف اور لمحوں کی نزاکت کا احساس ٹک ٹک بجتے کسی ٹائم بم کی سوئی کی طرح ہونے لگا۔

"فرحان! بس کرو خدا کے لیے۔ یہ سب ختم ہو چکا معاف کرو مجھے اور چلے جاؤ میری زندگی سے اور اگر

www.pklibrary.com

تم سمجھتے ہو کہ میں یہ سب کچھ بڑی خوشی سے کر رہی ہوں تو تم غلط ہو۔ بھول میں ہو۔ خدا کے لیے میری مجبوری کو سمجھو۔ میں جس برزخ میں جل رہی ہوں۔ تم اس کا دن پرسنٹ بھی اندازہ نہیں لگا سکتے مگر میں یہ طے کر چکی ہوں، میں اپنے ماں باپ کو دھوکا نہیں دوں گی۔ ان کی عزت، ان کے مان پر حرف نہیں آنے دوں گی...... اپنی جان لے لوں گی مگر ان کے سر نہیں جھکنے دوں گی۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بغیر رکے بولتی چلی گئی کہ اس کی ساری خوش فہمیاں، امیدیں وہ ایک ہی بار ختم کر ڈالے۔

"تو مجھے دھوکا دینا تمہیں آسان لگا۔ میرے مان، میری امیدوں کو توڑنا تمہارے۔ لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اتنا ہلکا، اتنا سستا سمجھا تم نے میرے جذبوں کو۔" اس کا لہجہ دہک رہا تھا وہ ڈر گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ کچھ ہونے والا ہے اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو رہی تھیں۔

"پلیز۔ تم جاؤ یہاں سے۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"پلیز ردا تم میری بات مان جاؤ کیوں اس برزخ میں تم جلو یا میں دن رات جو محبت کرتا ہوں میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ، ساری زندگی رہنا چاہتا ہوں۔ پلیز مت لوٹاؤ مجھے خالی ہاتھ۔ میرا ہاتھ تھام لو۔" وہ اب منتیں کر رہا تھا جو ردا کے دل کے آر پار جا رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بھینچے زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"کیسے...... کیسے ایک اجنبی شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارو گی جسے تم نے پہلے دیکھا نہیں جانا نہیں بوجھا نہیں اور پوری زندگی اسے اٹھا کر دے دو گی سوچو ردا۔" وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔

"سوچ چکی ہوں۔ ایک لاش بن کر اس کے ساتھ رہ لوں گی مگر اپنے ماں باپ کو رسوا نہیں ہونے دوں گی اور لاش کے کوئی جذبات، کوئی ارمان نہیں ہوتے۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ خود کو سنبھال کر اسی مضبوط لہجے میں پھر سے انکار کر رہی تھی جو پہلے دن سے کر رہی تھی۔

"دور رہو مجھ سے...... دور ہٹو۔"

وہ اس کے قریب آ چکا تھا اور آ رہا تھا...... فاصلے کم ہوتے جا رہے تھے۔

"ایک بار...... ایک بار اقرار کر لو کہ تم واقعی مجھ سے محبت کرتی تھیں دل سے جان سے پھر میں چلا جاؤں گا تمہاری زندگی سے تمہاری دنیا سے...... ایک بار کہہ دو۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" وہ بھاری بوجھل آواز میں منت کر رہا تھا۔

"ہاں کی تھی میں نے تم سے محبت۔ اب جاؤ۔" جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ ردا کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

"کی تھی، اب نہیں کرتی ہو۔" وہ پھر سے یقین دہانی چاہ رہا تھا۔

"پلیز فرحان......" وہ سخت خوف زدہ ہو رہی تھی۔

"ایک بار اقرار کر لو کہ تم مرتے دم تک صرف مجھ سے محبت کرو گی۔ بھلے تم کسی کی بھی بیوی بن کر رہو۔ خدا کی قسم میں پر سکون ہو کر تم سے دور چلا جاؤں گا۔ کبھی تمہیں اپنی شکل بھی نہیں دکھاؤں گا، پرامس......" جانے اس یقین دہانی کی اسے کیوں ضرورت تھی لیکن ردا کو اس وقت فقط اپنی جان بچانا تھی۔

"ہاں کرتی تھی، کرتی ہوں، کرتی رہوں گی چاہے کسی کی بھی ہو جاؤں۔ میں نے دل سے تم سے محبت کی ہے پلیز اب جاؤ۔" وہ کچھ بھی سوچے بغیر تیز تیز بولتی اسے پرے دھکیلنے لگی۔

"اگر کرتی ہو تو پھر دوری کیسی؟ آج ہی یہ فاصلے مٹ جانے چاہئیں۔" دوسرے لمحے وہ فرحان کی مضبوط گرفت میں پھنس چکی تھی۔

☆☆☆

www.pklibrary.com

منصور کے پیچھے موحد کھڑا تھا۔ منصور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ فوری طور پر کیا کہے۔

''کیسے ہیں ڈاکٹر موحد آپ؟ پلیز آیئے ناں۔'' زینب اعتماد بھرے لہجے میں مسکرا کر موحد سے کہتے ہوئے جیسے منصور کو نظر انداز کر رہی تھی۔

''آئی ایم فائن ......اور بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے بالکل بھی۔ تھوڑی دیر میں واپسی ہے میری۔''

وہ دونوں یوں مصروف گفتگو تھے جیسے منصور کی موجودگی سے بے خبر ہوں۔ موحد کو اپنے پیچھے دیکھ کر وہ سمجھا تھا، شاید وہ اس سے کچھ بات کرنے آیا ہے زریں سے متعلق مگر یہاں تو وہ کھڑا بھی ان دونوں کے درمیان کچھ اس طرح تھا کہ خاموشی سے اس سچوئیشن سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔

''آپ دونوں جانتے ہیں ایک دوسرے کو؟'' بہر حال اسے کسی طرح تو اس تبادلہ خیال میں شامل ہونا تھا پھیکے سے لہجے میں بولا۔ دونوں ایک دم سے خاموش ہو گئے۔

''بیٹا ہے میرا......آئی مین میری وائف زریں کا۔''

خجل ہو کر منصور کو اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو موحد کا تعارف کرانے لگا۔

اسے یہ بھی ڈر تھا کہ میرا بیٹا کہنے پر موحد کا موڈ نہ بگڑ جائے، فوراً زریں کا حوالہ دینا پڑا۔

زینب نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اس بات کو پہلے سے جانتی تھی۔

''میرے نزدیک اس تعارف کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' موحد سرد لہجے میں منصور کو جتانے والے انداز میں آہستگی سے کہہ گیا۔

''ویسے نامعلوم کیوں میری سکس سینس نے مجھے پہلے سے باخبر کر دیا تھا کہ موحد کا آپ کے ساتھ کوئی ریلیشن ضرور ہے مسٹر منصور۔'' زینب نے نارمل سے لہجے میں کافی کچھ جتا دیا۔

''آپ جانتی ہیں انہیں۔'' موحد کو مجبوراً پوچھنا پڑا تھا۔ تینوں اب بیٹھ چکے تھے۔

''نہیں۔ ایسا نہیں جانتی کہ آپ دعوا کرسکیں کہ واقعی کسی کو جانتے ہیں۔'' زینب نے اس پورے دورانیے میں پہلی بار منصور کے چہرے پر اپنی سرد نگاہیں جمائی تھیں۔

''کزن ہیں میری زینب...... فرسٹ کزن۔'' منصور کو جلدی سے تعارف کرانا پڑا۔

''اوہ یہ تو میں بالکل نہیں جانتا تھا۔۔۔۔ اینی وے مجھے اب نکلنا ہے ورنہ لیٹ ہو جاؤں گا اور حیرت ہے میں تین دن سے اس ہوٹل میں تھا اور ہمارا آمنا سامنا نہیں ہو سکا۔'' وہ بولتے ہوئے زینب کے سامنے کھڑا ہو گیا اس کی اونچی لمبی چوڑی پشت اب منصور کی طرف تھی۔

''پاکستان واپسی ہے تمہاری۔'' زینب اس کی طرف اپنائیت سے دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

''فی الحال تو ہے۔'' وہ پہلے سے کندھے اچکا کر بولا۔

''فی الحال...... مطلب۔'' زینب چونکی۔

''ہمارے ارادے کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، تقدیر سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتے۔'' وہ رک کر بولا تھا۔

زینب لمحہ بھر کو بالکل خاموش ہو گئی۔

موحد کی طرف سے دیکھتا منصور بھی اس کو دیکھ رہا تھا۔

''ہاں ٹھیک بات ہے، ہمارے ارادے تقدیر کے لکھے کے سامنے ہار بھی سکتے ہیں سو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جو آپ چاہ رہے ہیں یا کرنے جا رہے ہیں، ایسا ہونا آپ کی تقدیر میں لکھا بھی ہے یا نہیں۔'' زینب موحد کو دیکھتے ہوئے منصور کو سنا گئی۔

www.pklibrary.com

"لیکن چونکہ اب میں سفر پر جا رہا ہوں تو مجھے پوزیٹو سوچنا چاہیے۔ او کے پھر ملتے ہیں ان شاء اللہ پاکستان میں۔ آپ کی واپسی کب ہے؟"

"کل رات میں...... پرسوں صبح ہی ہو جائے گی۔" زینب آہستگی سے بولی۔

"تم پلیز جاتے ہی کشف سے ملنا۔" وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔ جانے کیوں وہ اس جگہ، اس موقع پر کشف کا ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میری بڑی خواہش تھی کہ میں آپ کے کسی فنکشن میں شامل ہو سکتا۔ آپ کو خوب صورت شاعری کرتے سننا ایک اعزاز کی بات ہے۔" وہ سراہنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"بہت شکریہ...... آپ کی محبت ہے بیٹا۔" زینب انکساری سے بولی۔

"او کے سی یو سون (See you soon)" وہ زینب سے بڑی اپنائیت سے ہاتھ ملا کر جانے کے لیے ایڑیوں پر گھوم گیا۔ منصور کھڑا ہو چکا تھا۔ جاتے جاتے مدھم سرد لہجے میں موحد سرگوشی میں بولا۔

"مجھے اب سمجھ میں آیا۔ آپ کیوں زریں نامی عورت سے پیچھا چھڑانا چاہ رہے ہیں۔" اور منصور ششدر سا رہ گیا۔

"گڈ بائے۔" وہ چبا کر کہتا ہاتھ ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔ اور منصور اسی طرح سامنے کی طرف دیکھتا رہا جہاں کچھ لڑکیاں ہنستی خوش گپیوں میں مگن تھیں۔

زینب موحد کو الوداع کہہ کر مڑی تو منصور کا اترا چہرہ دیکھ کر اس کے لب بے اختیار سکڑے تھے۔ اسی وقت زینب کا فون بجنے لگا۔

"کشف کی کال ہوگی۔" اس نے بے قراری سے فون بیگ سے نکالا۔

"زینب! آ جاؤ، ہم شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ چار گھنٹے ہیں ہمارے پاس۔ ہم پارکنگ میں تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔" اس کے گروپ کی مونا عجلت میں کہہ رہی تھی۔

"او کے؟" "میں آ رہی ہوں مونا! دو منٹ میں۔" کہہ کر زینب نے فون بند کیا تو منصور نے اسے چونک کر دیکھا۔

"کہیں جانا ہے تم نے؟" وہ کچھ بے چینی سے بولا۔

"ہاں شاپنگ کے لیے...... ردا کی شادی ہے نا۔ اس کے لیے کچھ گفٹ لینے ہیں اور سونیا کے لیے۔" روانی میں زینب کے منہ سے نکل گیا تھا۔

"ردا کی شادی؟" منصور اچھنبے سے بولا۔

"تمہاری بہن کی بیٹی ہے، اگر یاد ہو تو؟" زینب خود کو طنز کرنے سے روک نہیں سکی۔

"ہاں۔ معلوم ہے مجھے ردا کا...... مگر اس کی شادی۔" وہ جیسے الجھ سا گیا تھا۔

"میں چلتی ہوں۔ وہ لوگ میرا ویٹ کر رہے ہوں گے۔"

وہ فون بیگ میں ڈال کر عجلت میں جانے لگی۔

"پلیز...... زینی! رکو۔" وہ بے اختیار جیسے گڑگڑا کر بولا تھا۔

زینب اپنی جگہ منجمد سی ہو کر رہ گئی۔ کتنی صدیوں بعد کسی نے اسے یوں اس نام سے پکارا تھا، وہ نام جسے لینے کا حق صرف ایک شخص کے پاس تھا اور وہ اس حق کا استعمال بھی خوب کرتا تھا اور آج بھی اس نے ترکش سے وہی تیر نکالا، جس نے زینی کو لمحوں میں گھائل کر دیا تھا۔

www.pklibrary.com

"میں لے جاؤں گا تمہیں شاپنگ پر۔ پلیز مجھے بھی ردا اور ہونیا کو کچھ بھیجنا ہوگا۔ تمہیں تایا ابا کا واسطہ آخری بار میری یہ بات مان لو پلیز۔"

اس نے ترکش سے ایک تیر ہی نہیں چلایا تھا۔ زینب کے تو جیسے پر ہی کتر ڈالے تھے۔ ماں باپ کی محبتوں کو دل میں خزانے کی طرح دبائے جب بھی اندھیری سیاہ سنسان راتوں میں وہ اکیلی پڑتی تھی تو اس خزانے کے گوشے میں سے کوئی ایک سکہ نکال کر وہ ان تاریک سنسان راتوں کو اجالا کرتی تھی آج منصور نے بھی اس پر ہی وار کیا تھا۔

واسطہ بھی اس کا دیا جو اس دنیا سے سالوں پہلے چلے جانے کے باوجود بھی زینب کے لیے اس دنیا میں سب سے قیمتی ان کا نام تھا۔ وہ بے چارگی سے دیکھتی رہ گئی۔

وہ چاہنے کے باوجود انکار نہیں کر سکی اور اقرار بھی نہیں۔

☆☆☆

قیامت کس کو کہتے ہیں۔ اس کا اندازہ ردا کو ان چند لمحوں میں ہوا تھا جب وہ فرحان کی گرفت میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ قیامت کب آئی ہے اسے اب اس سوال سے کوئی مطلب نہیں تھا کیونکہ اس کی قیامت تو آ چکی تھی۔ باہر کہیں کسی گاڑی کا تیز ہارن بجا تھا۔ لاشعوری طور پر فرحان کی آہنی گرفت اس کے وجود کے گرد ڈھیلی پڑی تھی لمحے کا شاید ہزارواں حصہ تھا جس میں اسے فیصلہ کرنا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ جان لینے یا جان دینے کا۔

وہ بجلی کی طرح جھکی تھی اور اس نے ٹوٹے ہوئے باؤل کا بڑا سا کانچ کا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا تھا۔

فرحان جو بجلی کی سی تیزی سے چھٹ کر اسے پھر سے پکڑنا چاہ رہا تھا اس نے اس کانچ کو بے دردی سے اس کے ہاتھ اور بازو کی جلد پر زور سے کھرچ ڈالا تھا۔

فرحان اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس کے منہ سے بے اختیار تیز آواز نکلی تھی۔

اپنا بچاؤ کرتا ہوا پیچھے ہٹا اور ردا کے لیے اتنی مہلت کافی تھی وہ اس سے چار قدم جتنا پیچھے کچن کیبنٹ تک جا سکتی تھی جا چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہی تیز دھار کنارے سے سرخ ہوا کانچ تھا اس نے کانچ کا نوکیلا کونا اپنی گردن کے ساتھ جوڑ لیا۔

"ایک بھی قدم تم آگے بڑھے تو خدا کی قسم میں اپنی گردن کاٹ لوں گی مگر تمہاری غلیظ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گی۔" وہ کانپتی لرزتی مگر شدید جذباتی آواز میں کہہ رہی تھی۔ اور اتنا اندازہ تو فرحان کو ہو ہی چکا تھا کہ وہ ارادے کی کتنی پکی ہے۔ سچویشن کی سنگینی کا اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

اس سے آگے کا کھیل یقیناً خطرناک ہو سکتا تھا اگر مزید جاری رکھا جاتا تو......

"ردا پلیز۔ یہ مت کرو...... یہ خطرناک ہے۔ رکھو اس کو خدا کے لیے اپنے ہاتھ سے۔" وہ پھر سے شیطانیت کا چغہ اتار کر فکرمند لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ خطرناک ہے مگر تم سے زیادہ نہیں اور اب مجھے یقین آ گیا کہ میرے بابا نے تمہیں بالکل ٹھیک پہچانا تھا تم میری محبت تو کیا نفرت کے قابل بھی نہیں تھے۔" وہ فرحان کے چند لمحے پہلے والے روپ سے اس کا اصل جان چکی تھی۔

"بخدا......" اس نے صفائی دینی چاہی۔

"خدا کا نام لینا نہ خدا کو بیچ میں لے کر آنا۔ ایک شیطان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ خدا کا نام بھی لے۔ نفرت ہے مجھے تم سے اور تمہاری محبت سے...... دفع ہو جاؤ اب یہاں سے۔" وہ جس ٹون میں بول رہی تھی۔ اتنا تو فرحان کو پتا چل چکا تھا کہ وہ اب اس کی کسی بھی بات پر یقین نہیں کرے گی۔

اس کی جلد بازی نے جما جمایا کھیل بگاڑا تھا۔ وہ دل میں پچھتا رہا تھا۔

''اوکے......اوکے۔ میں جا رہا ہوں تم پلیز اس کو ہاتھ سے رکھو دیکھو تمہارا ہاتھ زخمی ہو رہا ہے اس سے خون بہہ رہا ہے۔'' وہ فکر بھرے لہجے میں اس کی توجہ اس کے ہاتھ کی طرف کراتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''رک جاؤ وہیں پر۔ ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو خدا کی قسم میں اپنی جان لے لوں گی۔''

اس نے آنکھ کیا نظر کا زاویہ پل بھر کو بھی نہیں بدلا تھا بلکہ اس زخمی خون رستے ہاتھ سے وہ کانچ کا نوکیلا ٹکڑا اپنی گردن کے بے حد قریب لے آئی تھی۔

''ردا! کیا ہو گیا ہے تمہیں اس طرح مت کرو پلیز مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ لہجہ بدل کر بولا۔

''تو تم یہاں سے نہیں جاؤ گے تو ٹھیک ہے۔ اب مجھے نہیں روکنا۔'' وہ نفرت اور بے رحمی سے کہہ کر کانچ کی نوک آنکھیں بند کر کے اپنی گردن پر پھیرنے لگی۔

بے شک خود اپنی جان لینا اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور یہ کرنا ردا جیسی نازک لڑکی کے لیے اور بھی دشوار تھا جس نے کبھی پھول کا کانٹا بھی خود کو نہیں چبھویا تھا۔

''ردا۔'' وہ چیخا۔

نوک اس کی گردن کی نازک جلد میں اتری جا رہی تھی اور خون کے قطرے رسنے لگے تھے۔ ردا کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ تیار ہو چکی تھی اپنی جان لینے کے لیے۔

''مت کرو۔'' وہ زور سے چیخا تھا مگر اس کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں اور شاید کان بھی!

☆☆☆

زینب منصور کے ساتھ خریداری کے لیے آ گئی تھی مگر جیسے اس سے بالکل غافل تھی وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بھی ساتھ نہیں تھی۔ بہت عجلت بھرے انداز میں وہ ضروری خریداری کر رہی تھی سب سے آخر میں اس نے رمشا کے لیے ایک خوب صورت جرسی ٹی اور گہرا سانس لے کر وڈوز میں لگی قیمتی تیز دن کے لیگو کو اچٹتی نظر سے دیکھا۔

بہت وقت گزر گیا، جب اس کے دل سے خریداری کی امنگ ہی ختم ہو گئی تھی۔ شاپنگ پر جب بھی جانا ہوتا تو وہ صرف کشف کے لیے خریداری کرتی تھی۔ اپنے لیے تو جیسے کچھ لینا بھول ہی گئی تھی۔

''اگر تمہاری شاپنگ مکمل ہو گئی ہو تو پلیز تھوڑی میری بھی ہیلپ کر دو۔ سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے کچھ خرید لوں۔'' وہ اس کے گردن موڑنے پر یوں مصروف سے انداز میں بولا جیسے وہ دونوں اکثر ہی ایسے شاپنگ کے لیے آتے ہیں اور زینب کی مدد سے ہی وہ شاپنگ کرتا ہے۔

زینب نے بے تاثر نظروں سے کلائی پر بندھی گھڑی میں تیزی سے بھاگتی وقت کی سوئیوں کو دیکھا۔

''سوری۔ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔ سات بجے مجھے ہر صورت ہوٹل پہنچنا ہے اور اب چھ بج چکے ہیں۔''

''ایسے کیسے۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''مطلب؟'' وہ کندھے اچکا کر تعجب سے بولی۔

''ابھی تو آئی مین۔ میں نے کچھ لیا بھی نہیں تمہارے لیے بھی اور ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی ہمارے درمیان۔''

اس کے لہجے میں بڑا دوستانہ سا احتجاج تھا جو کم از کم زینب کو سا لگا گیا۔

''کیا آپ مجھے سات بجے تک ہوٹل ڈراپ کر دیں گے یا میں اپنے لیے کوئی کنوینس دیکھ لوں۔'' وہ اس

www.pklibrary.com

کے احتجاج کو صریحاً نظر انداز کرتے ہوئے اپنی چیزیں سمیٹتی الیکٹرک سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"زینب! مت کرو میرے ساتھ اس طرح۔" اگرچہ وہ یہ جملہ بولنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے نکل گیا۔

زینب نے اسے ذرا سی گردن موڑ کر کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ منصور زیادہ دیر اس کی نظروں کی تاب نہیں لا سکا۔

"میں جانتا ہوں۔ مجھے یہ سب کہنے کا حق نہیں ہے لیکن ایک بار اگر تحمل سے بیٹھ کر ہم دونوں ایک دوسرے کی بات سن لیں۔ سمجھ لیں تو اس میں کیا حرج ہے۔" وہ پھر سے وہی باتیں دہرا رہا تھا جنہیں زینب اب سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس سامنے نظر آتے بورڈز کو پڑھتی باہر نکلنے کے راستے کو ذہن میں رکھے لوگوں کے رش سے بچتی بچاتی چلتی جا رہی تھی۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" وہ تقریباً بھاگ کر اس کے برابر آیا تھا۔ وہ بالآخر خارجی دروازے تک پہنچ کر منصور کو سنے بغیر باہر نکل گئی۔ وہ بے بس سا کھڑا اسے یوں بے رخی سے جاتا دیکھتا رہا۔

اور پھر گہرا سانس لے کر اس کے پیچھے چل پڑا۔

"شاید راستے میں ڈراپ کرنے کے دوران کوئی گنجائش نکل آئے کہ زینب مجھ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے۔" وہ یہی سوچ کر اس کے پیچھے چلا گیا۔

☆☆☆

کشف لیپ ٹاپ کھولے بڑے اہتمام سے مصروف تھی، جب صالحہ کچن سے نکل کر آئیں۔ صالحہ کشف کے لاکھ منع کرنے کے باوجود کچن میں کھانا بنانے جا لگی تھیں۔

"بیٹا! میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ تم پانچ منٹ بعد چولہا بند کر دینا۔" انہوں نے جاتے ہوئے کشف کو آواز لگائی۔

"جی تائی...... کر دوں گی۔" آہستہ سے کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے تھکی ہوئی نظریں ہٹائیں۔

وہ کیا کرتی اس واقعے کو گزرے دو دن ہونے کو آئے تھے نہ تو وہ منظر اس کی نظروں کے سامنے سے ہٹتا تھا نہ دل ہی ٹھہر رہا تھا۔ فون چارج کرنے کے بعد اس نے پھر سے آف کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا زینب اسے بار بار کال کر رہی ہوگی اور اسے یہ بھی پتا تھا وہ جیسے ہی زینب کی آواز سنے گی اس کا دل بے قابو ہو جائے گا۔ وہ اپنے جذبات پر بند باندھ سکے گی نہ اپنے آنسوؤں کو روک پائے گی تو بہتر تھا ابھی فون ہی بند رکھو کیا معلوم زینب کے آنے تک اس کا دل سنبھل ہی جائے۔ اس نے آنکھوں میں بھرتے پانی کو زور سے رگڑا۔

"شاید باہر دروازہ بج رہا تھا۔ لائٹ نہیں تھی یا ڈور بیل خراب تھی جو کہ اکثر خراب ہی رہتی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔ بلال اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے اعصاب تن سے گئے۔ وہ رخ پھیر کر جانے لگی۔

"پلیز کشف! دروازہ بند نہیں کرنا۔" وہ آہستہ سے بولا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر اندر چلی گئی۔ وہ خود ہی دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آ گیا۔

"فون کیوں آف کر رکھا ہے تم نے اپنا۔" وہ اس کے پیچھے کچن میں آ گیا۔ کشف نے خاموشی سے چولہا بند کر دیا۔

"میری مرضی۔" وہ پلٹ کر سرد لہجے میں بولی۔ وہ اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ کچھ پل دونوں کے بیچ خاموشی

www.pklibrary.com

سے سرک گئے۔

”ناراض ہو مجھ سے۔“ بلال کو یہی لگا تو رہ نہ سکا پوچھے بغیر۔

”کیوں تم سے کیوں ناراض ہوں گی میں۔“ وہ تیکھے چتون سے بولی۔

”تم جانتی ہو ماما اور بابا کے درمیان کبھی نہیں بنی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”تو مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ کیا میں نے تمہارے گھر جا کر رہنا ہے۔ ایسا ہونے سے پہلے اللہ مجھے دنیا سے ہی اٹھا لے۔“ وہ تلخی سے بولی۔ بلال نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

”پلیز کشف...... تم جانتی ہو میرے بارے میں میں نے تم سے کبھی بھی کچھ نہیں چھپایا۔“ وہ جانے کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

”میں نے تمہیں کبھی کچھ بتانے پر مجبور بھی نہیں کیا۔“ وہ جواباً بولی۔

”تم ماما کی باتوں کی سزا مجھے کیوں دے رہی ہو۔“ وہ جیسے ہار کر ڈائریکٹ بات پر آ گیا۔

”بس بلال! مجھے تم سے، تمہاری ماما سے تمہارے بابا سے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے اچھو تکی غلطی میری تھی۔ مجھے یوں منہ اٹھا کر تمہیں بلا کر تمہارے گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے وہ ٹائم ایسا تھا رات کا آخری پہر کہ کوئی بھی تمہاری ماما کی جگہ ہوتا اس کا غصے میں آنا فطری سی بات تھی پھر آئی کا ہر معاملے میں تمہارے بابا پر بھروسہ کرنا یہ سوچے بغیر کہ تمہاری ماما ان کے اس بھروسے کو کن معنوں میں لیتی ہیں، میں سمجھتی ہوں ثمینہ آنٹی غلط نہیں تھیں اور تم بھی غلط نہیں ہو اس لیے کسی ایکسکیوز کی ضرورت نہیں ہے بالکل بھی۔“ اس نے لمحوں میں خود کو سنبھالا تھا۔

بلال نے کچھ پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

اتنی نرمی سے بات کرنے والی کشف...... کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔

”اچھا بتاؤ۔ چائے تو پیو گے ناں۔ بلکہ تم یوں کرو اندر نانو کے پاس جاؤ میں وہیں تینوں کے لیے چائے لے کر آ رہی ہوں۔“

وہ تیلی جلا کر چولہا جلا کر کیتلی میں چائے کا پانی رکھنے لگی۔

”کشف! تم ٹھیک ہو۔“ وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

”کیوں تمہیں شک ہوا ہے، میرا دماغ چل گیا ہے تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ جاؤ تم اندر۔“ وہ اس سے نظریں چرا کر [illegible] پانی میں چائے کی پتی ڈالتی، چمچ نکالتی خود کو معروف ظاہر کر رہی تھی، شاید بلال کے وہاں سے چلے جانے کی [illegible] رہی تھی۔

”[illegible]“ کپوں میں چینی ڈالتے ہوئے وہ جھلا سی گئی۔

”آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ کیوں میرے سر پر کیوں سوار ہو۔ جاؤ ناں اندر۔ میں چائے لے کر آ رہی ہوں۔“ [illegible] کچن میں چیخ کر بولی۔

”[illegible] تم [illegible] کے گھر سے [illegible] آ گئی تھیں کیا ہوا تھا وہاں۔“ بلال نے ایک دم [illegible] میں آ گئی۔

اس کے [illegible] کسی کو کیا بتا کر [illegible] اس سے یہ سوال پوچھ سکتا ہے۔

”تم ہوتے کون ہو مجھ سے اس طرح کچھ بھی پوچھنے والے۔ کیونکہ دوست ہو تو سنو دوستوں کو بھی میں اتنی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ میرے اندر، میری ذات میں گھسنے کی کوشش کریں۔“ وہ پورا زور لگا کر اس کے ہاتھ جھٹک کر شدید غصے پر قابو پاتی زور سے بولی تھی۔

”کروں گا...... میں یہ کوشش ضرور کروں گا۔“ وہ بھی ٹیبل سے اس کے سامنے جم کر بولا۔

سے سرک گئے۔

"ناراض ہو مجھ سے۔" بلال کو یہی لگا تو رہ نہ سکا پوچھے بغیر۔

"کیوں تم سے کیوں ناراض ہوں گی میں۔" وہ تیکھے چتون سے بولی۔

"تم جانتی ہو ماما اور بابا کے درمیان کبھی نہیں بنی۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تو مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ کیا میں نے تمہارے گھر جا کر رہنا ہے۔ ایسا ہونے سے پہلے اللہ مجھے دنیا سے ہی اٹھا لے۔" وہ تلخی سے بولی۔ بلال نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"پلیز کشف...... تم جانتی ہو میرے بارے میں میں نے تم سے کبھی بھی کچھ نہیں چھپایا۔" وہ جانے کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کبھی کچھ بتانے پر مجبور بھی نہیں کیا۔" وہ جواباً بولی۔

"تم مما کی باتوں کی سزا مجھے کیوں دے رہی ہو۔" وہ جیسے ہار کر ڈائریکٹ بات پر آ گیا۔

"سن بلال! مجھے تم سے، تمہاری ماما سے تمہارے بابا سے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے ایکچولی غلطی میری تھی۔ مجھے یوں منہ اٹھا کر تمہیں بلا کر تمہارے گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے وہ ٹائم ایسا تھا رات کا آخری پہر کہ کوئی بھی تمہاری ماما کی جگہ ہوتا اس کا غصے میں آنا فطری سی بات تھی پھر آنٹی کا ہر معاملے میں تمہارے بابا پر بھروسہ کرنا یہ سوچے بغیر کہ تمہاری ماما ان کے اس بھروسے کو کن معنوں میں لیتی ہیں، میں سمجھتی ہوں ثمینہ آنٹی غلط نہیں تھیں اور تم بھی غلط نہیں ہو اس لیے کسی ایکسکیوز کی ضرورت نہیں ہے بالکل بھی۔" اس نے لمحوں میں خود کو سنبھالا تھا۔

بلال نے کچھ پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

اتنی نرمی سے بات کرنے والی کشف...... کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔

"اچھا تم جاؤ۔ چائے تو پیو گے ناں۔ بلکہ تم یوں کرو اندر نانو کے پاس جاؤ میں وہیں تینوں کے لیے چائے لے کر آ رہی ہوں۔"

وہ چٹکی بجا کر چولہا جلا کر کیتلی میں چائے کا پانی رکھنے لگی۔

"کشف! تم ٹھیک ہو۔" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

"کیوں تمہیں لگ رہا ہے، میرا دماغ چل گیا ہے تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ جاؤ تم اندر۔" وہ اس سے نظریں چراتی تیزی سے ابلتے پانی میں چائے کی پتی ڈالتی گویا خود کو معروف ظاہر کر رہی تھی، شاید بلال کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ اس پہ نظریں جمائے دیکھتا جا رہا تھا۔ کپوں میں چینی ڈالتے ہوئے وہ جھلا گئی۔

"آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ یہاں میرے سر پر کیوں سوار ہو۔ جاؤ ناں اندر۔ میں چائے لے کر آ رہی ہوں۔" وہ زور سے چینی کا ڈبہ واپس کیبنٹ میں پٹخ کر بولی۔

"سچ سچ بتاؤ۔ تم سونیا آنٹی کے گھر سے اتنی رات کو کیوں آ گئی تھیں کیا ہوا تھا۔ وہاں۔" بلال نے ایک دم سے اس کے کندھے اتنی زور سے پکڑے کہ وہ جیسے سکتے میں آ گئی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بلال بھی اس سے یہ سوال پوچھ سکتا ہے۔

"تم ہوتے کون ہو مجھ سے اس طرح کچھ بھی پوچھنے والے۔ کہو گے دوست ہو تو سنو دوستوں کو بھی میں اتنی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ میرے اندر، میری ذات میں گھسنے کی کوشش کریں۔" وہ پورا زور لگا کر اس کے ہاتھ جھٹک کر شدید غصے پر قابو پاتی زور سے بولی تھی۔

"کروں گا...... میں یہ کوشش ضرور کروں گا۔" وہ ڈھیٹ پن سے اس کے سامنے جم کر بولا۔

www.pklibrary.com

"تو کیا حاصل کرو گے۔" وہ تمسخر سے بولی۔

"اس سوال کا جواب جو میں تم سے پوچھ رہا ہوں اور جو شاید تم مجھے بتانا نہیں چاہ رہیں۔" وہ اسی طرح بے لچک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

کشف کو لگا جیسے کسی نے اس کے پیروں تلے جلتے انگارے رکھ دیے ہوں۔

"مجھ پر شک کر رہے ہو تم۔" وہ پاگلوں کی طرح اس کا گریبان کھینچ کر چیخی۔

"کشف۔" بلال کو اتنے سخت ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

"تمہیں اس سوال کا جواب مل گیا تو تم مجھے کھو دو گے، بولو منظور ہے؟" وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

سونیا کی ٹانگیں ٹہل ٹہل کر شل ہو چکی تھیں۔ سامنے بستر پر ردا گلے کے گرد پٹی لپیٹے ہاتھ پہ پٹی باندھے دواؤں کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی اور سونیا کو لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے نہیں سوئی اور نہ آنے والی کسی رات میں وہ سو پائے گی۔

"میں گھر میں آیا تو آپی فرش پہ ٹوٹے پیالے کے کانچ پر گری ہوئی تھی۔ گردن اور ہاتھ سے بلیڈنگ ہو رہی تھی اور باہر کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا اور بینڈیج کروائی۔ کہہ رہی تھیں باؤل کچن میں رکھتے ہوئے پاؤں پھسل گیا اور یہ حادثہ ہو گیا۔"

وہ جب سلیمان اور شائستہ بیگم کو ایئرپورٹ سے گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر گھر آئے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ ایک تو فلائیٹ لیٹ ہو گئی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے شائستہ کا بی پی لو ہو گیا تو اسے ڈاکٹر کو چیک کروا کے گیسٹ ہاؤس چھوڑنا پڑا ورنہ وہ ردا سے ملنے کے لیے ساتھ ہی آنا چاہ رہی تھی۔

"کل طبیعت بہتر ہوتے ہی میں اپنی بہو سے ملنے کے لیے آؤں گی اور آپ بھلے اعتراض کرتی رہیں بھابھی! سلیمان بھی میرے ساتھ آئے گا اور آپ یا آذر بھائی بالکل اعتراض نہیں کریں گے۔" وہ مان بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ارے جم جم آؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے اور میں تو ابھی بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ تم اور سلیمان چلو ہماری ہی طرف کیا غیروں کی طرح ہوٹلوں میں رک کر شائستہ! تم تو سچ میں میرا دل ہی برا کر رہی ہو۔"

طاہرہ بیگم کیوں پیچھے رہتیں۔ فوراً بھانجی کی حمایت میں میدان میں کود یں۔ سونیا کو جواب دینے کی مہلت ہی نہیں مل سکی۔

"بالکل شائستہ آپا! آپ کا اپنا گھر ہے۔ ابھی چلیں یا جب آپ چاہیں۔ ہمارے گھر اور دل کے دروازے کھلے ہیں۔" آذر کیوں ماں سے پیچھے رہتا۔ دونوں ماں بیٹا دنیاداری نبھانا تو خوب جانتے تھے ان میں کتنے ایکٹیکس اور سیزر تھے یہ بات سونیا سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔

لیکن واپسی پر تو ان سب کی جان ہی نکل گئی جب ردا یوں پٹیوں میں لپٹی نیم بے ہوش حالت میں نظر آئی۔ سونیا کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا آذر کو تشویش کے ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا۔ رمشا کو بھی آذر سے جھاڑ پڑی کہ اسے کم از کم گھر میں بہن کے پاس رکنا چاہیے تھا۔ اور حمزہ کو بھی سنایا گیا جس میں ذرا سی بھی احساس ذمہ داری نہیں اور طاہرہ بیگم تو ردا کو اس حالت میں دیکھ کر گنگ ہی رہ گئیں۔

"کل اس کی ساس اور سلیمان نے آنا ہے۔ سمجھو بارات سر پہ آ گئی اور لڑکی کی ایسی حالت۔" انہیں تو سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ بات جان سے بڑھ کر عزت پر آ گئی تھی۔

یہی حادثہ دو چار روز پہلے بھی تو ہو سکتا تھا جب شائستہ انہیں ٹکٹ کنفرم ہونے کا بتا رہی تھی وہ اس کی نگٹ

www.pklibrary.com

بڑھوا دیتیں۔ ہوا بھی تو کب۔ ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

گھر میں جیسے صف ماتم بچھ گئی، کسی نے بھی رات کا کھانا نہیں کھایا۔ سونیا روا کے پاس رک گئی جو گہری نیند میں تھی۔ آزر اپنے کمرے میں کوشش کے باوجود سو نہیں پا رہا تھا۔ کروٹیں لے لے کر اس کے پہلو دکھنے لگے۔

"میرا تو دل اس وقت ہی بیٹھ گیا تھا جب کشف کے ساتھ برا ہوا تھا اس گھر میں نامعلوم خدا کا قہر اس کی ناراضی کس شکل میں نازل ہوا اور وہی ہو گیا۔" سونیا بھی بھی تو ہم پرست نہیں رہی تھی۔

"کیسی بڑی بدشگونی ہو گئی مایوں بیٹھنے کے دنوں میں ایسا بڑا حادثہ یا اللہ خیر۔"

طاہرہ بیگم زور زور سے بول رہی تھیں اور سونیا نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے پہلی بار طاہرہ کے خدشوں کو اس کے دل نے بھی سچ جانا تھا وہ سہم کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

فنکشن سے واپس آ کر زینب بے سدھ ہو کر سوئی تھی اور دوپہر کے بعد اٹھی تھی۔ لنچ کرتے ہی وہ کمرے میں آ کر کل کی خریداری کو ٹھکانے لگانے لگی ایک نیلے شاپنگ بیگ پر اس کا ہاتھ رک سا گیا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اس نے یہ شاپنگ بیگ منصور کے ہاتھ میں دیکھا تھا شاید۔

"تو یہ میری شاپنگ میں کیسے آ گیا۔" وہ اس لفافے کو کھول نہیں پا رہی تھی راستے میں بھی منصور نے دو تین بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی زینب نے سرد مہری سے مختصر جواب دیا تھا تو وہ بالکل خاموش ہو گیا ہوٹل کے باہر اسے سارے شاپنگ بیگز تھما کر وہ کچھ بھی کہے بغیر چپ چاپ چلا گیا تھا۔

اس نے سرد پڑتے ہاتھوں کے ساتھ وہ شاپنگ بیگ کھولا۔

خوب صورت پیکنگ میں گولڈن میرون اور ریڈ کے خوب صورت کنٹراسٹ کے ساتھ بہت مہین نفیس کپڑے کی ساڑھی تھی۔

اور جانے کہاں سے ایک بھولا بھٹکا منظر اس کے ذہن پر دستک دینے لگا۔ اس نے زندگی میں پہلی اور آخری بار ساڑھی سونیا کی شادی پر پہنی تھی وہ بھی منصور نے اسے لا کر دی تھی اور بہت اصرار کر کے پہنوائی تھی جبکہ اسے ساڑھی باندھنا کیا سنبھالنا بھی نہیں آتی تھی۔ وہ ساڑھی بھی گولڈن میرون اور مسٹرڈ کلر کا امتزاج تھی۔

اس پوری تقریب کے دوران وہ اپنی جگہ سے دو تین بار مجبوراً اٹھی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ ساڑھی اس کے بدن سے پھسل جائے گی یا اس کا جسم مکمل طور پر اس لباس میں چھپ نہیں سکا۔

اور سب سے بڑھ کر تو اسے منصور سے حیا آ رہی تھی جس نے اس پوری تقریب کے دوران پروانے کی طرح اس کے گرد منڈلانا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

زینب کا غصہ ناراضی دوسرے لوگ دیکھ رہے ہیں، سونیا کے سسرال والے کیا کہیں گے کسی بھی دھمکی کا منصور پر اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"بس میں نے طے کر لیا ہے اب جب بھی میں تمہیں کوئی گفٹ دیا کروں گا تو وہ ساڑھی ہی ہو گی تم سے تو قیامت ڈھاتی ہو ساڑھی میں۔"

"اور میں مر کر بھی نہیں پہنوں گی اس واہیات لباس کو دوبارہ سے۔" وہ اسے چڑا رہا تھا اور وہ چڑ رہی تھی۔

"مجھے یہ تحفہ دو گے تو تمہارے منہ پر ماروں گی میں۔" وہ غصے سے بولی تھی۔ اور اب زینب کو اپنی کہی بات پوری کرنی تھی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا منصور کا گھر کہاں ہے۔

"یہ ساڑھی اس تک واپس کیسے پہنچانی ہے، یہ زینب کی سمجھ میں آ گیا تھا فون کا خیال آتے ہی اس نے پہلے کشف کا نمبر ملایا جو آج بھی بند تھا۔

"یا اللہ۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ شاید کشف کا فون گم گیا ہو۔" وہ فون بند ہونے کی وجہ سوچ رہی تھی۔
مگر وہ خود تو مجھے کال کر سکتی تھی۔
حیدر بھائی نے بھی دوبارہ کچھ نہیں بتایا۔ وہ پریشانی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

سونیا کی صبح کے قریب آنکھ لگی تھی۔ ردا تو ابھی بھی بے خبر سو رہی تھی جب سونیا کے پاس پڑا فون مدھم ٹون میں وقفے وقفے سے بجنے لگا تھا۔
گہری نیند سے ہڑبڑا کر سونیا نے فون اٹھایا۔ باہر ابھی بھی اندھیرا تھا۔ ردا اسی طرح پرسکون سو رہی تھی۔
فون بجتے بجتے بند ہو چکا تھا۔
"کس کا فون تھا اس وقت۔" وہ چیک کرنے لگی کہ زینب کی کال پھر سے آنے لگی۔
وہ کئی بار زینب کی کال اگنور کر چکی تھی، اب اسے فون سننا ہی پڑا۔
"کشف...... ہاں کشف ٹھیک ہے۔" زینب نے شاید سونیا کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا، وہ کشف کا پوچھنے لگی۔
سونیا گڑبڑا کر اٹک کر بولی۔
"پلیز، میری بات کروا دو اس سے، دو دن ہو گئے ہیں۔ اس کا فون مسلسل بند جا رہا ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا، وہ ٹھیک تو ہے نا۔" وہ منت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"ہاں کہا نا۔ وہ ٹھیک ہے۔ اس کا فون خراب ہو گیا ہے، آج کل میں ٹھیک ہو جائے گا۔" بہت سوچ کر اسے یہی بہانا سمجھ میں آیا تھا۔
"تو وہ مجھ سے کسی اور نمبر سے بات کر سکتی تھی، تمہارے نمبر سے۔"
"ہاں کر لیتی۔ اسے شاید خیال نہیں آیا۔ اصل میں میرے ساتھ شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے ناں، تم واپس کب آ رہی ہو زینب!" وہ موضوع بدل کر بولی۔
"آج رات کی فلائٹ ہے تو کل رات کے بعد مطلب پرسوں صبح سے پہلے پہنچوں گی ان شاء اللہ۔" سونیا جیسے اسے سن نہیں رہی تھی۔
"اور جب زینب کو آتے ہی آزر کی اس گھٹیا حرکت کا پتا چلے گا تو زینب کیا سوچے گی میرے بارے میں۔"
"ہیلو...... ہیلو سونیا! تم سن رہی ہو ناں۔" اس کی مسلسل چپ پر زینب کہہ رہی تھی۔
"آں ہاں...... میں سن رہی ہوں۔ اچھا خیر سے آؤ، ہم سب منتظر ہیں۔"
"ردا کے سسرال والے آ گئے، کون سی تاریخ رکھی ہے شادی کی؟" زینب پوچھ رہی تھی اور سونیا چونک کر کسمسا کر کچھ کراہتے ہوئے آنکھیں کھولتی ردا کو دیکھنے لگی جواب یک ٹک سامنے فون سنتی ماں کو دیکھ جا رہی تھی۔
سونیا نے آہستہ سے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

"گر گئی تھی مجھے پتا نہیں چلا، چکر آ گئے تھے...... آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا تھا۔" ردا ہوش میں آنے کے بعد کسی روبوٹ کی طرح وقفے وقفے سے سب کے پوچھنے پر ایک نہ ایک جملہ بول دیتی اور سننے والوں کے متفکر چہرے چیخ چیخ کر کہتے کہ انہیں ردا کی بات کا مکمل یقین نہیں۔
"کسی دم درود والے کو بلا کر دم کرواؤ، اس لڑکی کو شادی کے اتنے قریب ایسا حادثہ ہونا آنکھیں نہیں دیکھے

آ گئے تم اس کی، جیسے ان میں کسی کی پہچان ہی نہیں۔ عزت کا معاملہ ہے۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے، خدا خیر کرے ایسا کیا ہو گیا ہے۔"

طاہرہ سونیا کو تو علی الاعلان کہہ چکی تھیں کہ اب کوئی وظیفہ دعا نہیں کریں گی اس کی اولاد کے لیے لیکن اب ہاتھ میں تسبیح کے دانے گھماتی وقفے وقفے سے کچھ پڑھ کر زروا پر پھونک رہی تھیں۔

"اماں! زروا کے کپڑے ٹیلر سے اٹھانے ہیں۔ ٹیلر کا فون آئے جا رہا ہے، اس نے شام تک پندرہ بیس دنوں کے لیے کسی دوسرے شہر جانا ہے، ابھی جا کر کپڑے نہیں اٹھائے تو مسئلہ ہو جائے گا۔" سونیا زروا کے چہرے سے توجہ ہٹا کر مدھم ملتجی لہجے میں طاہرہ سے کہہ رہی تھی۔ ٹھیک اسی لہجے میں جو اتنے سالوں سے طاہرہ سونیا کے منہ سے سننے کی عادی۔

"حمزہ کو رسیدیں دے کر بھجوا دو، رمشا ساتھ چلی جائے گی۔ مجھے لگتا ہے شائستہ سلیمان کو لے کر نہ آ جائے۔" اس وقت مزید مخالفت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ معاملہ گھر کی عزت کا تھا سو طاہرہ بھی نارمل لہجے میں بولیں۔

"حمزہ گھر میں ہوتا تو مجھے اور کیا چاہیے تھا، اس کو فون بھی کیا ہے، کال ہی ریسیو نہیں کر رہا۔"

اور حمزہ کی وجہ سے سونیا کتنا پریشان تھی، اس کے اظہار کا یہ موقع نہیں تھا لیکن طاہرہ نے معاف تو پھر بھی نہیں کیا۔

"تمہارا سر چڑھا ہے، مت اتنا آسمان پر بٹھاؤ۔ آج باپ کے سامنے کھڑا ہوا ہے، کل کو تمہیں کیا سمجھے گا۔ سمجھاؤ اسے۔ باپ سے معافی مانگے، جوان بیٹا اکھڑا اکھڑا پھرے تو باپ کی دنیا تباہ ہو جاتی ہے۔ دو دن میں میرا آزر جیسے نچڑ کر رہ گیا، ایسی وہ منحوس لڑکی نحوست بکھیر گئی اس گھر میں۔۔۔ سکون ہی غارت ہو گیا۔۔۔"

وہ پھر بھی طنز کے تیر چلانے سے چوکی نہیں۔

سونیا نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"رمشا! ادھر آ کر بہن کے پاس بیٹھو، اس کو اکیلا نہیں چھوڑنا۔ میں ذرا ٹیلر سے کپڑے اٹھوا لوں اور دو چار ضروری چیزیں لینے والی ہیں۔"

سونیا نے کھڑے ہو کر دور بیٹھی موبائل میں مصروف رمشا کو آواز لگائی۔ طاہرہ کو عجیب سی چبھن کا احساس ہوا۔

"کہاں تو ابھی یہ سونیا مجھ سے اجازت مانگ رہی تھی اور اب خود سے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔" دل ہی دل میں بل کھا کر رہ گئیں۔

"کچھ کھانے کو دل کرے تو رمشا سے کہہ دینا اور رمشا! تھوڑی دیر بعد بہن کو جوس ضرور دے دینا۔" ہدایت کرتی وہ طاہرہ سے مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"منصور!" زریں کے آنسو جو تیزی سے بہہ رہے تھے، ایک دم سے وہ چہرہ رگڑ کر بے یقینی سے بولی۔

"مجھے میرا یقین کرو، وہ تو میں......" وہ ایک دم سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے قراری سے بولی۔

"[illegible] اسی لیے نہیں کہہ رہا، میرا پہلے سے پلان تھا اور مجھے ایک دو ضروری کاموں کے [illegible] رہا ہوں۔" وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔ زریں خالی خالی نظروں سے اسے [illegible] پہلے تو منصور نے ذکر نہیں کیا۔

"[illegible] بھی ہے۔ ساری زندگی تو اپنی بہن کے لیے کچھ کر نہیں سکا۔ اس کے گھر کی پہلی

خوشی ہے ماموں ہوں میں ردا کا۔ کبھی ان کی کسی مشکل میں کام تو آ نہیں سکا، اب اس موقع پر بھی نہیں جاؤں۔" وہ جیسے خود سے بھی ناراض تھا۔

ایسا اجنبی زریں نے میر منصور کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ضروری کام اور کون سا ہے۔" وہ بہت دیر بعد بولی تھی۔ منصور نے اپنی اور اس کی کافی کا مگ سامنے لا کر رکھا۔

"گھر ہے وہاں میرا جس کے لیے۔" وہ بولتے ہوئے رک سا گیا۔

"اتنے سال ہو گئے۔ سوچ رہا ہوں اسے سیل کر آؤں یا پھر اسے ٹھیک کرواؤں۔ زندگی کے آخری سال وہیں گزار لیں۔ جو بھی صورت بنی۔" زریں ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اس طرح خود مختاری سے منصور نے پہلے تو کبھی فیصلے نہیں کیے تھے۔" وہ کہہ بھی نہ سکی۔

"اور میں یہاں اکیلی ایما کے ساتھ جبکہ ابھی وہ ہاسپٹل میں ہے، تم اس طرح سے ہمیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہو۔" اسے ایک دم سے طیش آیا تھا۔

"ابھی فوراً نہیں جا رہا۔" وہ اس کے تیور دیکھ کر تحمل سے بولا۔

"میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے، ہفتہ دس دن میں ایما کی کنڈیشن کافی بہتر ہو جائے گی۔ اسے گھر لے آؤں تو میں......" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

اور زریں نے کافی کا بھرا مگ اٹھا کر سامنے دیوار پر مار دیا۔ کپ ایک زوردار دھماکے سے پھٹنے کے انداز میں ٹوٹا تھا۔

"مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو کوئی اور بہانا بناؤ۔ اب اتنے سارے سال گزار کر، میرے پیسے پر عیش کر کے مجھے ذہنی طور پر مریض بنا کر تم مجھ سے جان چھڑا کر بھاگنا چاہتے ہو، میں تمہیں قتل کر دوں گی۔ جان لے لوں گی تمہاری، ایما کی مگر تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ اتنا کمزور سمجھ لیا ہے تم نے مجھے۔" وہ غصے میں پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے کچن کے اسٹینڈ سے بڑے پھل والی چھری نکال کر منصور کے چہرے کے قریب تان لی تھی۔ منصور کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

کشف اپنے سامنے سونیا کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی مگر دوسرے لمحے اس کے چہرے پر شدید غصے کے تاثرات ابھرے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ غصے میں چلاتی سونیا نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی زینب کے کمرے میں لے آئی۔

"چھوڑیں مجھے...... چھوڑیں۔" کشف نے پورا زور لگا کر اپنا ہاتھ سونیا کی گرفت سے کھینچا، غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔

اس کالی رات کو توہین اور ذلت کی چادر اوڑھا کر اس گھر سے نکالا گیا تھا۔ اس نے جھک کر وہ چادر سونیا کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔

"نفرت ہے مجھے آپ سے...... شدید نفرت...... جب تک میں ہوں نفرت میرے جسم میں خون کے ساتھ دوڑے گی۔ آپ جیسی کمزور۔ منافق عورت میں نے زندگی میں نہیں دیکھی...... اور بے شرم بھی......" وہ غصے اور نفرت میں ہر لحاظ بھول چکی تھی۔

"اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آپ میں اتنی ہمت ہے کہ میرے سامنے یوں آ کر کھڑی ہو جائیں۔ نکل

جائیں یہاں سے ابھی...... یہ میرا گھر ہے، آپ کا نہیں۔ جہاں سے آپ مجھے ذلیل کر کے رات کے اندھیرے میں......" اس کے یوں چیخنے پر سونیا نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تھا۔

اور دوسرے لمحے اس نے کشف کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے، وہ ساکت سی دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

زینب اپنے گروپ کے ساتھ ایئرپورٹ کے باہر آ کر رکی۔ ویگن میں سے باہر نکل کر دھند بھری نیم اندھیری سرد رات کو بے نیازی سے دیکھا۔

وہ جو پوری زندگی میں کبھی اپنے شہر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کھنڈر سے گھر کو بس اپنی آخری پناہ گاہ سمجھ کر بھی وہاں سے دور جانے کا حوصلہ اپنے آپ میں جمع نہیں کر سکی تھی۔ آج پورے بارہ دن ایک غیر اجنبی ملک میں گزار کر جا رہی تھی۔

اور دنیا اس آخری پناہ گاہ سے باہر نکل کر اتنی بھی بری، اتنی بھی غیر محفوظ نہیں ہے، جتنا وہ سوچا کرتی تھی۔ اللہ کی بنائی ہوئی یہ دنیا بہت خوب صورت اور دیکھنے کے لائق ہے اور سب سے بڑھ کر ان سارے دنوں میں وہ جو بہت سارے لوگوں کے بیچ اپنے اشعار پڑھتی شروع میں کچھ گھبراتی پھر کم گھبراتی اور آخر بالکل گھبرانا بھول گئی تو اس ساری تبدیلی نے جیسے اسے اندر تک تازہ دم کر دیا تھا۔ اس کے غم کچھ ساختہ اور کچھ خود ساختہ کہیں منہ چھپا کر گم ہو گئے تھے، وہ بہت زمانوں بعد جیسے خود سے ملی تھی۔

اور اس سے بھی تو ملی تھی جس سے بچھڑنے کے بعد وہ خود سے بھی ملنا بھول گئی تھی۔

کسی سرد دھکتی لہر کی طرح یہ بوجھل احساس اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔ وہ جو چند لمحے پہلے خوش و مطمئن تھی، پھر سے غیر مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

"یہ عورت پاگل ہے، پاگل ہو گئی ہے اور مجھے اس سے جتنی جلدی ہو سکے، پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔"

منصور تیز تیز چلتے تندہی سے سوچ رہا تھا، وہ اتنا تیز چل رہا تھا یا شاید بھاگ رہا تھا۔ بہت مہینوں بعد زریں کو یہ دورہ پڑا تھا جس میں وہ کسی کی بھی پہچان آنکھوں میں نہیں رکھتی تھی۔

اور ابھی چند منٹ پہلے جس تردو جتن سے اس نے اس پاگل عورت سے چھری چھین کر دور پھینکی تھی اور اسے بیڈ پر دھکا دے کر خود گھر سے باہر نکل آیا تھا۔

تیز گاڑی کے چیختے ہارن نے اسے ارد گرد کے ٹریفک کا احساس دلایا، وہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ وہ گہرا سانس لے کر خود کو سنبھالتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلا، دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگا۔

"نہیں مجھے اب یہاں نہیں رکنا۔ زریں کی ذہنی حالت جس طرح ہے۔ یہ سوتے میں کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کر سکتی ہے۔ مجھے خرید و ساتک نہیں لینا چاہیے۔ اس کا بیٹا اس کے پاس آتا ہے یا نہیں، یہ میرا درد سر نہیں۔ مجھے اب جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

یہ سوچتے ہوئے وہ خود پر بالکل بھی حیران نہیں تھا کہ اسے اتنے سالوں بعد واپسی کا خیال کیوں آیا، شاید زینب کو اتنے سالوں بعد دیکھ کر، وہ خود ہی مسکرایا۔

"زینب!" اسے لگا اس کے ارد گرد خوش گوار ہوائیں چلنے لگی ہیں، خوشبو کا احساس لیے ہوئے۔

"ہاں شاید اللہ نے میری توبہ قبول کر لی ہے جو مجھے تلافی کا موقع مل رہا ہے، مجھے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا۔ مجھے واپس جانا ہو گا زینب سے معافی مانگنا ہو گی۔ کہیں نہ کہیں اس کی اداس آنکھوں میں میری گمشدہ محبت کی اجلی کرن ابھی بھی سانس لیتی ہے۔ اس لیے تو وہ مجھے خود سے پرے دھکیل رہی تھی کہ کہیں اس کی یہ کمزوری مجھ پر ظاہر نہ

www.pklibrary.com

ہو جائے۔ زینب ابھی بھی ویسی ہے جیسی ......" وہ پھر سے اپنی سوچوں میں بری طرح سے گم ہو چکا تھا۔

اس کی پینٹ کی ہپ پاکٹ میں موجود فون مدھر ٹون میں مسلسل بجے جا رہا تھا۔

اسے کافی دیر بعد یہ ٹون سنائی دی تھی۔

"اسی پاگل خبطی عورت کا فون ہوگا، اب وہ ذہنی مریضہ رو رو کر میری منتیں کرے گی۔ اتنے سالوں سے یہی ڈرامے تو کر رہی ہے۔" وہ زرین سے نفرت کی انتہا پر تھا۔

فون کی اسکرین پر اجنبی نمبر تھا، اس نے کال ریسیو کرلی۔

"جی بات کر رہا ہوں۔ اوہ ہوٹل ٹیولپ ...... یس یس ...... میں آتا ہوں، ابھی پہنچتا ہوں۔" اس نے خوشی خوشی فون کیا۔ زینب نے اسے بلوایا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اڑ کر چلا جائے۔

☆☆☆

"پلیز مت کریں میرے سامنے یہ۔" کشف نے کوفت سے رخ پھیر لیا تھا۔ سونیا اب بری طرح سے رو رہی تھی۔

"مجھے معاف کردو کشف! جو کچھ ہوا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اور میرا اس میں ......" وہ گڑگڑا رہی تھی۔

"آپ کا کوئی قصور نہیں ہے جو کچھ ہوا اس میں تو ...... پھر آپ معافی کیوں مانگ رہی ہیں، پلیز آپ جائیں یہاں سے۔ مجھے نہ آپ سے کوئی بات کرنی ہے، نہ مجھے معافی کی ضرورت ہے۔" وہ کٹھور پن سے کہہ کر دروازہ کھول کر باہر جانے لگی۔

"تمہیں اپنی ماں زینب کی قسم کشف! مجھے معاف کردو ورنہ ...... ورنہ خدا بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔" وہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ کشف سرد نظروں سے اس روتی عورت کو دیکھتی رہی۔ جس کا رونا بھی اسے محض دکھاوا ہی لگ رہا تھا۔

"زینب نے آج رات آنا ہے، اسے یہ سب پتا چلے گا تو اسے کتنا دکھ ہوگا۔ کشف! زینب نے زندگی میں بہت کم خوشی دیکھی ہے، اسے اگر تمہارے حوالے سے کوئی دکھ ملے گا تو اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ مجھ پر نہ سہی اپنی ماں پر رحم کرو، اسے مزید دکھ نہیں دینا ...... اسے یہ سب نہیں بتانا ورنہ اس کا دنیا کے کسی رشتے پر اعتبار نہیں رہے گا کشف!" وہ روتے ہوئے مڑی تو کمرہ خالی تھا، کشف جا چکی تھی۔

☆☆☆

ریسپشنسٹ نے منصور کا کارڈ دیکھ کر اور تصدیق کرنے کے بعد ایک نیلا شاپنگ بیگ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ زینب میم جاتے ہوئے آپ کے لیے رکھوا گئی تھیں۔" وہ میکانکی انداز میں بول رہا تھا۔

"زینب ...... کیا وہ چلی گئی ہیں؟" وہ بہت دیر بعد بول پایا تھا۔

"جی، چھ گھنٹے پہلے ان کی فلائٹ تھی۔" وہ کہہ کر آنے والی ٹیلی فون کال میں مصروف ہو گیا۔

منصور وہ شاپنگ بیگ لے کے بھاری قدموں کے ساتھ چل کر فاصلے پر پڑے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔

اس کی ذرا دیر پہلے ملنے والی خیالی خوشی ہوا ہو چلی تھی۔

"جب میں نے اسے کوئی خوشی نہیں دی تو وہ مجھے کوئی خوشی کیوں دے گی۔ میں ایسی کسی رعایت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔" وہ کرب سے سوچ رہا تھا۔

"اس نے جانے سے پہلے مجھے بتانا، مجھ سے رابطہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" ایک اور گلہ نے سر اٹھایا۔

www.paklibrary.com

"کس حوالے سے وہ تمہیں اس قابل سمجھتی، تمہارا حوالہ تو کبھی بھی اس کے لیے خوشی کی وجہ نہیں بنا تو تمہیں ایسی کوئی خوشی کیوں ملتی۔" زینب جیسے بڑے تنفر سے کہہ رہی تھی، منصور گم صم بیٹھا رہا۔

☆☆☆

کشف صالحہ کے ساتھ مل کر کچن میں زینب کی پسند کا کھانا بنا رہی تھی، اسے لگا جیسے وہ صدیوں بعد اپنی ماں سے مل رہی ہے۔

اس کی چھوٹی سی دنیا کا اکلوتا رشتہ جس پر وہ اپنا سب کچھ وار سکتی تھی۔ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی تھی۔

"کشف بچے! کدھر گم ہو پیاز براؤن ہو گئی ہے اور تمہارا فون بجے جا رہا ہے۔ سنو جا کر، دیکھنا کہیں زینب کی کال ہو۔" صالحہ اسے چولہے کے آگے سے ہٹاتے ہوئے بولیں تو وہ دوڑ کر صحن میں پڑی کرسی پر رکھا فون اٹھا کر نمبر دیکھے بغیر کال ریسیو کرنے لگی۔

"ہیلو آنی..... کیسی ہیں آپ...... آ گئی ہیں۔" وہ بے اختیار بولے گئی۔

"میں موحد بات کر رہا ہوں، آنی کی فلائٹ شاید رات میں پہنچے گی، ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔" دوسری طرف موحد کی بھاری آواز سن کر جہاں اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی وہاں اسے عجیب سی خوشی کا اتنے دنوں بعد احساس ہوا تھا۔

"ہیلو کشف! آر یو آل رائٹ۔" وہ اس کی گہری چپ پر بولا۔

"ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر مسکرائی۔ دل کی یہ حالت نئی سی تھی اس کے لیے تو۔

"آئی ایم فائن۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اگر آپ کو میرا کال کرنا اچھا نہیں لگا تو میں فون بند کر دیتا ہوں۔" اس کے انداز پر وہ بولا۔

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں۔ دراصل میں ایکسپکٹ نہیں کر رہی تھی کہ آپ کی کال ہو گی۔" وہ وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

"تو کس کے فون کا انتظار تھا آپ کو۔" وہ شاید اسے چھیڑ رہا تھا۔ بلال کا نام کشف کے لبوں پر آتے آتے رہ گیا۔

"مجھے لگا، شاید یہ آنی کا فون ہے، میں اداس ہو گئی ہوں ان کے بغیر۔ اتنے دن ہو گئے اور میری بات بھی نہیں ہوئی ان سے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"بات کیوں نہیں ہوئی۔" وہ شاید بات بڑھانے کو بولا۔

"بس یوں ہی۔" وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

"ویسے وہ ٹھیک ہیں اور مجھے کافی خوش بھی لگیں۔" وہ اسے سرپرائز دینے والے انداز میں بولا۔

"واٹ..... آپ کی بات ہوئی ان سے۔" وہ توقع کے مطابق حیران تھی۔

"بات نہیں ملاقات۔" موحد کو بھی مزا آنے لگا۔

"پلیز۔ آپ مذاق نہیں کریں۔" وہ کچھ چڑ کر بولی۔

"کیا ہم دونوں میں پہلے بھی ایسا مذاق ہوتا رہتا ہے؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ کچھ شرمندہ سی ہوئی۔

"ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں مجھے کینیڈا جانا پڑا تھا تو وہیں ملاقات بھی ہو گئی۔" وہ اسے تفصیل بتانے لگا اور کچن سے آتی صالحہ اسے یوں مگن دیکھ کر مطمئن سی کچن میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

www.pklibrary.com

"ماما...... ماما...... سیو می...... پلیز ماما...... ہیلپ می......" وہ فضا میں تیز تیز ہاتھ چلاتے اونچی آواز میں چیخ رہی تھی۔

منصور ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ ایما آنکھیں بند کیے چلا رہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی پشت میں لگی ڈرپ کی پن کینولے میں سے اکھڑ چکی تھی اور اس کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

منصور نے تیزی سے کاٹن اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ایما کو پکڑ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے جیسے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔

"ایما...... ایما میری جان...... مائی سویٹ ہارٹ! میرے بچے! کیا ہوا ہے تمہیں؟ کچھ نہیں ہوا، تم ٹھیک ہو۔ دیکھو میں ہوں تمہارے پاس...... دیکھو تمہارے پاپا...... لک ایٹ می۔" وہ اسے بچے کی طرح تھپتھپا کر پیار کرتا چمکار رہا تھا۔

وہ پہچان سے عاری نظریں لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ نرس شور سن کر اندر آ گئی تھی۔

وہ اس کا خون صاف کر کے اب کینولا نہیں اور سیٹ کر رہی تھی۔ وہ جگہ جگہ نس ڈھونڈنے کے لیے ایما کی کلائی ہاتھ بازو میں سوئی چبھو رہی تھی مگر ایما بغیر کسی تکلیف کا اظہار کیے چت لیٹی چھت کو دیکھے جا رہی تھی۔ ہر بار سوئی کھبنے پر منصور کو تکلیف ہوتی لیکن وہ تکلیف سے عاری تھی۔ خدا خدا کر کے نس مل گئی، نرس ڈرپ لگا کر چلی گئی۔

منصور اب اس کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ ہوٹل سے سیدھا ایما کے پاس آ گیا تھا۔ زریں کا اس دوران کوئی فون بھی نہیں آیا تھا، نہ اس نے خود رابطہ کیا۔ اس کا دل جیسے زریں سے بھر سا گیا تھا۔

"پاپا! آئی ایم سوری۔" وہ تقریباً غنودگی میں چلا گیا تھا جب اس کے کانوں نے ایما کی مدھم سی سرگوشی سنی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا تھا اور پوری آنکھیں کھول کر ایما کو دیکھنے لگا جو ابھی بھی چھت کو دیکھے جا رہی تھی۔

"ایما!" اس نے آہستہ سے پوچھنے والے انداز میں پکارا۔

"میں نے آپ کو بہت ہرٹ کیا پاپا! آئی ایم سوری۔" وہ اسی طرح سرگوشی کے انداز میں پھر سے کہہ رہی تھی اور منصور کو لگا جیسے اس کا دل کسی نے آنچ دیتے دیے پر رکھ دیا تھا، قطرہ قطرہ پگھلنے کے لیے۔

"ایما میری جان! تم نے مجھے کبھی ہرٹ نہیں کیا۔" وہ جذبات سے مغلوب اس کا ہاتھ چوم کر اسے دلاسا دینے لگا۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا پاپا!" اس نے بہت عرصے کے بعد منصور کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ منصور کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

"میری بچی، میری بیٹی! میں تم سے کبھی ناراض نہیں تھا تو معاف کرنے کا کیا سوال۔ میں خوش ہوں کہ میری ایما جلدی سے ٹھیک ہو رہی ہے اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" وہ بولے گیا۔

"تو پرامس کریں، کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گے، کبھی نہیں۔" اس نے باپ کی آنکھوں میں آس بھری نظروں سے دیکھا اور منصور ساکت رہ گیا۔ ایما کو کیسے پتا چلا کہ وہ اسے چھوڑ کر جانے والا ہے۔

☆☆☆

"ہم گھر کی طرف جا رہے ہیں حیدر! مجھے سونیا کی طرف جانا ہے۔ کشف وہاں ہے۔" بہت دیر بعد زینب کو خیال آیا تو اس نے باہر کی طرف مسلسل بڑھتے ٹریفک کے رش کو دیکھ کر سڑکوں کا اندازہ لگایا۔

"کشف گھر پر ہی ہے۔" وہ چند لمحوں بعد بولا۔

"وات...... وہ گھر پر کیسے ہو سکتی ہے۔ میں تو اسے سونیا کی طرف...... اور وہ وہاں اکیلی رہی...... مائی گاڈ! تو میرا دل یوں ہی بے چین نہیں تھا۔ کیا ہوا ہے۔" وہ بے چینی سے بولے گئی۔

"اونہوں، کچھ نہیں ہوا زینب! تم فضول سوچیں سوچنا بند کرو۔ تمہیں پتا تو ہے کہ کشف کسی کے گھر زیادہ دن نہیں

www.pklibrary.com

رہ گئی۔ پرسوں وہ آ گئی تھی گھر واپس اور وہ اکیلی نہیں ہے۔ اماں جی ہیں اس کے ساتھ۔ تم خوامخواہ پریشان نہیں ہو۔" حیدر اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

"پرسوں سے...... اور اس سے ایک دن پہلے سے کشف کا فون بند ہے۔ مجھ سے بات نہیں کی اس نے۔" وہ منہ میں بڑبڑائی۔

"پھر وہم کر رہی ہو۔" حیدر نے ٹوکا۔

زینب پریشان ہو چکی تھی، کچھ نہیں بولی۔

"تم نے بتایا نہیں۔ کیسا رہا تمہارا ٹرپ۔ مزا آیا وہاں۔" حیدر موضوع بدل کر پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک تھا، سب بتایا تو ہے۔" وہ کچھ کوفت سے مختصراً کہتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

حیدر بھی اس کے جواب میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔

"اور ثمینہ بھابھی کیسی ہیں اور بلال!" حیدر کی مسلسل خاموشی پر زینب کو اپنی بداخلاقی کا احساس ہوا۔ یہ شخص جو اس کے ہر موقع پر کام آتا ہے، اس نے کبھی اس کا حال تک پوچھا نہیں۔

"ہوں، ٹھیک تھے سب بلکہ ہیں......" وہ کچھ بے دھیان سا بولا اور پھر خود ہی درستی کر کے ہلکا سا ہنسا۔

"دنیا گول ہے، کسی نے سچ کہا ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"کیا مطلب؟" زینب نا سمجھی سے بولی۔

"پتا ہے۔ میں نے منصور کا پتا حاصل کر لیا تھا مگر تمہیں سی آف کرنے آیا تو اس کا ایڈریس دینا بھول گیا اور بعد میں جب بھی بات ہوئی، میرے ذہن سے نکل جاتا۔ ابھی تمہیں دیکھا تو پھر سے یاد آ گیا۔" وہ تفصیلاً بولا۔

"مل گیا تھا وہ مجھے وہاں۔" وہ آہستہ سے بولی تو اب چونکنے کی باری حیدر کی تھی۔

☆☆☆

"رمشا! میری ایک نصیحت مانو گی۔" ردا آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے برابر میں کھڑی رمشا کو دیکھتے ہوئے بولی جو اس کو بڑے شوق سے تیار کر رہی تھی۔

"کیا آپی!" وہ اب اس کے لمبے بالوں میں چھوٹے چھوٹے کلپ لگا رہی تھی۔ ردا کی حالت کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ باہر شائستہ اور سلیمان آ چکے تھے۔ آج ان کے گھر میں گرینڈ ڈنر تھا جس میں شادی کی تاریخ بھی فکس ہونی تھی۔ اس لیے سونیا رمشا کے ذمے لگا کر گئی تھی کہ وہ ردا کو بہت اچھا سا تیار کرے، خاص طور پر اس کے گلے کے زخم کو دوپٹے کے اسٹائل سے کسی طرح چھپا دے۔

رمشا نے دوپٹا ابھی ایک طرف ڈال رکھا تھا، وہ فی الحال اس کا میک اپ کرنے کے بعد اس کے بال بنا رہی تھی۔

"تم بھی محبت نہیں کرنا...... کسی سے بھی نہیں۔ کوئی تمہیں کتنے ہی سہانے خواب کیوں نہ دکھائے۔ تم محبت کے فریب میں نہیں آنا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"آپی! کیا کہہ رہی ہو؟" وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"یہ--- محبت کے دعوے کرنے والے دھوکے باز ہوتے ہیں...... مکار...... اپنے جال میں پھانسنے والے۔ جیسے اس نے مجھے پھانسا۔" وہ کہہ کر بے قراری میں اٹھی اور کھلے دروازے میں کھڑے سلیمان کو دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

فرح بخاری

وہ نازنین

گھپ تاریک رات کی سیاہی میں وہ کالی چادر میں لپٹا بھاگتا وجود بار بار تاریکی میں مدغم ہو کر ابھر رہا تھا۔ ایسی ہولناک لحہ لحہ موت کے قریب تر کرتی قبر جیسی تاریکی اسے اپنی آغوش میں بھر لینے کو بے تاب نظر آتی تھی اور وہ اس ماں کی گود جیسی موت کی آغوش میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر بے تابانہ سا جانے کو تیار تھی۔ پل

ناولٹ

پل رنگ بدلتی زندگی کے دھنک رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ اسے اب تک راس نہ آیا تھا۔

اونچے نیچے، ناہموار، پتھریلے راستے پر ننگے پاؤں ہانپتی کانپتی وہ بنا سوچے سمجھے اونچائیوں کی طرف بھاگتی جارہی تھی، سنگلاخ پہاڑوں میں بسنے والوں کے دل ان پتھروں سے بھی کہیں سخت تھے، جس بستی کا ہر ذرہ اس کی عزت کا دشمن تھا۔ اس کی چٹانوں سے ٹکرا کر آج وہ خود ہی اپنے آپ کو چکنا چور کردینا چاہتی تھی۔ لرزتی ٹانگوں کو ایک ذرا سی دیر کو روکتے اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ لرزتی پلکوں سے درد کے کئی آنسو ایک ساتھ ٹوٹ کر گرے۔

یہ ٹھنڈی ریت اور پتھروں کا میدان، یہ دریا، یہ پہاڑی سلسلہ اور...... اس کی نظر دور دکھائی دیتی چند روشنیوں اور آبادی پر پڑی۔

"اور یہاں بستے یہ روایت پرست، مغرور، بے رحم انسانو! مہمان پر جان نچھاور کرنے والو یہ جارہی ہے درد اور کرب کے تحفے لے کر بچے وجود کی خود اپنے ہاتھوں سے کرچیاں کرنے تمہاری ایسی مہمان... جسے رکھنے کو تمہارے دلوں اور گھروں میں تو کیا، جوتی کے تلوے میں بھی جگہ نہ تھی۔

"یااللہ... میرے پاس تمہاری پناہ میں آنے کے سوا کوئی راستہ نہیں، مجھے معاف فرما دینا۔" وہ زخمی پیروں کے ساتھ بالآخر پہاڑ کی چوٹی تک آ پہنچی تھی، جہاں سے واپسی کا راستہ بہت آسان بڑا سیدھا تھا۔ اس نے بنا ایک بھی پل پچھتاوے اور سوچے اپنی آنکھیں بند کیں اور خود کو پھڑ پھڑاتی ہوا کے سپرد کردینے کو بازو بلند کیے۔

اے مہ کوا (مت کرو)... ایک غصیلی کرخت

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

آواز نے لمحہ بھر کو اس کے قدم لرزائے۔ پلٹ کر سخت تعجب سے اس اچانک آ جانے والے کو دیکھا۔ اور دیکھ لینا مزید بے یقینی کا باعث ثابت ہوا۔ اس نے نفرت سے نتھنے پھلاتے گردن دوبارہ سیدھی کر لی۔

آنے والا ابھی بھی کافی فاصلے پر تھا اور جو فیصلہ وہ اس وقت کر چکی تھی، کوئی محض ایک اونچی آواز نکال کر اسے اس سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر موجود اس وقت اترائی کی گویا نوک پہ کھڑی تھی۔ سرد ہوا کے تھپیڑے جسم کے آر پار ہوئے جا رہے تھے۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں آنکھیں بند کرتے خود کو آگے کی طرف جھکا دیا۔

عزت نہیں تو زندگی بھی نہیں۔

☆☆☆

پچھلی رات کی تیز طوفانی بارش کے بعد دھلی دھلی صبح معمول سے کچھ زیادہ روشن اور اجلی معلوم ہو رہی تھی۔ گھر کی چھت پر چار دیواری پہ کہنیاں ٹکائے وہ پیچھے کے پتھریلے میدان اور کوہ سلیمان کے سنگلاخ پہاڑوں پر نظریں جمائے دھیمے دھیمے مسکرا رہا تھا۔ ڈیڑھ دو ہفتوں کے وقفے سے دو روز کے لیے میسر آنے والے گھر کے یہ پرسکون شب و روز اسے یونہی طمانیت بخشا کرتے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اس کا یہ گھر، اس کا وطن مسلم باغ اس کی تمناؤں کا مرکز، اس کی چھوٹی سی دنیا اس کا سب کچھ تھا۔ پچھلی شام وہ کوئٹہ سے گھر واپس پہنچا تھا۔

وسط اپریل کی وہ ایک ٹھنڈی خوش گوار صبح تھی۔ سہ پہر کو بادلوں کا گھر آنا اور کبھی ہلکی تو کبھی تیز بارش برساتے آگے نکل جانا یہاں کا تقریباً روز کا معمول تھا۔ صبح وہ ذرا زیادہ جلدی بیدار ہو گیا تو سہانے دن کا استقبال کرنے کو بے اختیار من مچل گیا۔ کوئٹہ کی صبحوں اور شاموں میں جو بھاگ دوڑ اور مصروفیت تھی، وہ کم از کم موسم سے ہرگز لطف اندوز نہ ہونے دیتی تھی۔ گدگداتے موسم اور ڈھیر ساری فراغت سے حظ اٹھانے کا مزا سوائے مسلم باغ کے کہیں میسر نہ آ سکتا تھا۔ ہوا سے اڑتے اس کے ہلکے سخت اور قدرے بڑے گول گول چھلوں جیسے گہرے براؤن بال اس کی مردانہ وجاہت میں مزید اضافے کا باعث تھے۔ کبھی کبھی جنہیں ہاتھوں سے پیچھے لے جاتے وہ اپنی روشن براؤن آنکھیں دھلے دھلے پتھروں پر جمائے جیسے ایک ایک پتھر کو نہار رہا تھا۔ لبوں پر میٹھی سی ہنسی دبی تھی۔ بالوں کی ہم رنگ اس کی باریک براؤن مونچھوں کے ساتھ آج شیو بھی دو روز کی بڑھی ہوئی سی نظر آ رہی تھی۔ بہت ہلکے آسمانی رنگ کے شلوار قمیص کے ساتھ اس نے کندھوں پر اپنی کالی شال ڈال رکھی تھی۔

پہاڑوں پر سرمئی بادل چکراتے بکھر رہے تھے۔ مسکراتی آنکھوں نے پہلے تو چوٹی سے نیچے میدان اور دور پتھروں کے بیچوں بیچ سے گزرتے دریائے ژوب کو دیکھا پھر دور کے مناظر سے نگاہوں نے گھر کی چار دیواری سے دائیں ہاتھ دکھائی دیتے آڑو، آلو بخارے اور انگور کے باغات تک کا سفر کیا اور لبوں کی نرم میٹھی مسکان سمٹ کر ایک کرب انگیز ماتھے کی شکن کی صورت نمودار ہوئی۔

موٹے پتھروں اور گارے کی دیوار کے اندر بنے یہ باغات دور تک ایک قطار کی صورت جاتے دکھائی دیتے۔ واسع کی نظریں تیسرے نمبر والے باغ پر حسرت سے آ کر کہیں تو رکی ہی رہ گئیں۔ اس طرف دیکھنا ہمیشہ ہی اسے عجیب سی کیفیات میں گھیرنے لگتا تھا۔

"کیا سوچ رہا ہے میرا لال؟" رباب کی آواز بڑی ہی غیر متوقع پیچھے سے آئی تھی۔

"ہوں۔" وہ چونک کر پلٹا، اسے رباب کے آنے کی واقعی خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس پر نظر پڑی تو ہلکا سا مسکرا دیا۔ وہ ہاتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ واسع کے مڑنے پر کپ آگے بڑھا دیا۔

"پریشان ہو کسی بات سے؟" وہ بغور اس کا چہرا دیکھ رہی تھی۔ واسع نے ایک زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

"نہیں۔ پریشان کیوں۔ یونہی موسم انجوائے

www.paklibrary.com

کر رہا ہوں۔"

"مجھے تو کسی گہری سوچ میں لگ رہے تھے۔ اور نظریں بھی۔" رباب نے ابرو سے نیچے باغ کی جانب اشارہ کیا تو واسع کی بے اختیار ٹھنڈی آہ نکل گئی۔

"اپرینٹس (وکالت کی عملی پریکٹس سے پہلے حاصل کیا جانے والا تجربہ) ختم ہونے والی ہے۔ منزل کے قریب پہنچ کر گھبراہٹ۔ شاید فطری بات ہو۔ کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔" اس نے نرم انداز میں اقرار کرتے کپ لبوں سے لگایا۔ رباب کی خالی خالی نگاہیں بھی باغ کی طرف بھٹکنے لگیں۔

"اللہ پاک ہماری مدد کرے گا لالہ! تمہاری محنت ضرور رنگ لائے گی۔ لیکن جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں تھوڑا صبر اور...... پہلے تم تسلی سے اپنا تجربہ بڑھاؤ۔"

"ہاں، مجھے پہلے بہت سے ضروری کام دیکھنے ہیں۔ ہاری کی مشکل پڑھائی آ رہی ہے، اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ پہلے مجھے اپنا دم خم آزمانا ہے۔"

"لالہ! تم وکالت بھی کوئٹہ میں کرو گے؟ وہ جو عدالت میں وکیل بیٹھتے ہیں اور......" رباب کو زیادہ سمجھ تو نہیں تھی اور جتنی تھی، اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بیان کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے یہ تجربہ حاصل کرنے پر لائسنس ملے گا، پھر میں اپنا آفس کھول کر لوگوں کے کیسز لے سکتا ہوں اور مجھے اب واپس لوٹنا ہے، اس لیے اپنے کام کا آغاز یہیں کروں گا۔"

"اور پھر ہم اپنے لالہ کی دلہن بھی تو لائیں گے۔" رباب کے گلابی رخساروں پر مسکرانے سے شرارتی ڈمپل پڑنے لگے، شفاف چمکتی آنکھوں میں شوخی لہرائی۔ واسع نے نچلا لب دانتوں میں دباتے اس کے سر پر پیار سے انگلیاں بجائیں۔

"پہلے تمہیں رخصت کریں گے پاگل۔"

"نیچے آجاؤ، اماں نے ناشتہ بنا لیا ہوگا۔" وہ شرم سے فوراً رخ پھیر گئی۔ واسع نے مڑ کر ایک نظر باغ کی طرف دیکھا، حسرت بھری یہ نگاہیں معلوم نہیں کب قیام پائیں گی۔

"آسانیاں فرمانا مالک۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ایک آہ کھینچی اور خود بھی سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

"چپ شش گڑیا۔ نہ نہ۔ بس۔"

نغمہ فیڈر ہلاتی تیز قدموں سے اندر آئی۔ معیزہ نے رو رو کر طوفان مچا دیا تھا۔ پلنگ پر بیٹھتے اس نے پہلے معیزہ کو گود میں لیا پھر فیڈر اس کے منہ سے لگا کر اس کے ہنگامے کو بریک لگائی اور جوں ہی اس کے بے چین گلے کو قرار آیا نغمہ نے ایک جلتی ہوئی نگاہ ذرا فاصلے پر بیٹھے شوہر پر ڈالی۔ اللہ جانے کیسا بے حس اور پتھر آدمی تھا۔ کسی اولاد کے لیے جس کا دل نہ پسیجے۔ وہ دردیسوں کا باسی۔ خلاؤں میں گھورتے عمر گزر گئی۔

"ذرا دیر گود میں لے کر بہلا نہیں سکتے تھے۔ چیخ چیخ کر گلا زخمی کر لیا معصوم نے۔" وہ جلی بھنی تو بیٹھی تھی۔۔ غبار نکالے بنا چین نہیں آیا۔

"مجھے کیا پتا تھا، اتنی دیر لگا دو گی۔ اپنے ہی کام ڈھنگ سے کر نہیں پاتیں۔" وہ بھی تیوری چڑھائے ہوئے تھا۔

"اولاد کے رونے میں کوئی دیر سویر دیکھتا ہے۔ ذرا سا بہلانا پچکارنا ہی تو تھا۔" وہ بھی بھڑک اٹھی۔

"لیکن نا۔ پیدا بھی ہم کریں، پالیں بھی ہم۔"

"گود میں جھلانے کو پالنا کہتی ہو۔" وہ چیخنے لگا۔ "کما کر کون لاتا ہے؟"

"میری ایک ہی بات پر اچھلنے لگتے ہیں، یہاں تو منہ سے لفظ نکالنا بھی گناہ ہو جاتا ہے۔" نغمہ کی آنکھیں گلابی ہونے لگیں۔ "ناقدروں کی جگہ کبھی خالی ہو تو ہماری باری بھی آئے۔"

وہ معیزہ کو گھٹنے پر ہلاتے اندر کی بھڑاس بھی نکال ہی بیٹھی۔ سیف نے غضب ناکی سے ایک نظر اسے دیکھا، بات ایسی گہری بھی نہ تھی کہ مفہوم سمجھنے میں دیر لگتی، اس نے قمیص پہنتے اسٹیل کا ہینگر دروازے پہ دے مارا۔ نغمہ معیزہ کو اٹھائے باہر نکل گئی۔ بے کار تھا، کچھ بھی کہنا۔

"اب کیا ہو گیا؟" ناشتے کی چوکی پر بیٹھی اماں نے معیزہ کو بازوؤں میں لیتے ہوئے تشویش سے بہو کا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں پھر متورم سی ہو رہی تھیں۔

"بھی ٹھیک لیا میری کسی بات کو۔" وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتی دوسری چوکی پر بیٹھ گئی۔ "سیدھا بھی بولوں تو الٹا ہی لگے گا۔"

"تم بھی تو آگ اگلتی ہو۔" ذرا دور چارپائی پر لیٹی دادی نے ہاتھ کا پنجہ دکھایا تو نغمہ نے مددطلب نگاہوں سے ساس کی طرف دیکھا۔

"سچ ہی تو کہتی ہے، تم چپ کہاں ہوتی ہو۔" ساس نے خفگی سے نغمہ کو دیکھا۔ وہ حکیم جان کی اکلوتی بہو تھی، پیار بھی بہت کرتی تھیں، ڈانٹ بھی دیا کرتیں۔ پھر نغمہ کو بھی ساس اور دادی کی بات کہاں کبھی بری لگی تھی۔ اسے بھی تو سارے گلے سیف اللہ سے تھے۔ سو کیا وہ تو اس کی ہزار برائیاں بھی معاف کرنے کو تیار تھی اگر جو ایک ذرا سی جگہ وہ اپنے دل میں دے دیتا۔ اب خدا خیر سیف کے نصیب کھوٹے تھے یا نغمہ کی قسمت میں دعا لکھا تھا، ایک نہ ملی تو پیا کے دل میں کم بخت ماری محبت ہی نہ ملی اور اس پاگل کو بولائے محبت اس زندگی سے اور کچھ چاہیے ہی نہیں تھا، کاش۔ کبھی تو...... اے کاش...... وہ پھر آہ بھر کے رہ گئی۔

☆☆☆

"نصیر!" رباب کی دھڑکنیں پوری ڈوب کے دوبارہ ابھری تھیں۔ نچلا لب دانتوں میں دباتے سختی سے آنکھیں میچ کر خود کو یقین دلایا۔ کیا واقعی اس کے کانوں نے وہی محبوب آواز سنی تھی۔ دروازے پہ رکھا ہاتھ کانپ سا گیا۔ دیوار سے لگی وہ اس بھاری مانوس آواز کو سنتے ہوئے دل سنبھالنے میں کوشاں تھی۔ اللہ خیر ڈوب سے کب آیا تھا اور...... اور کبھی ایسے وقت میں جب واسع ابھی کچھ دیر پہلے باری کو لے کر نئے ٹیوشن والے ٹیچر کی طرف نکلا تھا۔ گھر پہ اس وقت صرف وہ اور اماں تھیں۔

وہ بیرونی دروازے کی دستک سن کر بستر سے اتری تھی، دوپٹہ اوڑھ کر چپلیں پہننے تک اماں نے دروازہ کھول بھی دیا تھا اور جب تک رباب کمرے کے دروازے تک پہنچی نصیر اس کی اماں کی معیت میں برآمدے تک آچکا تھا اور رباب کے تو خواب و خیال میں بھی کہیں نصیر کی آمد نہ تھی۔ دل کی روانی ایک محبوب آواز کانوں میں پڑتے ہی بے ربط دھم دھم میں تبدیل ہوئی اور وہ دروازے کی اوٹ میں ہوتے دیوار سے لگ گئی۔ اب باہر کیسے جائے۔

اتنے دنوں بعد کا یہ پہلا پہلا سامنا بڑا ہی دل ربا ہوتا تھا۔ آنکھیں، پلکیں، ابرو، ہنسی، ہاتھ کچھ بھی تو اختیار میں نہ رہتا۔ بھلا اماں کی موجودگی میں کیوں کر سامنا کر پائے گی۔

"کتنے دن رُکو گے نصیر؟" اماں کی آواز کانوں سے ٹکرائی اور رباب نے سانس روک کے کان لگائے۔

"مامی، بس دو دن ہوں اور...... پیر کی صبح ڈیوٹی دینی ہے۔"

"ہاں۔ نوکری بھی تو ضروری ہے، اچھا بیٹھو نصیر! چائے بناتی ہوں۔"

"نہ مامی! تکلیف نہ کریں، میں تو قدم بوسی کو آیا تھا۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی تو پہنچا ہوں۔ ابھی ناشتہ کیا ہے۔"

"واسع بھی دیکھو تو، ابھی ابھی نکلا ہے، باری کی طرف سے پریشان رہتا ہے، اس کی پڑھائی کا مشکل سال ہے اور وہ ادھر ادھر آوارہ گردیاں کرتا رہتا ہے، اس کو کسی استاد کے پاس بٹھانے گیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، اب تو آتا جاتا رہوں گا، اچھا ہوا، واسع بھی آیا ہوا ہے، ہماری ملاقات تو آج کل زیادہ ہو بھی نہیں پاتی، کبھی میں ڈوب تو کبھی یہ کوئٹہ۔"

"بس دعا کرو، اب تو پکا ادھر آجائے۔ کہہ رہا تھا ادھر کا کام ختم ہونے والا ہے۔"

"جی بتا رہا تھا۔ فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔ اللہ پاک اس کو ترقی اور کامیابی دے۔"

"آمین۔" جمیلہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے لمبی سی آمین کہی۔

"نانی نہیں ہیں گھر پہ؟" نصیر نے دور تک

وہ گئیں، پھر گھبرائی۔

"گھر کا کام عبدالرحمن کی طرف گئی ہیں۔ شمیم بھابی نے بلایا تھا۔" انہوں نے ہاتھ سے دائیں جانب اشارہ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "بیٹھو نصیر، میں ابھی آتی ہوں۔"

"وہ اسے سوکھے منہ تو ہرگز جانے نہ دیتیں، کچن تک دور جاتی ان کی چپلوں کی آواز نے رباب کی سنبھلتی دھڑکنیں نئے سرے سے بڑھا دیں۔ اماں سے نصیر کی خوب گاڑھی چھنتی تھی، ان کی گھر موجودگی میں وہ نہ بھی ذرا نہ جھجکا۔ پھر رباب اسے بتا چکی تھی کہ اماں کو سب پتا ہے، ایسے میں مامی کا محبت سے پیش آنا اور کسی داماد جیسا برتاؤ کرنا نصیر کے حوصلے مزید بڑھا دیتا۔

اُس نے باورچی خانے میں داخل ہوتی مامی جمیلہ کو مسکرا کر دیکھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا، وہ تو اب پورے اہتمام سے چائے لے کر ہی وہاں سے نکلنے والی تھیں۔ نصیر نے دوسری نگاہ سامنے کے کھلے دروازے پر ڈالی۔ چلتے ہوئے دروازے کے بیچوں بیچ آیا۔ پلنگ پر اُلٹے رکھے ڈائجسٹ اور چادر کی شکنوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ دل نشیں کچھ دیر پہلے تک یہیں بیٹھی تھی۔ تو اب۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے سامنے دکھائی دیتے کمرے پر تفصیلی نظر ڈالی، دروازے کے دائیں ہاتھ کے پٹ کے ساتھ تو دائی دیوار تھی۔ تو مطلب وہ اس وقت اس کے بائیں ہاتھ کے کھلے پٹ کے پیچھے چھپی تھی۔ نصیر نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ رباب کو اپنی آنکھوں کے سامنے نصیر کی کھلی ہتھیلی دکھائی دی، تو اس نے ڈھونڈ نکالا تھا اُسے، وہ بھی بھرپور اعتماد کے ساتھ۔ رباب نے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

"ملنے کیوں نہیں آئیں بے ادب؟"

"آ رہی تھی۔" رباب سے پلکیں نہیں اٹھائی گئیں۔

"جھوٹی۔" نصیر ایک جذب سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ درمیان میں پورا ڈیڑھ ماہ گزر گیا تھا۔ نئی نئی ملازمت، رہائش کے کچھ مسئلے، وہ درمیان میں چاہ کر بھی آ نہیں پایا اور آج کتنے دنوں بعد اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ وہ جو برسوں سے اس کے ایک ایک پل کی شریک تھی، دوری نزدیکی کے فاصلے جس کی چاہت میں ہیچ تھے، جو شخص اپنے دل ربا تصور سے رگ و جاں میں سمائی رہتی تھی، نصیر کی نگاہیں ان لمحوں میں کہیں اور بھٹکتی رہتیں تو گناہ گار ٹھہرتیں۔

"سچ کہہ رہی ہوں خان۔" اُس نے دل کی دھڑکنوں کے رواں ہوتے بالآخر اپنا ڈانواں ڈول اعتماد بحال ہوتا محسوس کیا تو نرمی اور پیار سے پہلی مرتبہ مخاطب بھی کر ڈالا اور یہ خان کہہ کر بلانے کی ادا تو نصیر کا اور بھی دل موہ لیتی۔

"پھر کہو۔" اُس کا لہجہ اپنے آپ دھیما اور رواں ہوا، رباب نے سر اٹھایا، پہلی شوخ مسکراتی نظر نصیر کی آنکھوں میں ڈالی۔

"کہتی ہوں لیکن یہ "بے ادب" کیوں؟"

"میں نے تو عمر کے فرق کی وجہ سے کہہ دیا، اچھا تو تم کیا سمجھیں۔ ہاں؟" وہ اب تنگ کر رہا تھا۔ رباب بری طرح جھینپ گئی، نصیر بھی کہاں کم تھا۔ رباب سے جواب نہیں بن پایا، بدتمیز نے شرمندہ ہی کر دیا تھا۔

"باادب بننے کی پریکٹس شروع کر دو شاہ ہے۔" نصیر اسے لاجواب کہاں دیکھ سکتا تھا۔ اُمید کے پھول اس کے دامن میں بھرتے اس کا چہرہ اوپر کیا اور رباب بھی بے یقینی سے دیکھ کر رہ گئی۔

"تو رکی خبر ادم غلا" (پھوپھی مان گئی کیا)۔ دل خوش امیدی سے بے اختیار دھڑک اٹھا، نصیر نے گہری سانس کھینچتے رخ موڑ لیا۔

"وا اوس زمہ خواہش دے۔ (ابھی یہ ہماری خواہش ہے)۔ انسان اپنی سرتوڑ کوشش دلوں کو موم کرنے کی حد تک تو کر سکتا ہے، نصیب سے لڑنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، میں بھی کوشش کر رہا ہوں رباب، اللہ سے دعا ہے کہ اس نے تمہیں میرا نصیب بنایا ہو، باقی پیچھے ہٹنے، ہار ماننے کی غلطی میں نہیں کروں گا تم جانتی ہو۔"

"لیکن ہم دیکھ چکے ہیں خان۔ پھوپھی اور پھوپھا دونوں راضی نہیں، دونوں کی مرضی جبار چاچا کی طرف ہے، اور وہاں بغیر کسی رکاوٹ کے دونوں رشتے ہو سکتے ہیں، پھر وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ۔"

"بس اے کا (بس کرو)۔" نصیر کا چہرا سرخ ہونے لگا۔ "یہ سب کی سب رکاوٹیں بیچ بیچ آسمان کو چھوتی دیواریں تھیں۔

"سنا ہے ہمارے دادا، پڑدادا اپنی بھیڑ بکریاں خود چرایا کرتے تھے، ریوڑ کو ہانکنے والے انسانوں کو بھی اپنی لاٹھی کی زد میں لے آئے۔ اولاد کو بھی تول تول کر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔"

"لیکن خود بھی تو ایسی زندگی جی ہے ان سب نے۔" رباب کا کہنا بھی بجا تھا۔ آخر ان کے ماں باپ، چاچے ماے وہ بھی تو ان ہی رسموں کی بھینٹ چڑھے ہوں گے، جانے کیسی جذبات سے عاری زندگی جی کر یہاں تک پہنچے تھے، کیا خبر کتنی امنگوں کتنی خواہشوں کا گلا خود ان کے بڑوں کے ہاتھوں ان کا بھی گھونٹا گیا ہوگا۔

"تب تو ضرور احساس ہونا چاہیے۔" نصیر ذرا قائل نہیں ہوا۔ "جو خود پر جھیل چکا ہو یا تو اپنی مار سے سبق لیتا ہے یا دوسروں سے اس کا انتقام۔ تو بتاؤ اولاد کیا انتقام کے لیے پیدا کی جاتی ہے۔"

"تم بہت گھبرا لے رہے ہو نصیر!" وہ خفا خفا سی مڑ گئی۔ "یہ پڑھے لکھوں جیسی باتیں ہیں، جو تم ہی کر سکتے ہو، ہمارے ماں باپ ناک کی سیدھ میں چلنے والے معصوم لوگ تھے، ایسی عقل سمجھ کی باتیں پڑھ لکھ کر آتی ہیں۔۔۔ اتنی تو رعایت دو۔"

"رعایت دینے کو تیار ہوں لیکن روایت کی بھینٹ بھی نہیں چڑھوں گا، آج میں یہ قربانی دوں گا کل میرے بچوں سے مانگی جائے گی اور وجہ؟" وہ ہاتھ لہرا کر بات کرتے جوش سے پلٹا۔ "وجہ صرف اتنی کہ ہمارے آباؤ اجداد نے بنا سوچے، بغیر کسی عقلی دلیل کے، بنا انسانی جذبات و احساسات کی پروا کیے ایک نہایت بھونڈی رسم بنا ڈالی اور قیامت تک ہمیں ان ہی نشانیوں پہ قدم جما جما کر چلتے جانا ہے۔"

"ہمارے مسئلے کچھ اور بھی تو ہیں نصیر!" رباب جھنجلا اٹھی۔ اب وہ کیسے سمجھاتی اس سرپھرے کو۔ بات صرف بدلی (وٹے سٹے) کی کہاں تھی، بات تو گلشن پھوپھی کی پسند ناپسند کی بھی تھی۔

"تم مجھے بھی سمجھ نہیں سکتیں رباب! بلکہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔"

وہ یک لخت سنجیدہ ہوا اور کچھ ایسے کہ گمبھیر لہجے میں ایک دم ہی بات سمیٹتے باہر بھی نکل گیا۔

رباب منہ کھولے تعجب سے اس کی پشت کو تک رہی تھی۔ آخر وہ کیا سمجھانا چاہتا تھا اور وہ کیا نہیں سمجھ رہی تھی۔ عجیب تھا یہ نصیر بھی، پڑھا لکھا ہونے کا یہ مطلب ہے یعنی اگلے کو گھما ہی ڈالو اور...... اور یہ چلا کہاں گیا، یا خدایا، پھر خفا ہو گیا، اب وہ اسے منانے کی کہاں۔

رباب گھبرا کر فوراً باہر نکلی، ذہن میں یہ خدشہ لیے کہ وہ گھر سے بھی چلا گیا ہوگا لیکن یہ دیکھ کر رباب نے اطمینان بھری گہری سانس لی۔ وہ تو کچن میں چوکی رکھے اماں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ رباب نے پیشانی پہ ہاتھ مارا تو اس نے دیکھ لیا۔ ہنستے ہوئے اپنی چائے کا کپ اور حلوے کی پلیٹ اٹھائے باہر نکل آیا۔

"منانے آرہی تھیں۔ ہاں؟" یہ اس کے پوچھنے کا مخصوص انداز تھا، رباب نے ہنس کر منہ پھیر لیا۔

"میں کیوں منانے لگی۔"

"بے ادب جو ٹھہریں، نالائق۔" وہ ہنستے ہوئے حلوے کا چمچ منہ میں ڈالنے لگا جب سامنے گلی والے دروازے پہ ہلکا سا کھٹکا ہوا، رباب دو قدموں میں ہی فوراً کمرے میں غائب ہوئی، اور نصیر چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا وہ بھی یوں کہ رخ کچن کی طرف تھا۔ دروازہ کھلنے پر واضح اندر داخل ہوا تو نصیر برآمدے میں اکیلا بیٹھا نظر آیا۔ دونوں میں مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا اور قریب آنے پر واضح گرم جوشی سے نصیر سے بغل گیر ہو گیا۔

"شکر ہے خان! تیری صورت بھی دیکھی، تو رب کا ہی ہو گیا۔"

"اچھا اور تو اس بیچ کوئٹہ سے کب آیا بھلا؟"

"آیا تھا یار۔ اماں کی طبیعت اچھی نہیں تھی بھی کوئی دس دن پہلے چکر لگا تھا۔ تم سناؤ، جاب کیسی

www.pklibrary.com

جاری ہے۔“

واسع کندھا تھپک کر اسے واپس کرسی پہ بٹھاتے ہوئے خود چارپائی پر ٹک گیا

”فرسٹ کلاس۔ جاب تو مرضی کی ہے اور کام بھی آسان ہے، بس رہائش کے معاملات نے کچھ دن پریشان رکھا۔“

”پھر ہوا مسئلہ حل؟“ واسع نے اماں سے چائے کا کپ لیا، وہ خود بھی ان دونوں کے قریب بیٹھ گئیں۔

”ہاں، جبار ماما کا ایک دوست ہے اس نے کمرے کا بندوبست کر دیا ہے، ان کا جاننے والا ایک بزرگ جوڑا ہے۔ بیٹے سب باہر سیٹل ہیں وہ دونوں اکیلے رہتے ہیں۔ بس ان ہی کے ہاں کرائے پر رہتا ہوں، اب بہت مزے میں ہوں۔“

”کب تک رکو گے؟“

”پیر کی صبح واپسی ہے۔ ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔“

”اچھا واہ، میں بھی منڈے کو جا رہا ہوں، آئندہ اکٹھے پروگرام نہ بنا لیا کریں، ملاقات ہی ہو جایا کرے گی۔“

واسع کو واقعی بہت خوشی ہو رہی تھی، نصیر کی نئی جاب لگی تھی۔ اس کی خوشی تو بہرحال تھی لیکن ملنا ملانا اب پردیسیوں جیسا ہو جائے گا۔ یہ بات البتہ دکھی کر رہی تھی۔ بچپن، لڑکپن پھر جوانی کے بے شمار دن ان ہی پہاڑوں، میدانوں اور باغوں میں کھیلتے گزار دیے تھے۔ لیکن یہ رزق کی تلاش کیسے انہیں جدا کر دیتی ہے۔

”ایم بی بی ایس ختم نہیں ہونے والی تھی؟“ نصیر کو یاد آیا، اسے رباب نے ہی بتایا تھا کہ لڑکی کی پڑھائی اب کچھ دن کی باقی رہ گئی ہے۔

”ہاں۔ تقریباً ختم ہی سمجھو، بس ہاؤس جاب باقی ہے۔“

”تو کہاں؟“

”ان شاء اللہ یہیں پر کروں گا۔“

”بہت اچھی بات ہے۔ ہمارا پڑھنا لکھنا سب سے پہلے ہماری مٹی کے کام آنا چاہیے۔ یہی اپنے وطن، اپنے دیس کا حق ہے۔“

”دعا کرو ہر حق دار کو اس کا حق دلا سکوں، ساری محنت اسی لیے کی ہے۔“

واسع کی آواز کچھ دھیمی سی تھی۔ نصیر نے چونک کر دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا۔

”نہ صرف اوروں کو بلکہ اپنے حق کی حفاظت بھی اب تمہاری ذمہ داری ہے، بے خوف ہو کر لڑو، اللہ سچ کے ساتھ ہے۔ وہ تمہیں کامیاب فرمائے۔“

نصیر بنا لگی لپٹی کے ہمیشہ کھری بات کرتا تھا۔ جمیلہ نے بے ساختہ آمین کہا اور واسع نے دل سے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ ایسے ساتھ دینے والے مخلص دوستوں کو اس کی ہمت اور حوصلے کی خاطر بڑھاتا رہے اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی رباب کا دل محبت کا مان دینے والے کے لیے کچھ اور شاد اور سرشار ہو گیا۔

☆☆☆

جان نازنین نازنین
قربان سر اندیش۔۔
حسن تا دی شیرینی
بیا دوراروشن۔۔
جان نازنین......نازنین۔۔

نازیہ اقبال کی آواز میں پشتو چینل پر بجتے گانے کو وہ رک کر آواز اونچی کر کے ہمیشہ کی طرح آج بھی گنگنا کر دہرا رہی تھی۔

”جان نازنین۔“ کی تکرار نے نرم گلابی لبوں پر شرمیلی مسکان بکھیر رکھی تھی۔ دیوار پر لگے چھوٹے گول آئینے میں اس کا عکس بالکل اس کے سامنے تھا لیکن کالی کالی آنکھیں خود اپنا سامنا کرنے سے بھی کترا رہی تھیں۔

گھر کے کاموں سے فرصت پا کر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور فوراً ہی ٹی وی آن کر لیا تھا۔ چہرے پر ابھی تک پانی کی نمی تھی۔ سیدھی مانگ کے ساتھ دائیں بائیں گردن تک آتی بھیگی لٹیں بھی پیشانی اور کنپٹی سے چپکی چہرے کے سحر میں مزید اضافے کا باعث بن رہی تھیں۔ مسکرانے پر نرم گلابی

لب، چھوٹی پتلی ناک کے نتھنے یاقوت سے ہم رنگ ہونے لگے۔ لمبی نازک گردن سے بوندیں صاف کرتے اُس نے نظریں اسکرین پر جمائیں۔

شاید کبھی اس کی زندگی میں بھی کوئی "جان نازنین" کہنے والا آئے گا۔ لطیف رومانوی جذبات کی یہی انتہائی سوچ تھی، وہ معصوم کبھی اپنی سوچوں کو اپنی مٹھی سے پھسلنے نہ دیتی، بس یہ دل پہ سحر پھونکتا میوزک اور بالخصوص یہ نازنین کی پکار۔

"تم سچ مچ نازنین ہو، کسی شاعر کے خوابوں سی حسین، خیالوں سے تراشی ہوئی، معصومیت میں گندھی، محبوب کے ہونٹوں سے بانسری کے سُر سے نکلتی۔ نازنین۔" کانوں میں کسی ان دیکھے کی انجانی سی آواز ٹکرانے لگی۔ اُس نے گھبرا کر چینل تبدیل کیا اور......

"اوہ۔ دروازہ شاید کافی دیر سے بج رہا تھا، گانے کی آواز میں سنائی نہیں دیا۔" وہ ریموٹ پھینک کر تیزی سے بھاگی۔

"کون؟"

"اے کُڑی (اے لڑکی)۔ خالہ ہوں۔" خالہ ارشادے کی آواز پر دانتوں میں شرمندگی سے لب دباتے اُس نے فوراً کنڈی کھولی، پتا نہیں بے چاری کب سے دروازہ بجا رہی تھیں۔

"سلام خالہ!" نازنین نے اندر داخل ہوتے پر خالہ سے مصافحہ کیا پھر ہاتھ بڑھا کر سر سے برقع اتارنے میں مدد دی۔

"معاف کرنا خالہ! ٹی وی کی اونچی آواز میں سنائی نہیں دیا۔"

"کوئی بات نہیں، ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی، بابا گھر پہ ہے تیرا؟" انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ہی جان لینا چاہا۔

"نہیں۔ بابا تو شام کو آتے ہیں۔" نازنین نے برآمدے کی چارپائی بچھا کر سرہانہ درست کر کے رکھا۔ ارشادے خالہ بھی برقع اترنے پر اب دوپٹہ پھیلا کر درست کرتے چارپائی پر تسلی اور آرام سے بیٹھ گئیں۔ گھر سے نکلتے وقت وہ یہی چاہ رہی تھیں کہ نازنین گھر پر اکیلی ہو، اس کے باپ کی موجودگی میں کچھ بھی پوچھنا مشکل تھا۔

"چائے بناؤں خالہ؟" نازنین پانی کا گلاس بھر کر لائی تھی، سوچوں میں گم ارشادے نے چونک کر سر اٹھایا پھر نفی میں سر ہلاتے پانی کا گلاس تھام لیا۔

"نہیں، چائے ابھی تیری بھابی نے بنا کر دی تھی، تُو بیٹھ۔" انہوں نے چارپائی پہ ہاتھ مار کر نازنین کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بہن کا حال سنا، فون آتا رہتا ہے؟"

"جی خالہ! بات ہوتی رہتی ہے، باجی ٹھیک ہیں بالکل۔" نازنین بھی ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"آنا کب ہے اُس نے؟" ارشادے نے اندر کا تجسس دبا کر لہجہ معمول کا رکھا۔

"معلوم نہیں خالہ! ابھی پچھلے مہینے آئی تھی، پھر اتنی جلدی تو نہیں آئیں۔"

"اور بابا تیرا گھر کس وقت آتا ہے؟ آج کل تو سارا دن باہر رہتا ہے۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری چھپی تھی، نازنین نے دھیان نہیں دیا۔

"جی شام کو آجاتے ہیں، اکثر عشاء پڑھ کر آتے ہیں۔"

"تب تک اکیلی رہتی ہے؟" ارشادے کو آج شاید اس کے بابا کی ہر حرکت بری لگ رہی تھی۔ نازنین ان کے سوالات پہ حیرت دباتے عام انداز میں جواب دیتی گئی۔

"بس کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی ہوں، وقت گزر جاتا ہے، پھر ٹی وی بھی ہے۔"

"کوئی...... عورتیں آئی تھیں گھر پہ؟" ان کا لہجہ کچھ سرگوشیانہ سا ہو گیا، نازنین چونکی۔

"عورتیں، جی نہیں۔ کس نے آنا تھا؟"

"یونہی، کسی سے سنا تھا۔" انہوں نے ٹالا۔

"شاید آگے ایک دو دنوں کے دوران آئیں، تم ایک کام کرنا نازنین۔" انہوں نے کچھ سوچ کر نازنین کا ہاتھ پکڑا۔ وہ تعجب سے خالہ ارشادے کو دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں آج خالہ کا انداز اتنا مشکوک سا کیوں

تھے۔ پہلے تو آتے ساتھ ہی بہوؤں کے گلے شکوے لے بیٹھتی تھیں، جیسے دل کی بھڑاس نکالنے کو بندہ کسی خاموش طبع، بے ضرر کا انتخاب کرے، وہ بھی چپ چاپ انہیں سنتی اور مسکراتی رہتی تھی۔

"جی خالہ! بتائیں۔"

"اگر گھر پر کوئی مہمان عورتیں آئیں، تو ان کے جانے کے بعد مجھے پیغام ضرور بھجوا دینا، اپنی عروبہ تو روز پڑھنے آتی ہے ناں، اسی سے کہہ بھیجنا۔"

"سب خیریت تو ہے ناں خالہ!" نازنین کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خالہ کہنا کیا چاہتی ہیں۔

"ارے سب خیریت ہے، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے نازنین کا پریشان اُترا چہرا دیکھ کر ہاتھ پہ چپکی دی۔ "تیری ماں جیسی ہوں ناں، تسلی رکھ، سب ٹھیک کردوں گی۔ بس تم مجھے پیغام ضرور بھجوا دینا، پھر تجھے بھی تفصیل بتاؤں گی۔ چل اب دروازہ بند کرلے، چلتی ہوں۔"

وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں، برقع سر پر جماتے باہر کی راہ لی۔ نازنین نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا اور خالہ کے جانے کے بعد کنڈی لگادی۔

خالہ ارشادے کا گھر ان کے گھر سے بس تیسرا ہی تھا۔ نازنین کی امی گل نسیم بہت ہی خوش اخلاق اور رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔ دلہن بن کر اس محلے میں آئیں اور چھبیس ستائیس سال یہیں گزار دیے۔ آس پڑوس میں تقریباً سب ہی سے جان پہچان اور گہری دوستیاں تھیں۔ ارشادے خالہ بھی ان ہی کی سہیلیوں میں سے ایک تھی۔

ایک سال پہلے معدے کے کینسر کی وجہ سے نازنین کی امی کی وفات ہوئی تو وہ سب اس کا پہلے سے بھی بڑھ کر خیال رکھنے لگیں۔ نازنین نے مقامی کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا، پھر امی کی وفات ہوگئی تو سارا گھر سنبھالنا پڑ گیا۔ اب اس نے تیرھویں کی [illegible] ٹیوشن شروع کردی تھی کیونکہ ریگولر آنا جانا اب [illegible] ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بابا بھی کچھ عرصہ [illegible] سے بالکل ہی لاپروا ہو گئے تھے۔

اماں کی وفات کے بعد جتنا اسے باپ کے سہارے، اس کی سپورٹ کی زیادہ شدت سے ضرورت تھی اتنا ہی نازنین کو ان کی دوری کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے وہ دن کا سارا وقت گھر پہ گزار کو پچھلے پہر چند گھنٹوں کے لیے دوستوں کی طرف جاتے اور مغرب کے بعد گھر پر ہی رہتے لیکن اب پچھلے چند مہینوں کے دوران ان کی روٹین بالکل ہی تبدیل ہوگئی تھی۔

نازنین فطرتاً لاپرواسی تھی۔ پھر باپ سے ادب اور جھجک کا رشتہ تھا، اسے کبھی کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی، اماں سے بھی اس کے بابا کا غصے اور رعب داب کا رویہ رہا تھا۔ وہ دونوں بیٹیاں دبے سہمے ماحول میں پروان چڑھیں۔ اس لیے کبھی باپ سے کھل مل نہ سکیں۔

نازنین نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے سہ پہر میں محلے کی بچیوں کو ٹیوشن دینا شروع کردیا۔ ارشادے خالہ کی پوتی عروبہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ نازنین نے کمرے میں واپس آ کر بس کچھ دیر ہی خالہ کی باتوں کو سوچا پھر سر جھٹک کر دوبارہ سے کاموں میں خود کو مصروف کرلیا۔ تجسس میں پڑنا اس کی طبیعت میں شامل ہی نہ تھا۔ کون کیا کرتا ہے اسے کبھی کھوج رہی تھی نہ پروا۔ وہ بس اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔

☆☆☆

جمعہ کی وہ سہ پہر بھی خوب گہرے بادلوں سے بھری ہوئی تھی۔ واسع ایک کتاب پڑھتے پڑھتے بیٹھک والے پچھلے کمرے میں سو گیا تھا، اب جو سو کر اٹھا تو لگا شام ہو چکی ہے، آنکھیں ملتے تعجب سے باہر نکلا اور لب بے اختیار مسکرا دیے، شام نہیں وہ گہرے دبیز بادلوں کی چادر تھی جس نے جاتے سورج کا چہرا ڈھک دیا تھا۔

گردن موڑ کر واسع نے گھڑی کی طرف دیکھا، پانچ بجنے والے تھے۔ اس نے باہر نکل کر نل پر ہاتھ پاؤں اور چہرا دھویا اور لمبی راہداری سے گزر کے سامنے کے برآمدے میں آ گیا۔ اماں برآمدے میں بچھی چارپائی پر لیٹی تھیں اور رباب حسب عادت کسی ڈائجسٹ میں سر دیے بیٹھی تھی۔

"چائے بنا دو رباب!" وہ سستی سے سامنے کی

چارپائی پر پھر سے لیٹ گیا۔ نیند پوری کر لینے کے بعد بھی مکمل بیداری میں اسے خاصا وقت لگ جاتا اور یہ عیاشی بھی بس اپنے گھر میں ہی ہو پاتی۔ کوئٹہ میں تو واشی خود کو جیسے تیسے دھکا دے کر بھگاتے رہنا۔

"سو گئے تھے؟" جمیلہ خود بھی نیند پوری کر چکی تھیں۔ واسع آیا تو اٹھ بیٹھیں۔

"ہاں، پڑھتے پڑھتے نیند آ گئی تھی۔"

"اس بار تو گھر سے نکلے ہی نہیں، تھکاوٹ بہت ہے کیا؟ کسی سے ملنے بھی نہیں گئے۔"

پچھلی شام جب سے واسع گھر آیا تھا، وہی صبح کے وقت باری کو کسی استاد کے پاس بٹھا کر آنے کے بعد کہیں نہیں گیا تھا۔

"دادی خفا ہو رہی تھیں لالہ! ابھی میں گئی تو ناراض بیٹھی تھیں۔" رباب بھی دادی کا شکوہ پیغام کے انداز میں اٹھائے پھر رہی تھی۔ واسع مسکرا دیا۔

"تم چائے پلواؤ، بس پہلے دادی کی طرف جاتا ہوں، چاچی نسیم اور سیف لالہ سے ملتا ہوں، عبدالرحمٰن چاچا سے مسجد میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"دادی کو ساتھ لیتے آنا، تین دن سے اُدھر ہے، تمہارے آنے پر واپس آنے کا کہہ گئی تھیں۔"

"اچھا، پھر تو پچھلی شام گھر پر ہوتیں۔" واسع کو حیرت ہوئی۔

"ہاں، شام کو آنا تھا لیکن بخار ہو گیا تو وہیں لیٹی رہ گئیں۔"

"ارے تو پہلے بتانا تھا۔ بیچ کا تو دروازہ ہے، اٹھا کر لے آتا۔" واسع نے کچھ ایسے بے ساختہ کہا کہ رباب اور جمیلہ دونوں کو ہنسی آ گئی۔

"بیچ کا دروازہ تو ہے لیکن وہ میری تمہاری طرح آنا جانا کہاں کرتی ہیں، بوڑھی ہیں بے چاری، یہاں سے وہاں تک بھی پورے اہتمام سے جاتی ہیں۔"

"دادی کے لیے میں ایک ڈولی بنواتا ہوں۔ وہ جیسے اگلے وقتوں کی شہزادیاں پالکی میں شہر گھوما کرتی تھیں ناں۔۔۔ دادی بھی سارا دن بیٹوں کے گھروں میں جھانکتی پھریں گی۔" واسع اب پورے موڈ میں آ گیا تھا۔ جمیلہ تصور کر کے ہنستی چلی گئیں۔

"تو کہار کہاں سے لاؤ گے لالہ!" رباب کچن کے دروازے سے مڑی۔

"کہاروں کی کمی ہے کیا، دائیں بائیں سے ہی جمع ہو جائیں گے، میں ہوں، باری ہے، رئیس، اسفند، ذکا، نصیر، سیف لالہ۔"

"بس بس، تم تو چائے پینے سے پہلے ہی چارج ہو گئے۔" رباب ہنستے ہوئے کچن میں گھس گئی۔ نصیر کے تو نام پر ہی اس کا چہرا گلنار ہونے لگتا۔

"اور کسی سے نہیں ملے؟" جمیلہ کی مراد شاید چچاؤں سے تھی۔ واسع لیٹنے سے اٹھ بیٹھا اور تکیہ گود میں پھنسایا۔

"مجیب چاچا سے تو ابھی شام کو ہی مل لوں گا۔ مغرب کے بعد گھر آ جاتے ہیں۔ جبار چاچا کی طرف شاید کل صبح چکر لگے۔"

"اور پھوپھی گلشن؟" جمیلہ نے حیرت سے دہرایا۔

"اوہاں۔" واسع نے زبان دانتوں میں دبائی جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "نصیر تو دعوت دے گیا ہے کہ رات کا کھانا اس کی طرف کھاؤں۔"

"یہ دیکھو بھلکڑ۔۔۔ اور میں سوچ رہی تھی نصیر کی دعوت کروں، نوکری لگنے کے بعد پہلی مرتبہ اب آیا ہے۔"

"ہوں۔" واسع نے سوچنے کے لیے وقت لیا۔ "تو کل دوپہر کی دعوت اپنی طرف رکھ لیتے ہیں۔ میں رات کو جاؤں گا تو اسے کہہ دوں گا۔ دادی بھی یہیں ہوں گی کل دوپہر کا کھانا بنا لینا آپ۔"

"ہاں ٹھیک ہے، بتا رہا تھا پرسوں صبح واپسی ہے۔"

"ہاں میں بھی پرسوں نکلوں گا۔"

"اللہ پاک خیریت سے لے جائے۔" انہوں نے دونوں کو دعا دی اور دور کچن میں ان کی باتیں سنتی رباب کے لب اگلی دوپہر کے خیال سے مسکرا اُٹھے۔

"تمہارے لیے ہر چیز میں اپنے ہاتھوں سے

www.pklibrary.com

بناؤں گی اور......" اُسے ایک دم کچھ خیال آیا۔ "اور پہنوں گی کیا؟" کچھ دیر تک لبوں پہ انگلی بجاتے سوچتی رہی پھر مسکرا دی۔ "تمہارا پسندیدہ کالا سوٹ پہنوں گی۔"

"چائے لاؤنج میں ہے، دادی کو لاتا ہے۔" واسع نے دور سے ہانک لگائی اور رباب ہڑبڑا کر تصورات سے باہر نکلی۔

"میں بھی پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہوں۔" وہ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے چائے کپوں میں ڈالنے لگی۔

☆☆☆

عبدالجبار ڈیرے سے گھر آکر گھنٹہ بھر ستاتے، پھر عصر کی اذان ہوتی تو مسجد میں نماز ادا کر کے وہ واپس ڈیرے پہ چلے جاتے لیکن آج عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد گھر آگئے تھے۔ ریحانہ نے چونک کر دیکھا۔

"ذکاء اللہ گھر پہ ہے؟" انہوں نے ریحانہ کی حیرت کو نظر انداز کرتے سوال پوچھا۔ مسجد جاتے وقت انہوں نے ذکا کو گھر میں ہی دیکھا تھا

"جی، اپنے کمرے میں ہے۔" وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھیں۔

"اسے میرے کمرے میں بھیجو، آج سہ پہر کی چائے گھر پہ پئیں گے۔"

"جی۔ میں بناتی ہوں، آپ اپنے کمرے میں بیٹھیں۔" وہ جلدی سے ذکا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"آؤ ذکا! بیٹھو۔" انہوں نے بغور بیٹے کا چہرہ دیکھا جو اس وقت بھی انہیں صبح جیسا ہی الجھا ہوا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ تب مردانہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں وہ ڈھنگ سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ تب ہی ذکا کو آرام کا مشورہ دے کر گھر بھیج دیا تھا۔ البتہ اس کی الجھن کو تب سے دل میں کانٹے جیسا اٹکا محسوس کر رہے تھے۔

"بیٹھو اور اب مجھے آرام سے سمجھاؤ۔"

"میں واسع کے متعلق بات کر رہا تھا۔" ذکا کا لہجہ مدھم اور محتاط سا تھا، عبدالجبار نے بھنویں سکوڑیں۔

"کیا ہوا واسع کو؟"

"اس کی پڑھائی اب کچھ ہی دنوں میں ختم ہونے والی ہے۔"

"اور تمہیں لگتا ہے، وہ ہمارے لیے خطرہ بن سکتا ہے؟"

"اور آپ کو ایسا کیوں نہیں لگتا؟" ذکاء کو باپ کے تحمل پر حیرت تھی۔ "اس کی وکالت کے پیچھے مجھے تو ہمیشہ سے ایک ہی مقصد نظر آتا ہے، آٹھویں نویں تک انجینئر تک کے خواب دیکھنے والا اچانک وکالت کی طرف کیسے نکل گیا۔" ذکاء آج پہلی مرتبہ از حد سنجیدہ تھا۔

"یار! بچپن میں تو یہ ڈاکٹری انجینئری کی باتیں سب ہی بچے کرتے ہیں، قابلیت تو عملی زندگی میں سامنے آتی ہے اور واسع کو نہیں لگتا ہوگا کہ......"

"وہ ایک بہت ہی شارپ اسٹوڈنٹ رہا ہے، مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔" ذکاء نے جیسے ایک ایک لفظ کو چبایا۔ "اور آج یاد رکھیں میری بات کو اگر اس کی وکالت کا واقعی کوئی مقصد تھا تو عنقریب میں اور آپ بڑی مشکل میں پھنسنے والے ہیں اور یہ بھی یاد رکھیں کہ میں اپنے باغ کا ایک انچ حصہ بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔"

"کیسے جانے دے سکتے ہیں۔" عبدالجبار بھی پہلی مرتبہ سنجیدہ ہوئے۔ "یہ آج کل کی اولادیں تو یوں ہی نادانی میں جوش دکھانے لگ جاتی ہیں، ورنہ یہ حقیقت کوئی جھٹلانے والی ہے کہ حبیب اللہ نے اپنی زندگی میں مجھ سے کتنا روپیہ ادھار لیا، اللے تللے مجھ سے مانگ کر پورے کرتا رہا۔ جائز ویران باغ کو کس کی محنت نے کھڑا کیا۔ ارے جتنی رقم حبیب اللہ پر میں نے خرچ کی ہے، باغ چھوڑ دان کے تو گھر پر بھی آج میرا حق بنتا ہے۔" عبدالجبار بولنے پر آئے تو جوشِ جذبات سے باز رکھنے والے کا اپنا چہرہ اتمتا رہا تھا۔ ذکا نے اس پورے دورانیے میں پہلا سکون کا سانس لیا۔

اسے اپنے بابا کا یہ ساتھ ہی تو چاہیے تھا۔

"صحیح کہتے ہیں بابا، بھلے کاغذوں میں نہ ہو لیکن حق تو صرف ہمارا ہی بنتا ہے۔ ہاں لیکن......" ذکا کچھ سوچ کر رکا، تان ایک مرتبہ پھر وہیں آ کر ٹوٹی جس کی خاطر اس نے بابا سے یہ موضوع چھیڑا تھا اور جو پریشانی پچھلے کئی دنوں سے مسلسل ذکا کی نیندیں اڑائے ہوئے تھی۔ "عدالت تو کاغذ دیکھے گی، اس وکیل کے بچے کو ہم باتوں سے نہیں بہلا سکتے۔"

"کاغذ......" عبدالجبار نے زیر لب دہرایا۔

"کاغذ تو نہیں ہے۔"

"میں بھی تو اسی لیے پریشان ہوں۔"

"ہوں۔" وہ لب چباتے اب گہری سوچ میں غرق ہو گئے تھے۔ "میں سوچتا ہوں کچھ۔ تم ذہن پہ زیادہ زور نہ دو، نکل آئے گا کوئی نہ کوئی حل۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو ذکا بھی فوراً کھڑا ہو گیا۔

"کسی اور سے اس موضوع پر بات مت کہنا، بعد میں بات کرتے ہیں۔" وہ اسے سمجھا کر باہر نکل گئے اور ذکا نے گہری سنجیدگی سے سر اثبات میں ہلایا۔

☆☆☆

واسع اور نصیر صبح سویرے یونہی چہل قدمی کو نکلے تھے۔ گپ شپ کرتے دریائے ژوب کے کنارے تک چلے گئے۔ ان کے باغات دریا سے زیادہ دور نہ تھے۔ یہاں دریا کا پاٹ چوڑا تھا، پتھروں اور سخت زمین پر پھیلا پھیلا سا دریائے ژوب زیادہ گہرا نہ تھا۔ پیچھے پہاڑ تھے اور اس طرف وسیع پتھریلے میدان جیسا دور دور تک پھیلا ان کا مسلم باغ اور اس کے بیچ سے گزرتا ٹھنڈا میٹھا دریائے ژوب۔

کنارے کنارے چلتے دیر تک دونوں نے بے شمار باتیں کیں۔ پچھلی شام واسع، نصیر کی دعوت پر گلشن پھوپھی کے ہاں مدعو تھا، بھلے سے اس دعوت میں وہ پھوپھی کی عدم دلچسپی کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا لیکن وہ نصیر کا جگری یار تھا اور ان کی دوستی بڑوں کی مصلحت پسندیوں سے کہیں بالا تھی۔

نصیر کے اسے اہمیت دینے اور اپنے گھر کی طرف اس کے جھکاؤ کی اصل وجہ سے تو وہ ناواقف تھا لیکن اپنی ماں کے خیالات سے ضرور واقف تھا۔ اماں کا گلشن پھوپھی کی طرف بدلنی کا ارادہ اس کے اور زمرد کے لیے نہیں بلکہ نصیر اور رباب کے لیے تھا۔ نصیر اور رباب کو ایک کر دینے کی کوشش میں وہ اسے اور زمرد کو بھی زبردستی بندھن میں باندھنا چاہتی تھیں کیونکہ اس خاندان میں جہاں تک ممکن ہو، بنا بدلنی کے رشتے نہ کیے جاتے، لیکن باوجود ماں کی شدید خواہش کے وہ زمرد کو بھی خاص نظر سے نہیں دیکھ پایا۔

البتہ اماں کسی روز خوب دباؤ دے کر اپنی ضد منوا لیتیں تو وہ شاید انکار بھی نہ کرتا لیکن واسع کو اس کی بھی نوبت آتی دکھائی نہیں دیتی تھی کیونکہ گلشن پھوپھی کو مرحوم بھائی کے ان یتیم اور غریب بچوں سے ایسا کوئی لگاؤ نہیں تھا کہ رشتے جوڑنے بیٹھ جاتیں۔ نصیر کی دوستی اور بے لوث محبت البتہ قابل تحسین تھی۔

دونوں دیر تک اپنے اپنے کام، پڑھائی اور گھر خاندان کے متعلق باتیں کرتے اب واپسی کی راہ پر گامزن تھے۔ اور گھروں سے ذرا پہلے جب باغات آ گئے تو دونوں کا رخ خود بخود اس جانب مڑ گیا۔ مجیب چاچا تیز قدموں سے چلتے اپنے ڈیرے کی طرف آ رہے تھے۔ ان سے کھڑے کھڑے ہی سلام دعا ہوئی۔ تھوڑا آگے چل کر جبار چاچا کا ڈیرہ آیا۔ جس سائیڈ پہ وہ دونوں کھڑے تھے یہاں سے سب ہی باغات کی پچھلی سائیڈ تھی اور گھروں کا داخلی رخ تھا۔ باغ کے پچھلے دروازے بنائے ہی گھر والوں کی آمد و رفت کے لیے گئے تھے۔

سامنے رخ پر مردانہ ڈیرے بھی تھے اور پھل لادنے کے لیے گاڑیاں بھی وہیں سے آتیں۔ گھر کی عورتوں کو اسی پچھلے دروازے سے باغ میں جانے اور پیچھے کے حصے تک محدود رہنے کی اجازت تھی۔ یہاں سے گزرتے دونوں کے قدم اپنے آپ تیسرے باغ کی طرف بڑھے جس کے دروازے پر

www.pklibrary.com

ذکاء کھڑا انگوروں کی ٹوکریاں ایک دوسرے میں پھنساتے اندر کی طرف پھینک رہا تھا۔ واسع اور نصیر پر نظر پڑی تو کام چھوڑ کر مسکراتے ہوئے نزدیک آ گیا

"ماشاء اللہ۔ آج تو صبح صبح نصیر بھائی کے دیدار ہو گئے۔" آگے بڑھ کر واسع کے کندھے پہ ایک رسمی سی تھپکی دیتے وہ بڑے جوش کے ساتھ نصیر سے بغلگیر ہوا۔ واسع نرم سی مسکراہٹ دیتے اندر باغ میں دیکھنے لگا۔ یہ اندر دکھائی دیتا منظر اس کی جاگیر اب تو جیسے خوابوں کی جنت سا بن گیا تھا۔ اندر تازہ سبز سیبوں کی پیٹیاں بھری جا رہی تھیں۔ انگور کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ ان دنوں سیب جا رہے تھے اور آنے والے چند مہینوں میں آڑو اور خوبانی تیار ہونے والے تھے۔

یہاں کے سب ہی باغات میں سیب، خوبانی، آڑو اور انگور لگائے جاتے۔ سب سے کامیاب بزنس جبار چاچا کا تھا حالانکہ وہ سب بھائیوں میں چھوٹے تھے لیکن کاروبار میں ان کا دماغ انتہا کا شاطر اور تیز تھا۔ حتیٰ کہ بڑے بھائیوں کو بھی آگے بڑھنے کے مشورے ان ہی کی طرف سے ملتے تھے۔ ذکا کو انہوں نے انٹر کے بعد اپنے ساتھ کام پر لگا لیا تھا۔

واسع کو ذکاء کے کھنچے کھنچے رہنے کی وجہ بھی بھی لگا کرتی۔ اول جماعت سے دونوں ایک ساتھ پڑھتے آ رہے تھے پھر ایف اے کے بعد اس کا آگے ہی آگے بڑھتے جانا اور ذکا کا کام پہ لگ جانا شاید ذکا کی انا پہ چوٹ بن کر پڑا تھا۔ حالانکہ اس معاملے میں بھی واسع کے لیے کوئی کدورت رکھنا جائز تو قطعی نہیں تھا اور یہی بات واسع کی سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ وہ کیوں ہمیشہ اس سے ایک فاصلہ رکھ کے ملتا ہے۔ جبکہ ذکا والے رشتے میں پیدا ہو سکتا تھا وہ

ایسا واسع کا ضمیر اسے اجازت نہ دیتا۔

"کل ہی پہنچا ہوں، جبار چاچا سے ڈیرے پہ ملاقات ہوئی تھی۔ تم شاید گھر پہ تھے۔"

"اچھا ابھی تو آؤ لالہ! گھر پہ ناشتہ کرتے ہیں۔" وہ ابھی بھی واسع کو مکمل نظر انداز کیے صرف نصیر سے ہم کلام تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ خوب جتاتے ہوئے انداز میں شاید جان بوجھ کر واسع سے ایسا رویہ روا رکھے ہوئے ہے۔

نصیر نے نہ صرف اس بات کو نوٹس کیا بلکہ انتہائی ناگواری بھی محسوس کی، ذکا کا ایسی بچوں جیسی بچکانہ حرکتیں کرنا انتہائی نازیبا حرکت لگی۔ اس نے ایک چبھتی نظر ذکا پر ڈالتے واسع کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"نہیں شکریہ۔ واسع کو گھر لے جا رہا ہوں، اب تو یہ بھی مہمان ہو گیا ہے ناں، ہم دونوں مل کر ناشتہ کریں گے، میرے گھر۔ چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔"

"او نہیں۔ میں ناشتہ کر کے نکلا تھا۔" ذکا بری طرح خفت زدہ ہوا نصیر کے صاف انکار پر اسے جواب بھی نہیں سوجھا۔ سر ہلا کر فوراً ہی باقی کی ٹوکریاں اٹھانے لگ گیا۔ واسع نے ایک خفا خفا سی خاموش نظر نصیر پر ڈالی جس نے مسکرا کر واسع کا بازو کھینچا۔

"آؤ ناں، اماں کے ہاتھ کا ناشتہ کرتے ہیں۔" وہ پیار بھری دھونس جماتے صرف اپنی کہنے اور منوانے کے موڈ میں تھا۔ واسع تاسف سے سر ہلاتے مسکرا کر کھنچا چلا گیا۔ دل کی بات بھی دل میں ہی رہ گئی، ورنہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کی محبت میں وہ اپنے تعلقات کسی سے نہ بگاڑا کرے۔

اُڑتی اُڑتی کچھ واسع نے بھی سن رکھی تھی کہ گلشن پھوپھی جبار چاچا کی طرف بدگئی کا ارادہ رکھتی ہیں۔ لیکن نصیر کے ذکا سے ایسے رویے کا اُن رشتوں

رباب سے نصیر کی محبت ابھی بھی ایسا چھپا راز تھا جو واسع پر آشکار نہیں ہو پایا تھا۔ وہ اپنی اماں کی اس معاملے میں دلچسپی کو نصیر کی اچھی عادات کے تناظر میں دیکھتا تھا۔ اس کی اماں نصیر کو پسند کرتی تھیں بس یہی ایک وجہ ہی ہمیشہ سمجھ میں آئی۔ نہ واسع کو گھریلو سیاست میں بھی کوئی دلچسپی رہی تھی نہ وہ آگے اس کی کھوج کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔

☆☆☆

شمیم جان اس وقت تندور جلانے کی تیاری کر رہی تھیں، پشمینہ برآمدے میں منزہ کو لیے پڑھا رہی تھی۔ سیف آج جلدی گھر آ گیا تھا۔ عبدالرحمن ابھی باغ میں ہی تھے۔ یہاں کے باغات میں اگرچہ سب سے بڑا باغ اور سب سے بڑا ڈیرہ عبدالجبار کا ہی تھا لیکن عبدالرحمن کے باغ میں بھی چھوٹی سی مردانہ بیٹھک موجود تھی۔ یہاں کے سب ہی مرد گھر میں کم اور ڈیروں پر زیادہ رہا کرتے تھے۔ باغات ہوں یا نہیں مردانہ بیٹھک سب کے ہاں ضروری تھی۔ نغمہ چھوٹی معیزہ کے ساتھ کمرے میں تھی۔ سیف شاید کسی کام سے گھر آیا تھا۔ معلوم نہیں نغمہ سے کیا بات ہوئی کہ رفتہ رفتہ کمرے میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔ شمیم جان نے کام چھوڑ کر ہتھیلی ماتھے پہ دے ماری۔

"وئی کم بختا۔ کبھی میٹھا نہیں بول سکتا۔" اور یہ عقل کی پوری بھی خدا خبر کیا کہہ بیٹھی تھی۔ ادے مینے۔ تاورتہ او گورا (دیکھو تو ذرا)۔" ہاتھ سے نغمہ کے کمرے کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ تو بلند ہوتی آوازوں سے پہلے ہی چڑی بیٹھی تھی، منزہ کی کتاب بند کرتے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا۔

"ما توبہ دا۔ (میری توبہ)۔" پشمینہ نے ہاتھ جوڑ کر اجازت چاہی۔ "میں تو جمیلہ چاچی کے گھر جا رہی ہوں، رباب سے گپ شپ نہ لگا لوں، چل منزہ۔"

وہ دوپٹہ سر پر ڈالتے ہوئے صحن کے آخری کونے کی طرف بڑھ گئی۔ ان کے گھر کی بائیں ہاتھ کی دیوار کا دروازہ چاچا حبیب اللہ کے گھر میں کھلتا تھا۔ اوپر سے چھتیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ چاچا حبیب اللہ کے فوراً بعد چاچا مجیب اللہ کا گھر تھا اور ان کے گھر میں دروازہ چاچا حبیب اللہ کے گھر سے کھلتا تھا۔ رباب اور پشمینہ تقریباً ہم عمر تھیں، دونوں کی بہت اچھی دوستی تھی۔

وہ منزہ کا ہاتھ تھامے چاچا کے گھر میں داخل ہوئی۔ صحن سے برآمدے میں داخل ہوتے ہی پہلا کمرا وہ تھا جسے بیٹھک یا مردانے کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس کے بعد پرانے طرز کی راہداری تھی جس کے دائیں بائیں دو کمرے تھے یہاں سے نکلنے پر پیچھے کا برآمدہ اور بڑا صحن آ جاتے۔ باہر جاتی گلی کا اصل دروازہ اس صحن میں تھا۔ گھر والے دن کا زیادہ وقت یہیں گزارتے، کچن بھی اسی برآمدے کے ایک کونے میں تھا۔ رباب کا کمرا بھی اور چاچا چاچی کے کمرے بھی یہیں تھے۔ چھت کو جاتی سیڑھیاں بھی اسی صحن کے ایک کونے میں بنی تھیں۔

یوں تو راہداری کے دو کمروں میں سے ایک واسع اور باری کا تھا اور سامنے والا بھی نازیہ اور جبین کا ہوا کرتا تھا لیکن ان کی شادی کے بعد مہمان خانے کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ پیچھے کے اکلوتے بیٹھک والے کمرے کو آج کل واسع نے پڑھائی کی خاطر سیٹ کر رکھا تھا۔ یہاں اکیلے میں زیادہ سکون سے پڑھائی کی جا سکتی تھی۔ اسی صحن کے دوسرے کونے میں مجیب اللہ چاچا کے گھر کو دروازہ جاتا تھا۔

پشمینہ نے صحن میں داخل ہو کر پیچھے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اور واپس مڑی تو دل دھک سے رہ گیا۔ منزہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی اور سامنے مجیب چاچا کے دروازے سے رئیس اندر داخل ہو رہا تھا اور یہ حقیقتاً ایک عجیب اتفاق تھا، بظاہر اپنے گھر سے تیسرا دروازہ ہونے کے باوجود غالباً چھ برسوں سے آنا جانا بالکل بند تھا، گھر والوں کا آمنا سامنا بھی بیاہ شادیوں یا تقریبات میں ہی ہوتا اور رئیس سے پشمینہ کی ملاقات کو شاید مہینوں بیت چکے تھے۔ اور اس بے حس

www.pklibrary.com

کچھ یاد تھا کہ نہیں پشمینہ تو حساب انگلیوں پر رکھا کرتی تھی۔

آخری مرتبہ جبار چاچا کے باغ میں اچانک وہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ جب بھی وہ بھاگ گئی تھی اور آج بھی اسی ارادے سے فوراً اٹھی، مگر ریئس اس کا ارادہ بھانپتے بے ساختہ ہی پکار بیٹھا اور......

"مینو" کی نرم پکار نے آج برسوں بعد پشمینہ کا دل مٹھی میں کیا تھا۔ اس کی پلکیں آپس میں تیزی سے بھینچ گئیں۔ اسے اس نام سے صرف ریئس ہی بلاتا تھا اور شاید ان دونوں کے علاوہ کسی کو اس نام کا پتا بھی نہیں تھا۔ پشمینہ اس کی بات نہیں سننا چاہتی تھی، پھر کسی کے آجانے کا ڈر بھی تھا لیکن قدم تھے کہ اٹھنے سے انکاری ہو گئے۔

"بات بھی کرنا چھوڑ دی ہے۔"

وہ اپنے ٹھہرے دھیمے لہجے میں یوں مخاطب تھا جیسے بیچ میں چھ برس آئے ہی نہ ہوں۔ معلوم نہیں کب سے ایسے کسی حسین اتفاق کے انتظار میں تھا۔ پشمینہ کہہ نہیں پائی کہ اس نے بات کرنا کب چھوڑی، حالات نے ہی کسی لائق نہیں چھوڑا تھا۔

"تم نے بھی دنیا والا رویہ اپنایا مینو! قصور کسی کا سزا کسی کو۔"

وہ تھکی ہوئی سوچ کھونے کے موڈ میں نہیں لگتا تھا۔ پشمینہ پر بھی آخری جملہ کوڑی سا لگا۔ یہ کیا کہہ دیا تھا ریئس نے۔ وہ بے اختیار پلٹی، سرخی میں ڈھل رہا تھا اور پلکیں نمی سے بوجھل۔ وہ اپنے ریئس کو قصوروار کیسے جان سکتی تھی۔ کبھی بھی نہیں۔

وہ بنا کچھ بھی کہے جلدی سے واپس اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔ اب کسی اور سے بات کرنا ممکن کہاں رہا تھا۔ اسے تو ان چند جملوں کی بازگشت نے ہلا ڈالا تھا۔

ریئس کو اس سے گلے تھے اور گلے بھی ایسے۔ وہ تو اس کی خیر حیات کا منتظر تھا۔ اب سے پہلے کبھی سوچا ہی نہ تھا بے حس، پتھر، روایت پرست سمجھتے وہ کیوں بھول گئی کہ ہمدردی کے لائق تو واقعی ریئس کی ذات بھی تھی۔ اس نے کیا کہا تھا۔

"تم بھی......" اور یہ دو لفظ جیسے چھ برسوں کا نچوڑ تھے۔ وہ بنا آس پاس دیکھے کمرے میں گھس گئی۔ سیف لالہ اور نفیسہ بھابی کی لڑائی یا تو ختم ہو چکی تھی یا لالہ کہیں باہر چلے گئے تھے۔ باہر کے شور سے تنگ آ کر بھاگنے والی اندر کی شورش سے نبرد آزما آج سے شاید ایک نئے امتحان میں پڑ رہی تھی۔

"اُمید کے دیے میں اب ایک بوند بھی تیل نہیں ہے ریئس! مت ڈالو مجھے کسی نئے انتظار میں۔ بھول جانے میں ہی عافیت ہے۔ یاد رکھنا تری اذیت اور یاد دلانا، دہری مصیبت میں پڑنا۔ شکر ہے میں نے تمہیں جواب نہیں دیا، شکر ہے ہمیں کسی نے دیکھا نہیں، شکر ہے میں وہاں رکی نہیں اور ایک آخری شکر کاش میں جلد ہی یہ بھی ادا کر سکوں کہ شکر ہے میرا دل تمہاری محبت سے خالی ہو گیا۔ کاش بہت جلد۔"

پشمینہ نے کرب سے لب چباتے آنکھوں کا پانی پیا، لیکن پلکوں کی باڑھ پر کے موتی بھی کبھی پلٹا کرتے ہیں۔ وہ بھی روئے جا رہی تھی، آج شاید کئی مہینوں بعد......

☆☆☆

"جلدی کرو رباب! وہ دونوں آتے ہی ہوں گے۔"

جمیلہ نے رباب کے حلیے پر نظر ڈالی اور ٹائم دیکھا۔ آج وہ پوری دل جمعی سے خود بھی ماں کے ساتھ کچن میں کسی کام کاج میں لگی تھی۔ بادام کا حلوہ، نمکین اور ابلے چاول اس نے خود بنائے تھے۔ جبکہ جمیلہ نے چکن کڑاہی کے ساتھ تندور کی روٹیاں بھی بنا لیں۔

واسع کچھ دیر پہلے قصیر کو لانے خود ہی نکل گیا۔ رباب نے بھی وقت دیکھتے جلدی سے باتھ روم کا رخ کیا اور بڑا ہی بروقت اندر گئی کیونکہ کچھ ہی دیر میں قصیر گھر کے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"ارے آؤ آؤ قصیر گل۔" جمیلہ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی آگے بڑھیں۔ نظریں البتہ قصیر کی پشت پر بھٹک رہی تھیں کیونکہ وہ اکیلا اندر داخل ہوا

www.pklibrary.com

تھا، واسع ساتھ میں نظر نہیں آ رہا تھا
"سلام مامی!" وہ تھوڑا سا جھکا، جمیلہ نے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیر کر دعا دی۔
"وعلیکم السلام۔ اللہ سکھ صحت سلامت رکھے۔ آجاؤ۔" انہوں نے ہاتھ سے آگے آنے کا اشارہ کیا۔
"واسع نہیں ہے مامی؟"
"ہاں ہاں بچے! اسی کو تو دیکھ رہی ہوں۔" جمیلہ ہنس پڑیں۔ "وہ تو تمہیں لینے گیا تھا۔"
"اچھا۔" نصیر نے فوراً موبائل نکالا۔ "کیا کہہ کر گیا؟"
"کہہ رہا تھا تم سے فون پر بات ہوئی ہے۔ چاچا مجیب اللہ کے ساتھ ڈیرے پر بیٹھے ہو۔"
"ہاں، میں گھنٹہ بھر پہلے تک تو وہیں تھا۔ لیکن بابا کے کچھ مہمان آئے تو گھر چلا گیا۔" وہ بات کرتے واسع کو کال ملا چکا تھا۔
"مہمان حاضر ہیں۔ میزبان غائب۔ ہاں؟" وہ واسع سے بات کرتے اب ہنس رہا تھا۔ جواباً معلوم نہیں اس نے کیا کہا۔ نصیر نے مسکرا کر فون بند کر دیا۔
"ہاں وہیں گیا تھا۔ اب کہہ رہا ہے، باری کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔" وہ مامی کو بتاتے اندر کی طرف بڑھ گیا۔
"بیٹھو نصیر! میں پانی لاتی ہوں۔" مامی اسے بٹھا کر باہر چلی گئیں۔ نصیر کے دل کی دھڑکن چوڑیوں کی کھنک سے بڑھی، دل کو سنبھالتے اس نے ان قیمتی گھڑیوں کو قید کرنے کی ہمت جوڑی، ایک معنی خیز کھنکار گلے سے نکالتے وہ اپنی جگہ سے اٹھا، مامی جی اسے اپنے والے بڑے کمرے میں بٹھا گئی تھیں۔ جس میں سے رباب کے کمرے کا درمیانی دروازہ کھلتا تھا۔ نصیر دروازے کے قریب آیا تو وہ ہلکا سا ہلا، کسی نے ان شناسا قدموں کی چاپ کو پا لیا تھا۔
"سامنے آؤ۔" وہ تحکمانہ کہتے اپنی جگہ ایستادہ ہو گیا۔
ادھر رباب لہجے سے ہی ڈوبنے لگی۔ اپنی ساری تیاری، یہ چوڑیوں کی کھنک سب بری شرمندگی لگے۔ نصیر تو بہت سنجیدہ تھا آج، وہ ہی معلوم نہیں کیوں گزری شام کے اثر سے ابھی تک نہیں نکلی تھی۔ پاگل، جھلی رباب۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستے اُتری صورت کے ساتھ دروازے کی اوٹ سے باہر نکلی۔ کالے سوٹ پر ریشمی انگوری کڑھائی اور ویسا ہی ڈھلکتا ریشمی دوپٹہ۔ وہ پھسلتے آنچل کو سر پر ٹکانے کی کوششوں میں تھی۔ نصیر نے اس کے بھیگے بالوں، چہرے کی شادابی، آنکھوں کے گہرے سرمے ہونٹوں پہ سجی مدھم سی لالی، اور سر سے پیر تک کی گئی ساری تیاری کو بڑی قدر دانی سے دل میں اُتارا۔
"کل صبح چلا جاؤں گا خانم! چھپنے میں وقت تو ضائع نہ کیا کرو۔" وہ اب اپنے حکم کی جامع وضاحت دیتے ہوئے بے اختیار اس کے چہرے کی رونق بحال کر گیا۔ رباب اپنی نادانی پر بے ساختہ ہنس دی۔
"پھر کب آؤ گے؟" جانے کے نام پر دل مٹھی میں سکڑنے لگا۔ اس نے نظر اٹھا کر نصیر کی آنکھوں میں پہلی بار دیکھا۔
"تم بتاؤ، کب آؤں؟"
"میری کب مانتے ہو۔" وہ خفا ہوئی۔
"دل کی تو مانتا ہوں۔" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔ رباب نے پہلے تو تعجب سے نظر اٹھائی پھر شرما کر منہ پھیر لیا۔ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ نصیر کا دل ایک اسی کے دم قدم سے تو آباد تھا۔
"تمہیں کام سے نہیں روکتی، بس اتنا کہوں گی، جتنا ممکن ہو سکے، جلدی آنے کی کوشش کیا کرو۔"
"پہلے بتاؤ۔ کتنا انتظار کرتی ہو، پھر ہی جلدی کا وعدہ کروں گا۔"
"اب تم تو نہ پوچھو۔" وہ جھینپ گئی۔
"بتاؤ گی نہیں تو جانوں گا کیسے؟"
"میں نے کبھی پوچھا تم سے؟"
"بہت بھروسا ہے اپنے نصیر پہ؟" وہ اس کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں لیے اس کے گلابی چہرے پر پھیلتی شرم کی سرخی کو دیکھ رہا تھا۔
"خود سے بھی زیادہ بھروسا ہے۔" رباب کی

www.pklibrary.com

بے تاب نگاہیں باری باری اضطراب سے نصیر کی دونوں آنکھوں میں بھٹک رہی تھیں۔

''اور میں اس بھروسے کا مان کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا۔''

''یہ عہد آسان نہیں ہے نصیر!'' رباب کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

''نصیر جان دے کر عہد پورا کرنے والوں میں سے ہے۔''

''بس کواہ (بس کرو)۔'' وہ اس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جھجک گئی۔ چوڑیوں کی کھنک نے نصیر کا دھیان بٹایا اور بڑی دیر بعد اس کی تیاری پہ دھیان دیتے وہ مسکرا دیا۔

''کالا رنگ تو بہت جچ رہا ہے خانم!''

''تمہاری پسند پر تو بنوایا ہے۔'' وہ بھی ہنس دی۔

''بس ایک چھوٹی سی کمی ہے۔'' نصیر نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو رباب تعجب سے دیکھنے لگی۔ اس نے ایک ڈبیا نکال کر کھولتے ہوئے رباب کی طرف بڑھائی۔ چاندی کے درمیانے سائز کے جھمکے تھے جن میں سفید ہی موتی لگے تھے۔ رباب کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی

''بہت خوب صورت ہیں۔ لیکن.....'' وہ اس کی طرف دیکھ کے جھجکی، نصیر نے حیرانی سے آنکھیں سکیڑیں۔

''شبنم باجی کی شادی ہونے والی ہے ناں، تب پہنوں گی۔'' اس نے مسکرا کر لیکن کی وضاحت دی

''تو میں کب دیکھوں گا شیرنے؟'' وہ ایک ذرا سی ملاقات کے دوران بھی اسے سوشیلے ناموں سے بلا سکتا تھا اور یہ رباب کے لیے نصیر کی موجھیں مارتی محبت تھی جو لبوں سے شہد سی ٹپکتی تھی۔

''اب جاؤ نا نصیر! لالا آجائے گا۔ آج تو دادی بھی گھر پر ہے۔'' وہ اب وقت کی تنگی سے گھبرانے لگی تھی۔

''بس تھوڑی دیر کے لیے پہن کر دکھا دو''

''اچھا کھانے کے وقت پہن کر آؤں گی۔ چپکے سے دیکھ لینا۔'' وہ مصالحتی رویہ اپناتے فوراً پیچھے اپنے کمرے میں غائب ہوئی۔ نصیر بھی قدم پیچھے ہٹاتے صوفے پر آن بیٹھا۔ واسع اب کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ نشاط آگیں لمحے مختصر تو ہوتے ہی ہیں، یہی ان کا حسن ہے، یہی بے چین دل کا ننھا سا آسرا، اور اس مرتبہ تو خوشی کی گھڑیاں توقع سے کہیں بڑھ کر ہاتھ آئی تھیں۔

واسع سے مہینے بھر بعد کی پرجوش ملاقات کے اثرات روز کے حساب سے ان دونوں کے جگمگاتے چہروں پر چاند بن کر چمکنے لگے تھے۔ اللہ لطف و کرم کے ان اتفاقات کو یونہی قائم و دائم رکھے۔ نصیر نے مسکرا کر اوپر دیکھتے دل سے دعا مانگی۔

☆☆☆

ادھر گلشن بی بی کے بڑھتے سردرد کی وجہ بھی کچھ یہی اتفاقات تھے۔ مہینے بھر بعد نصیر کی گھر آمد ہوئی تھی کیسے کیسے منصوبے نہ بنا رکھے تھے بیٹے کو شادی کے لیے راضی کرلینے کے۔ نوکری لگ جانے کے بعد تو جبار بھائی کے سامنے بھی اب خوب تمکنت کے ساتھ سر اٹھا کر رشتہ مانگنے کا وقت آیا تھا۔ یوں تو بات ان دونوں کے لیے کچھ ایسی نئی بھی نہ تھی۔ جبار لالہ اور نگار بھابی گلشن کے خیالات سے خوب واقف تھیں۔ یعنی نصیر کے لیے نیلم اور وکاء کے لیے بدلے میں زمرد کا رشتہ اور جبار بھائی کے ہاں بدلی کا یہ فیصلہ گلشن بی بی کا ایسا خواب تھا جسے پورا کیے بنا تو وہ مرنے والی بھی نہ تھیں۔ اللہ پاک نے ایک ہی ایک تو بیٹا دیا تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ان کا نصیر خان۔ لیکن یہ جمیلہ بھابی اسی ایک کو ہی چھیننے کے درپے تھیں۔

''کیا ہوا اماں، سر دبا دوں؟'' زمرد دیکھ رہی تھی اماں نہ صرف بہت بے چین ہیں بلکہ لگاتار اپنا سر بھی دبائے جا رہی ہیں۔

''رہنے دو۔'' انہوں نے ہاتھ جھٹکا، منہ پہ ہنوز

www.pklibrary.com

بارہ بجے تھے۔

"اچھا گولی کھالو یا چائے۔" وہ فکرمندی سے ماں کا چہرا دیکھ رہی تھی۔ گلشن نے سر دبانا چھوڑ کر کچھ سوچا پھر زمرد کو دیکھا۔

"اے لڑکی۔" انداز کچھ سرگوشیانہ سا ہو گیا۔ زمرد چونک کر ماں کو دیکھنے لگی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں۔

"میں کمرے میں جا کر لیٹتی ہوں، نصیر آئے تو کہنا اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بلڈ بھی چڑھ گیا، سر درد سے پھٹتا ہے۔ چائے اور گولی اسی کے سامنے لے آنا۔"

"ہوں۔" زمرد نے بمشکل ہنسی چھپائی۔

"آؤ۔" وہ اٹھ کر ماں کو سہارا دینے لگی۔

"اچھا تو تمہیں لگتا ہے۔ اس طرح وہ رباب سے شادی سے باز آجائے گا؟" وہ کمرے تک آتے خود کو منہ کھولنے سے باز نہ رکھ سکی۔

"خدا غارت کرے ان ماں بیٹیوں کو۔ چیل کی طرح جھپٹ لیا میرے بچے کو۔" گلشن کو پھر سے زخم ہرا ہوتا محسوس ہوا۔ زمرد نے تاسف سے سر ہلایا۔

"نیلم سے شادی کرلے تب تو یہ نہیں کہوں گی کہ نگار اور نیلم نے میرا بچہ چھین لیا۔ اب نہیں تو شادی کرنی ہے لالہ کی۔"

"کہیں نہیں۔" گلشن نے جھٹ جملہ اُچکا۔

"صرف جبار لالہ کے ہاں ہوگی اور دیکھتی ہوں کیسے انکار کرتا ہے۔"

"اماں! اس کو رباب پسند ہے، کیوں زبردستی اس کی محبت چھینتی ہو۔" زمرد کو لگا اپنا درد تو دکھا یا نہیں جا سکتا، بھائی کی وکالت ہی شاید کسی کام آجائے لیکن برا ہوا اس مشورے کا۔ گلشن نے جوابا کچھ بولنے کے بجائے سر پہ زور سے ایک جمائی۔

"اب تو بھی پیار محبت کی باتیں کرے گی بے شرم۔ ایک وہ تیرا مجنوں بھائی کم تھا میرے لیے۔ عقل کا بھی اندھا، آنکھوں کا بھی اندھا۔ اتنی پیاری شہزادیوں جیسی نیلم دکھائی نہیں دیتی اس کو۔"

"اچھا؟" بھاری مردانہ آواز یک لخت دروازے کی طرف سے آئی اور دونوں ماں بیٹیوں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ نصیر مسکراتے ہوئے اپنی نرم گھنی موچھوں پہ انگلیاں چلاتے اندر داخل ہو رہا تھا۔

"نیلم شہزادیوں جیسی ہے اور......" وہ رکا اور ٹھٹک کر زمرد کو دیکھا۔

"تو جا، پانی لے آ۔" بہن کو وہاں سے بھگا کر اس نے ماں کے قریب موڑھا گھسیٹا۔ "اور رباب خوب صورت نہیں ہے؟" انداز بڑا ہی جتاتا سا تھا، گلشن کو اپنا دل کوئلوں پہ سلگتا محسوس ہوا۔

"نیلم سے زیادہ پیاری نہیں ہے، عام سے نین نقش ہیں، تیرا ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ اب ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگی تھیں۔

"اتنا مت جلا کڑھا کرو۔ وہ بھی تمہارے سگے بھائی کے بچے ہیں یہ بھی۔ تو دل پہ ہاتھ رکھ کر بتاؤ اماں! اہمیت خونی رشتوں کی ہونی چاہیے یا دولت کی؟"

وہ ایک دم سنجیدہ ہوا اور گلشن کے پاس ظاہر ہے کہ اس کی باتوں کا جواب تو کوئی تھا نہیں۔ ہاتھ کو دفع دور انداز میں جھٹکتے پیٹھ موڑ کر لیٹ گئیں۔ نصیر نے تاسف سے سر ہلاتے باہر کی راہ لی۔ ذہن و دل پر کچھ دیر پہلے کا نظارہ روشن تھا۔ کسی بحث میں پڑنا اچھا بھی کہاں لگ رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ارشاد بے خالہ نازنین کے سامنے بیٹھی مسلسل پریشانی سے کبھی لب کاٹ رہی تھیں تو کبھی انگلیاں چٹخانے کی آواز آنے لگتی۔ آج صبح ہی تین عورتیں ان کے ہاں آئی تھیں اور اجنبی لوگوں کے لیے یوں تو نازنین کبھی کنڈی نہیں کھولا کرتی تھی لیکن صبح سویرے ناشتے کے وقت ہی اسے بابا نے بتا دیا تھا کہ آج کچھ مہمان گھر آئیں گی، اور پھر ناشتے کے بعد وہ اسے بازار سے کیک، بسکٹ، نمکو وغیرہ بھی خرید کر دے

گئے تھے اور خود بھی اُن عورتوں کی آمد سے پہلے پہلے گھر واپس آ گئے۔

عورتوں کو نازنین نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ ان کی آمد کا مدعا ان کی باتوں سے ظاہر ہو سکا وہ اس سے یونہی معمول کی گفتگو کرتی رہیں۔۔۔ اور ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد چائے وغیرہ پی کر رخصت ہو گئیں، اور ان کے جانے کے بعد بابا بھی کہیں چلے گئے۔

چار بجے لڑکیاں پڑھنے آئیں تو نازنین نے بس کچھ دیر ہی انہیں پڑھایا اور چھٹی کے وقت عروبہ کے ہاتھ ارشادے خالہ کو پیغام بھی بھجوا دیا اور اب خالہ اس کے سامنے بیٹھی مسلسل اُسے پریشان کن نظروں سے دیکھتے مزید پریشان کر رہی تھیں۔

''تم...... مجھے...... فون ملا دو۔'' بہت دیر سوچنے کے بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچیں۔ ''تمہاری بہن سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''سب ٹھیک تو ہے ناں خالہ؟'' وہ بہت بری طرح نروس تھی۔ خالہ نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔

''سب ٹھیک ہے، تم مجھے نمبر ملا دو، میں اس سے حال احوال کر لوں، پھر تمہیں بھی بتاتی ہوں اور تم مجھے اس دوران مزے دار سی چائے پلا دو۔''

''جی خالہ۔'' وہ ابھی ابھی ہی اٹھ کر میز تک آئی۔ موبائل اٹھا کر کال ملائی، پہلے کچھ دیر خود باجی سے بات کی پھر یہ کہہ کر کہ ارشادے خالہ سلام دعا کرنا چاہتی ہیں موبائل ان کو دے دیا اور خود چائے بنانے کچن میں آ گئی۔

کچن کی کھلی کھڑکی سے خالہ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ آج شاید وہ خود بھی نازنین سے چھپانے کے موڈ میں نہ تھیں۔ باجی سے بات کرتے ان کی آواز بہت صاف اور واضح تھی۔

''بیٹا تم یہاں کا چکر لگا لیتیں تو بہت سی باتیں تم سے کرنے کی تھیں لیکن مجھے لگتا ہے اب وقت ضائع کرنے سے بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ تم بہن ہو نازنین کی اور اس کی سچی خیر خواہ ہو۔ تم ہی جلدی اس کے لیے کچھ کر سکتی ہو، ہاں وہ...... بات یہ ہے کہ آج گھر پر کچھ عورتیں ناز کو دیکھنے آئی تھیں، تمہارا باپ ہی ڈھونڈ لایا ہے، مجھے عجب خان سے بہت ساری باتیں پتا چلی ہیں، بڑے دنوں سے پریشان ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں، بس اب تمہیں بتا رہی ہوں، جو تم سے ہو سکے جلد از جلد کرو، تمہارے باپ کو ہر حال میں ناز کی جلدی شادی کرنے کی پڑی ہے، یہ عورتیں جس آدمی کا رشتہ لائی ہیں، وہ تمہارے باپ کا دوست ہے اور اس کی بیوی پانچ سال پہلے مر چکی ہے، جوان بچے ہیں۔ بس پیسے والا ہے اور کوئی خوبی نہیں، ناز کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لو بیٹا۔

ارشادے خالہ اب جلدی جلدی باجی کو خطرے سے آگاہ کر رہی تھیں، اندر بیٹھی ناز کا چہرا ہلدی پڑتا جا رہا تھا، بابا اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں، شادی کی اتنی جلدی کس لیے اور پھر رشتہ بھی ایسا۔

''تمہارے باپ کو اس کرایے کے گھر سے پیچھا چھڑوانے کی پڑی ہے، اس نے۔'' خالہ کچھ دیر کے لیے اٹک کر رک گئیں، ایک نظر دروازے میں چائے کا کپ لیے ناز کی طرف دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر فیصلہ کن انداز میں کہنا شروع کیا۔ مخاطب تو اب بھی باجی تھیں لیکن وہ ناز سے بھی کچھ چھپانے کے موڈ میں نہ تھیں۔

''تمہارے باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔''

بالآخر انہوں نے ہمت کر کے وہ حقیقت بھی بتا ہی دی جس سے وہ دونوں بہنیں اب تک بالکل انجان تھیں اور انہیں کسی قابل سمجھنے کی زحمت بھی نہیں کی گئی تھی۔ نازنین نے ہاہ کر کے ہتھیلی منہ پر رکھی۔

''ایک بیوہ عورت ہے۔'' ارشادے خالہ مزید بتانے لگیں اور ناز نے اس پہلے جھٹکے پر بمشکل خود کو سنبھالا دیتے ان کی باتوں پر دھیان لگایا۔

www.pklibrary.com

”بہت مال دار ہے اور تمہارے بابا کو اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھے گی۔ اس کے ساتھ دو چھوٹے بچے ہیں اور کوئی نہیں۔ تمہارا باپ اس وقت صرف اور صرف ناز کو رخصت کرنے کے چکر میں ہے، چاہے رشتہ کیسا ہی لولا لنگڑا کیوں نہ ہو۔“

باجی اب جواباً ارشادے خالہ سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ گہری سنجیدگی سے بغور باجی کو سن رہی تھیں، ناز نے چائے کا کپ خالہ کے سامنے رکھا اور بے چینی سے ان کی صورت تکنے لگی، پتا نہیں باجی اسے اس مصیبت سے کیسے نکالیں گی۔

”تم کسی طرح خود یہاں آجاؤ بیٹا! مجھے شک ہے تمہارا باپ شادی کی تاریخ بھی پکی کر چکا ہے، تم جج......“

موبائل فون ارشادے خالہ کے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ سامنے بیٹھی ناز اچانک ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کریم اللہ ہی تھا جو سر پر کھڑا انہیں غضب ناک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ پتا نہیں کھلے دروازے سے کب وہ اتنی خاموشی سے اندر داخل ہوا کہ ان دو بے وقوف عورتوں کو دکھائی بھی نہیں دیا۔

”کس کا فون ہے؟“ اس نے غصے سے نازنین کو دیکھا۔

”ب---- باجی کا......“ وہ سر نہیں اٹھا پائی اور کریم اللہ نے موبائل فون کان سے لگایا، کال ابھی تک ملی ہوئی تھی۔

”ہیلو“ اس کے مخاطب کرنے پر شاید باجی نے آگے سے جواب دیا تھا۔ کریم اللہ نے کچھ دیر رک کر اس کے سلام کا جواب دیا پھر ایک نظر باری باری خالہ ارشادے اور نازنین پر ڈالتے کہنا شروع کیا۔

”اس جمعہ کو عصر کے بعد نازنین کا نکاح ہے، اُلفت احمد کے ساتھ۔ تم بھی شوہر اور بچوں کے ساتھ پہنچ جانا۔“ اور معلوم نہیں آگے سے باجی نے کیا کہا کہ وہ چلا اٹھا۔

”بااس...... اور کچھ نہیں۔ آنا ہے تو آؤ نہیں تو نکاح اور رخصتی جمعے سے ایک دن بھی ادھر ادھر نہیں ہوگی۔“ اس نے حکمیہ انداز میں کہتے ہوئے موبائل چارپائی پہ پٹخا اور جتاتی غصے بھری نگاہ ارشادے خالہ پر ڈالتے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سخت پشیمان سی اب فوراً یہاں سے نکلنا چاہتی تھیں، سر پہ برقع جماتے تھیلے بھر کو پلٹیں، نظر لڑکھڑا کر نیچے گری نازنین پر پڑی اور وہ چیخ کر آگے بڑھیں، بمشکل بازو تھام کر اس کا سر پائے پر لگنے سے بچایا لیکن تب تک نازنین بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

”رباب گل، دادی کو سرہانہ لادے، باہر لیٹتی ہے۔“ جمیلہ دوپہر کے لیے سبزی چن رہی تھیں جب ساس آہستہ آہستہ دیوار کے سہارے باہر آتی نظر آئیں۔ جمیلہ نے کام چھوڑ کر انہیں ہاتھ پکڑ کر آگے آنے میں مدد دی۔ رباب بھی کمرے سے فوراً ہی سرہانہ لیے باہر آگئی تھی۔

”باری کہاں ہے؟“ وہ بڑی کھاٹ پہ آہستہ سے بیٹھ گئیں۔

”صبح ہی صبح اللہ خبر کہاں نکل گیا۔ بتاتا کب ہے۔“

”بھائی اس کا ایسے ہی تو فکر نہیں کرتا، ہاتھ سے نکل جائے گا یہ لڑکا۔“ دادی کی سوئی آج شاید باری پہ اٹکی تھی۔

رباب اور جمیلہ جانتی تھیں، صبح سویرے دادی جس موضوع پر پہلا جملہ منہ سے نکالتی شام ہونے تک بس وہی زیر بحث رہتا۔ آج لگتا ہے باری کی شامت آئی ہے۔ اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ جمیلہ نے پلکیں موند کر مسکراتی تصدیق کی وہ خود ہر حال میں ساس کی ہاں میں ہاں ملاتی تھیں اور ساس کیا وہ اس کی سگی خالہ تھیں۔

جمیلہ نے بھی کبھی ساس نہیں سمجھا، ہمیشہ ان کی ہر بات خاموشی سے سنی تابعداری سے مانی، اماں کو بھی اسی لیے گھر جیسا سکون اپنے اسی مرحوم بیٹے کے بیوی بچوں کے ہاں محسوس ہوتا، دو چار دنوں کے لیے

www.pklibrary.com

کہیں بھی پھیرا لگا آئیں، واپسی پھر یہیں ہوتی، جتنا انہیں حبیب اللہ پیارا تھا اتنی اس کی اولاد، اسی کی بیوی۔ باقی تقریباً سب ہی بیٹے بیٹیوں نے نئے مکان بنوالیے تھے۔ ایک یہی بڑا سا پرانا مکان آج بھی اپنی اصل حالت میں قائم تھا۔ یہاں کی مٹی سے پرانے دنوں جیسا پیار بھی اماں کی رگ رگ میں سمایا تھا۔

"واسع کا فون آئے تو کہنا اُسے، باری کو سمجھائے۔" دادی پھر شروع ہوگئیں۔

"اماں اس کا فون بھی تو کبھی سیف کے موبائل پہ کبھی رئیس اور اسفند کے موبائل پہ آتا ہے۔ ڈھنگ سے بات بھی کہاں ہو پاتی ہے۔"

"اچھا خیر ہے، اب تو خود آجائے گا ان شاء اللہ۔ پھر دیکھتی ہوں، کہاں دوڑتا پھرتا ہے یہ باری۔"

اماں نے کروٹ بدلی۔ جمیلہ بھی کام میں مصروف ہوگئیں۔ گھر میں فون نہ ہونے کی وجہ سے بڑی پریشانی رہتی تھی لیکن وہ واسع کو تنگ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ مہینے ڈیڑھ کی تو بات تھی پھر ایک بار ان کا واسع گھر واپس آجاتا۔ انہیں کسی بھی بات کی پریشانی لینے کی کیا ضرورت تھی۔

☆☆☆

"سیف! وہ آپ سے بات کرنی تھی؟" نغمہ نے شوہر کی تیاری دیکھتے جلدی سے بات شروع کرنے کی کوشش کی۔ رات وہ دیر تک اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی لیکن بابا نے آکر بتایا کہ ڈیرے پر چمن سے کچھ مہمان آگئے ہیں، سیف اللہ دیر سے آئے گا اور نغمہ منزہ معیزہ کو سلانے کی کوشش میں خود ہی نیند میں چلی گئی اور اب صبح سویرے وہ پھر عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔

"ابھی ٹائم کہاں ہے یار! سب کا پھل نکل گیا۔ ایک ہمارے ہی کام پورے نہیں ہوتے۔ بابا کی طبیعت بھی ابھی خراب ہوئی تھی۔ وہ بالوں میں جلدی جلدی کنگھی کرکے اب چپل کے بکل بند کررہا تھا۔

"اللہ، چھوٹی سی بات کرنی ہے، سنتے جاؤ پھر تو۔" نغمہ تو اس کی تیزیاں دیکھتے بوکھلا ہی گئی۔ ایک بار وہ ڈیرے پر نکل جاتا تو دوپہر تک واپس بلانا مشکل تھا۔

"کیا چھوٹی سی بات؟" وہ چیخ پڑا۔ "گھر میں اور کم لوگ ہیں سننے سنانے کو۔ میرا دماغ مت کھاؤ صبح ہی صبح۔ اور ہاں ناشتہ بھی باندھ دو، کھانے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

وہ بس اپنی کہتے باہر نکل گیا۔ نغمہ بھاگ کر برآمدے میں آئی تو وہ اماں بابا کے کمرے میں جاچکا تھا۔ اب اگر وہ پیچھے جاتی تو مزید ڈانٹ کھاتی کیونکہ سیف اسے کھانا پیک کرنے کا آرڈر دے گیا تھا۔ وہ سخت بجھے دل کے ساتھ کچن میں آگئی۔ دل بری طرح رونے کو کررہا تھا۔ کتنی ضروری بات کرنی تھی اس سے اور۔۔۔

"کیوں جھگڑ رہے ہو صبح سویرے؟" شمیم جان نے افسوس سے سیف کی طرف دیکھا۔

"باہر کے بکھیڑے ختم نہیں ہوتے، اب اس کی کیا سنوں۔" وہ باپ کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر طبیعت چیک کرنے لگا۔ رات وہ ڈیرے سے آیا تو بابا کو بخار تھا۔

"آرام سے بات سن لیتے، جانتے تو ہو وہ آج کل کتنی پریشان ہے۔"

"آپ خود دیکھ لیں، اس کے معاملے کو، میرا آج کا پورا دن بہت مصروف ہے۔ بابا کی دوائی بھی کسی بندے کے ہاتھ بھجوادوں گا، میرا دوپہر کو آنا بھی مشکل ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، تمہارے بابا کی طبیعت ٹھیک ہوجائے میں ان سے مشورہ کرتی ہوں۔ تم جاؤ۔"

شمیم جان نے مصالحتی رویہ اپناتے بالآخر اسی کی ہی مان لی، عبدالرحمٰن نماز پڑھنے کے بعد کافی دیر تک جاگتے رہے تھے۔ بڑی دیر بعد اب نیند آئی تھی۔ انہوں نے ان کے آرام میں خلل پڑنے کے

www.pklibrary.com

خیال سے ہامی بھرلی۔

☆☆☆

کریم اللہ اب زیادہ وقت گھر پر ہی گزارنے لگا تھا۔ نازنین سے اس کا موبائل لے کر اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ وہ کسی سے رابطہ نہ کر سکے۔ کبھی اسے کسی کام سے باہر جانا پڑتا تو باہر سے تالا لگا کر جاتا تاکہ پیچھے کوئی نازنین سے آکر مل نہ سکے۔ ساتھ ساتھ وہ شادی کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ اب تو بس تین دن ہی رہ گئے تھے۔ سہ پہر کو چائے پی کر وہ گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ نازنین کے پاس پڑھنے والی بچیاں آگئیں۔ انہیں گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر کریم اللہ وہیں جم کر بیٹھ گیا۔ اب وہ باہر سے تالا لگا کر نہیں جا سکتا تھا اور کھول کر جانے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔

"انہیں جلدی چھٹی دے دینا میں نے پھر باہر جانا ہے۔"

وہ غصے سے نازنین کو حکم دے کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ نازنین نے ہولے سے بس سر ہلا دیا۔

اس شام جب وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ ارشاد چاچی نے ہتھیلیاں مل مل کر اور پانی کے چھینٹے ڈال کر معلوم نہیں کیا کچھ دم کرتے اسے ہوش دلایا لیکن ابا نے ان کو دوبارہ یہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ باجی بھی بعد میں بار بار کال ملاتی رہی تھی لیکن ابا کاٹ دیتے۔ پتا نہیں باجی کے دل میں کیا تھا اور وہ اس کے لیے کیا کر سکتی تھی۔

"کاش وہ خود اس کے پاس آجائے...... لل...... لیکن......" نازنین کی محض سوچ کر ہی پلکیں بھیگ گئیں۔ باجی کہیں سچ مچ جمعے کے دن شادی میں شرکت کرنے نہ آجائے۔ ابا نے آخر کیا سوچ کر ایسا فیصلہ کیا تھا۔ بھلے وہ ان ماں بیٹیوں پر کبھی بھی زیادہ مہربان نہ رہے تھے لیکن یہ فیصلہ۔ وہ سسک پڑی۔

یہ تو بڑا ظلم تھا۔ وہ تو الفت احمد کو چاچا کہتی تھی۔ وہ اس کے ابا کے دوست تھے۔ اور اس رشتے کے حوالے سے وہ انہیں سوائے چاچا کے اور کچھ سمجھ بھی نہیں سکتی تھی تو پھر ابا نے ایسا کیوں کیا۔

تھک ہار کر تان اسی ایک جملے پر آکر ٹوٹتی۔

شاید ان کی دوسری بیوی کا بہت دباؤ ہے ان پر۔ پتا نہیں کیسی تھی ابا کی دوسری بیوی۔ وہ روتے روتے تھک گئی اور نازنین کو اپنی امی یاد آنے لگیں۔

ابھی محض سال ڈیڑھ پہلے تک گھر کے حالات آج سے کتنے الگ تھے۔ تب ابا بھی وہ خود لیکن امی کی موجودگی سے یہ گھر کیسا بھرا بھرا بارونق اور زندگی سے بھرپور لگا کرتا تھا۔ ایک دم منظم، شائستہ اور پرسکون سا۔ جانے یہ مائیں بھی ساری رونق اپنے ساتھ کیوں لے جاتی ہیں۔

ابا نے تو آنکھیں پھیرنے میں بس چند مہینے لیے تھے اور اب تو ایک دم اتنے پرائے کہ نازنین کا وجود بھی گھر میں برداشت نہیں اور دھکا دینے کے لیے انتخاب اپنے دوست کا۔ چھی۔ اسے تو سوچ کر ہی نفرت محسوس ہونے لگی۔

"یا اللہ، میری مدد فرمانا۔ کسی کے دل میں تو رحم ڈال دے مالک۔۔ ایک باجی سے ہی امید ہے میرے اللہ، وہ بھی ہار مان کر نہ بیٹھ جائے۔ اگر وہ بھی مہمانوں کی طرح شادی میں شرکت کرنے آگئی۔۔ پھر تو ایک تباہ حال زندگی کا آغاز اور...... اور سب ختم۔" اپنی زندگی سے جڑے وہ اس کے چند ایک معصوم حسین خواب، پھر شاید کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔

"جلدی بھیجو ان لڑکیوں کو۔" ابا کی دھاڑ نے جھرجھری لے کر اسے حال میں واپس کھینچا۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑے اسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اور آج انہیں فارغ بھی کر دو، اب آگے کوئی ضرورت نہیں پڑھانے وڑھانے کی۔ کل سے تم لوگ مت آنا۔"

اس نے بات کرتے خود ہی لڑکیوں کو بھی مخاطب کر ڈالا اور لڑکیاں فوراً ہی ڈر کے مارے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

www.pklibrary.com

"جی ...... جی ابا! میں بھیجتی ہوں ان کو۔ بس دو منٹ۔"

نازنین نے بوکھلا کر عروبہ کا بازو تھاما۔ وہ تو بھاگ کھڑے ہونے کو تیار ہو گئی تھیں اور نازنین کے پاس اب بھی بچی کچی چند گھڑیاں تھیں جن میں اسے کچھ سوچنا تھا۔ ایک بار یہ بچیاں بھی چلی جاتیں تو پھر جمعہ کے دن تک کسی سے رابطے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہتا۔

"وہ ان کی کچھ کاپیاں میرے پاس رکھی ہیں۔ وہ ان کو دے دوں۔" وہ لڑکیوں کو بٹھاتے جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں جلدی کرو۔" وہ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے واپس کمرے میں چلے گئے۔ نازنین نے اندر آکر چند گہرے گہرے سانس لیے۔ دماغ یکسو کر کے کچھ سوچا اور کمرے میں جا کر ایک کا بیگ اور کتابیں اٹھا کر دوبارہ باہر آگئی۔ ایک چور نظر دوسرے کمرے کے دروازے پہ ڈالی۔ ابا وہاں نہیں کھڑے تھے۔

"اُف ---" وہ اتنی سی گنجائش ملتے پر تیزی سے لڑکیوں کے پاس واپس آئی جو سب سہم کر چپ چاپ بیٹھی اس کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

"تم لوگ جلدی سے کام ختم کرو۔ [illegible] شاباش، جلدی کرو، مجھے ابا [illegible] آج کا کام مکمل کر لو، پھر کل سے مت آنا۔" اس نے لڑکیوں کو کام میں مصروف کر کے عروبہ کی [illegible] کاپی نکال لی اور اس کے آخری صفحے پہ کچھ لکھنا شروع کیا۔

"پیاری باجی۔ سلام ---- میرا موبائل فون ابا نے مجھ سے لے لیا ہے۔ وہ آتے جاتے گھر کو باہر سے تالا لگا جاتے ہیں۔ میں اب کسی سے کوئی رابطہ نہیں کر سکتی۔ میرے حالات آپ کو ارشاد خالہ کی زبانی معلوم ہو چکے ہوں گے۔ آج ابا نے بچیوں کو بھی ٹیوشن سے فارغ کر دیا ہے۔ کل سے یہ بھی میرے پاس نہیں آسکیں گی اور ابا جمعہ کے دن زبردستی میری شادی کر دیں گے۔ میں آپ کو باجی کا نمبر لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ آپ ارشاد خالہ کی اجازت سے اس نمبر پہ فون کر کے باجی کو سارے حالات بتائیں اور اس سے کہیں کہ نازنین کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے، وہ جلد میرے لیے کچھ کرے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ بہت شکریہ۔

دعا گو۔ نازنین!"

"عروبہ! یہ کاپی اپنی امی کو دے دینا۔ اُن کے لیے آخری صفحے پر کچھ لکھا ہے اور دیکھو بھولنا مت، یاد سے جاتے ہی دے دینا۔"

نازنین نے آہستہ آواز میں عروبہ کو سمجھاتے کاپی اس کے بیگ میں ڈال دی اور اس کے بعد بچیوں کو بھی جلدی فارغ کر دیا۔ اب تو بس یہی آخری امید بچی تھی، معلوم نہیں قسمت اس کا کس قدر ساتھ دینے کو تیار تھی۔ امید کا یہ دیا بھی کہیں بجھ نہ جائے۔

نازنین لرزتے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے بے چین و مضطرب سی وہیں صحن میں ٹہلنے لگی۔ ابا بھی لڑکیوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد باہر چلے گئے تھے۔

"یا اللہ، اب تو بس تیرا ہی آسرا ہے۔" وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی بے اختیار روتی چلی گئی۔

"مجھے ابا سے کوئی شکوہ نہیں، انہیں زندگی سے جو چاہیے انہیں عطا کر دے میرے مالک۔ لیکن مجھ پر ان کا ظلم بے جا ہے، میں انہیں نہیں سمجھا سکتی۔ تجھ سے مدد مانگ سکتی ہوں، میری یہاں سے نجات کا کوئی سبب پیدا فرما دے میرے اللہ۔ ابا کے دل میں رحم ڈال دے۔ اس ہونی کو ٹال دے۔"

وہ دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں سختی سے جوڑے آسمان کو دیکھتے شدت سے دعا گو تھی۔

وہ یہ تو نہیں جانتی تھی آنے والے وقت کے دامن میں اس کے لیے کیا رکھا ہے، ہاں بس ابھی مایوس نہیں تھی۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

www.pklibrary.com

تم جس خواب کا جادو لے کر
اپنے گیت بناتے ہو
تم جس آنکھ سے آنسو بن کر
اپنا درد بہاتے ہو' بادلوں کی طرح گھر آتے ہو
تم جس یاد کی خوشبو سے
اپنی شام سجاتے ہو' لفظوں کو مہکاتے ہو
تم جس پیڑ کی چھاؤں اوڑھے
دینہ نام کا گاؤں اوڑھے
رستہ رستہ، مٹی مٹی، اُگتے اور اُگاتے ہو
دھوپ میں پھول کھلاتے ہو
برکھا، باد، پرندہ اور چھتری بن جاتے ہو
میں اُس خواب کے جادو' آنکھ کے آنسو'
یاد کی خوشبو
اور اُس پیڑ کی چھاؤں سے
دُور دراز کے رستوں اور دشاؤں سے
بارشوں اور ہواؤں سے
ایک سنہری نظم بنا کر
روز تمہارے شہر کی سمت روانہ کرتا ہوں
ملنے کا بہانہ کرتا ہوں
گلزار

اور سب بھول گئے حرفِ صداقت لکھنا
رہ گیا ہمارا ہی کام بغاوت لکھنا

لاکھ کہتے ہیں ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا
ہم نے سیکھا نہیں پیارے یہ اجازت لکھنا

نہ صلے کی نہ ستائش کی تمنا ہم کو
حق میں لوگوں کے ہماری تو ہے عادت لکھنا

ہم نے جو بھول کے بھی شہ کا قصیدہ نہ لکھا
شاید آیا اسی خوبی کی بدولت لکھنا

دہر کے غم سے ہوا ربط تو ہم بھول گئے
سروِ قامت کو جوانی کو قیامت لکھنا

کچھ بھی کہتے ہیں کہیں شہ کے مصاحب جالب
رنگ رکھنا یہی اپنا اسی صورت لکھنا
حبیب جالب

جسے مکین کرو چھین لے مکاں ہم سے
مگر نہ باز کبھی آئے خوش گماں ہم سے

ہمیں نے دوستوں تم کو سمجھ لیا کیا کیا
کھلے نہ وقت پہ لیکن یہ بادباں ہم سے

مطالبہ ہے مراحمت دو سزا ہم کو
وہ کہہ رہے ہیں ہوا ہے فلاں فلاں ہم سے

قصور یہ ہے کہ ہم پر چلی نہیں مرضی
لیا حیات نے بدلہ کہاں کہاں ہم سے

تمہارے بعد ہوئی ہے یہ ساری صف بندی
وگرنہ کل تو بہت خوش تھا یہ جہاں ہم سے

عجیب لوگ ہیں خود کو نہیں سدھاریں گے
ہے ضد سدا کہ بس چھین لیں زباں ہم سے

ہوئی قدر نہ ہماری ہی وقت کو ابرک
سنا ہے ڈھونڈتی اب یہ زمیں جواں ہم سے

اتباف ابرک

ہونٹوں پہ ہنسی، آنکھ میں تاروں کی لڑی ہے
وحشت بڑے دلچسپ دوراہے پہ کھڑی ہے

آداب تری بزم کے جینے نہیں دیتے
دیوانوں کو جینے کی تمنا تو بڑی ہے

چاہا بھی اگر ہم نے تری بزم سے اٹھنا
محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے

دل رسم و رہِ شوق سے مانوس تو ہو لے
تکمیلِ تمنا کے لیے عمر پڑی ہے

شائستۂ پرواز ہیں صدیوں کے اسیر آج
افلاک میں ہلچل ہے زمیں چونک پڑی ہے

کیا نقش ابھی دیکھیے ہوتے ہیں نمایاں
حالات کے چہرے سے ذرا گرد جھڑی ہے

کچھ دیر کسی زلف کے سائے میں ٹھہر جائیں قابل
غمِ دوراں کی ابھی دھوپ کڑی ہے

قابل اجمیری

انمول مسکراہٹیں

خوشی

بیوی نے شوہر سے ازراہِ شرارت پوچھا۔
"اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟"
"شاید میں بھی مر جاؤں۔" شوہر نے فوراً جواب دیا۔
بیوی حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے بولی۔ "کیا میری جدائی کے غم میں؟"
"زیادہ خوشی بھی تو جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔" شوہر کے منہ سے بے ساختہ دل کی بات نکل گئی۔

بے زاری

ایک صاحب کا دو منزلہ مکان تھا۔ وہ کرایہ دار سے سخت بے زار تھے ایک دن انہوں نے ایک پاپ سنگر کو اپنے گھر گانا گانے کے لیے مدعو کیا۔ گلوکار نے بڑے انداز سے پوچھا کہ "سب سے پہلے کون سا گانا سناؤں؟"
"کوئی بھی سنا دو، ہمیں کرایہ داروں سے مکان خالی کروانا ہے" انہوں نے جواب دیا۔

آفر

ایک چور رات کو ایک گھر میں داخل ہوا۔ ابھی اسے اندر آئے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ گھر کی مالکن جو کافی سوئی تھی بیدار ہو گئی۔ اس نے پیچھے سے آگے بڑھ کر چور کو دھکا دے کر گرایا اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ پھر نوکر کو آواز دینے لگی۔
شرفو او شرفو! بھاگ کر جا اور پولیس کو بلا لا، میں نے چور پکڑا ہوا ہے۔
تھوڑی دیر بعد کھٹکا ہوتا ہے تو وہ آواز دیتی ہے کہ "ارے شرفو! تو ابھی تک گیا نہیں؟" نوکر نے جواب دیا۔ "بی بی جی جوتا ڈھونڈ رہا ہوں، نہیں مل رہا۔"
بے چارہ چور اس وقت تک ادھ موا ہو چکا تھا منمنا کر بولا۔ "ابے میری جوتی پہن جا اور جلدی سے پولیس کو بلا لا۔"

پاگل

بیوی اخبار پڑھتے ہوئے بولی۔ "اعداد و شمار نے ثابت کر دیا ہے کہ پاگل خانوں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے۔"
شوہر نے بے چارگی سے کہا۔ "اب تم خود اندازہ کر لو کہ کون کس کو پاگل کر رہا ہے۔"

پریشانی

خان صاحب کی بیگم نے فلیٹ سے نکلتے وقت دروازہ لاک کر دیا۔ اچانک انہیں یاد آیا کہ چابی تو وہ اندر ہی بھول آئی ہیں۔
ایک پڑوسن نے انہیں پریشان دیکھ کر کہا۔ "تم لوگ ایک فاضل چابی کیوں نہیں بنوا لیتے، اسے باہر گملے میں چھپا دیا کرو۔"
"وہ تو ہم نے بنوائی ہوئی ہے۔ گملے میں ہی چھپائی ہوئی تھی۔" خان صاحب کی بیگم نے بتایا۔
"تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔" پڑوسن نے حیرانی سے پوچھا۔
"کل اس گملے کو دھوپ سے بچانے کے لیے میرے شوہر نے اٹھا کر فلیٹ کے اندر رکھ دیا تھا۔" بیگم خان نے جواب دیا۔

فخر

بیوی نے شوہر کی سالگرہ والے دن اس سے

کہا "میں نے تمہاری سالگرہ پر ایسی چیز خریدی ہے جس سے تمہارا سر فخر سے بلند ہو جائے گا۔"

"اچھا! تو جلدی سے دکھاؤ کہ کیا چیز ہے۔" شوہر نے خوش ہو کر پوچھا۔

"میں ابھی پہن کر آئی۔" بیوی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ڈھٹائی

ایک صاحب اپنے پڑوس کی بیکری میں پہنچے اور مالک سے پوچھنے لگے۔ "آپ نے میری پالتو بلی کو تو نہیں دیکھا؟"

"دیکھا؟" بیکری کا مالک جل کر بولا۔ "وہ بیکری میں آن گھسی تھی ایک کیک کو کھانے کی کوشش میں اس نے تین کیک میں پنجے گاڑ دیے۔ چار چکن پیٹیز کھا گئی۔ دودھ کا برتن گرا دیا۔ اس کی وجہ سے ایک گاہک پھسل کر انڈوں کے کریٹ پر جا گرا اور آدھے درجن انڈے ٹوٹ گئے۔"

"اوہ بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔" وہ صاحب رنجیدہ لہجے میں بولے۔

پھر مار کر سے لکھا ہوا ایک پوسٹر بیکری مالک کو دکھاتے ہوئے بولے۔ "یہ میں اس کا تلاش گمشدہ کا اعلان لکھ کے لایا ہوں اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ آپ کی بیکری کے شیشے پر چپکا دوں۔"

چھٹکارا

روس میں ایک مزدور نے پورے سال اتنی محنت مشقت سے ایک محکمے میں کام کیا کہ انتظامیہ انعام کے طور پر اسے وہ اجازت نامہ دینے پر مجبور ہو گئی جس کی وجہ سے اسے اسٹیشن پر لائن میں کھڑے ہو کر ٹکٹ خریدنے سے چھٹکارا مل گیا۔

اگلے دن مزدور خوش خوش ریلوے اسٹیشن گیا ابھی وہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی تک بھی نہیں پہنچ پایا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کامریڈ بائیں جانب والی قطار میں۔"

"مگر میرے پاس اجازت نامہ ہے۔" مزدور نے فخر سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" کانسٹیبل نے کہا۔ "اور یہ ان لوگوں کی لائن ہے جن کے پاس اجازت نامہ موجود ہے۔"

وجہ

ایک عورت نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ۔ "بازو ٹوٹ جانے کے باعث میرے شوہر اسپتال میں داخل ہیں۔"

سہیلی نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "مگر ان کا بازو ٹوٹا کیسے؟ کیا ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "حادثہ تو نہیں ہوا مگر میں نے ان کا بازو ایک لڑکی کی کمر کے گرد دیکھ لیا تھا۔"

سعادت

ایک شخص اپنی بیوی کے پاس انتہائی پریشان شکل لیے آیا۔ بیوی نے پوچھا۔ "آپ کو کیا ہوا ہے؟"

شوہر بولا۔ "بادشاہ نے ہر اس شخص کے قتل کا حکم دیا ہے جو دوسری شادی نہ کرے۔"

بیوی یہ سن کر مسکرا کر بولیں۔ "کتنی بڑی سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شہادت کے لیے چن لیا ہے۔"

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

قیمت -/400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

شگفتہ سجاد

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتی ہیں میں نے ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے دو ہمسائے ہیں تو میں ان میں سے کسے تحفہ بھیجوں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کا دروازہ تجھ سے زیادہ قریب ہو۔"

(صحیح بخاری)

کہیں اپنوں کو نہ ہار جانا،

طنز اور بے حسی سے رشتے کمزور ہو جاتے ہیں۔

بس کبھی اپنوں سے ایسی لڑائی نہ لڑنا کہ لڑائی تو تم جیت جاؤ مگر اپنوں کو ہار جاؤ۔ رشتہ داری میں ہمیشہ درگزر کا ایک گر اپنا لو پھر دیکھو کیسے ہر تقریب میں تمہارے ارد گرد اپنوں کا ہجوم ہو گا اور تم سب کی پسندیدہ شخصیت بن جاؤ گے۔

دُنیا،

نقل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک پتھر سر کے نیچے رکھ کر سو گئے۔ ابلیس آپؑ کے پاس آیا اور بولا۔

"آپ نے تو دُنیا ترک کر دی تھی، اب آپ اس سے باز کیوں آ گئے؟"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "میں نے کیا کیا؟"

اس نے کہا کہ آپ پتھر سر کے نیچے رکھ کر آرام جو کر رہے ہو۔"

یہ سنتے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس پتھر کو پھینک دیا اور فرمایا۔

"لے مجھے اتنی دُنیا داری سے بھی سروکار نہیں ہے۔"

مقام ہنسی،

اسرائیلیات میں درج ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دن اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔

"یا باری تعالیٰ! کیا آپ کو کبھی ہنسی آتی ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ "ہاں موسیٰ! آتی ہے۔"

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا۔ "آپ کو کب ہنسی آتی ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔

"اے موسیٰ! مجھے دو مواقع پر بہت ہنسی آتی ہے۔ ایک جب میں نے کسی شخص کو کوئی چیز عنایت کی ہوتی ہو اور پوری دُنیا مل کر اس سے وہ چیز چھیننا چاہتی ہو تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ اور دوسرا میں جب کسی شخص کو کوئی چیز نہ دینا چاہوں اور پوری دُنیا مل کر اس شخص کو وہ چیز دینا چاہتی ہو تو مجھے اس وقت بھی بہت ہنسی آتی ہے۔"

(زیرو پوائنٹ۔ جاوید چوہدری)

مطالعہ،

- مطالعہ غم اور اُداسی کا بہترین علاج ہے۔
(شیخ سعدیؒ)
- اچھی کتابوں کا مطالعہ زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔
(امام غزالیؒ)
- مطالعے سے آدمی کی دہشت اور دیوانگی ختم ہو جاتی ہے۔
(حکیم لقمان)

نادیہ یاسر۔ گوجر خان

غور کیجیے!

- دعا دستک کی طرح ہے۔ مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔
- جب آپ کو محسوس ہو کہ آپ کی طبیعت کو ذکرِ خدا سے محبت ہو گئی ہے تو سمجھو کہ اللہ آپ کو پسند کرنے لگا ہے۔
- یادیں محبت کرنے والوں سے زیادہ وفادار ہوتی ہیں کیونکہ محبت کرنے والے تو چھوڑ جاتے ہیں مگر یادیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔

اقصیٰ ناصر۔ گلستان جوہر

محبت!

ایک دفعہ ایک عورت کا بچہ گم ہو گیا۔ وہ اسے قافلے میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ وہ ایک ایک آدمی سے بچے کے بارے میں پوچھتی۔ بالآخر اس کا کھویا ہوا جگر گوشہ مل گیا۔ اس نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا۔ مگر اسے یقین نہ آیا تھا۔ وہ بار بار اس کا منہ دیکھتی اور پیار کرتی۔ ہر شخص اس کی کیفیت سے متاثر ہو رہا تھا۔

عین اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟"

سب نے عرض کی۔ "نہیں، یہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اسے اپنے بیٹے سے بے پایاں محبت ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس سے کئی گنا زیادہ محبت ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے بندے دوزخ کی آگ میں جلیں۔"

طویل سے طویل تقریر بھی محبت الٰہی کے بارے میں وہ اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فقرے نے اس نفسیاتی ماحول میں پیدا کیا۔

روشن ستارے!

- دنیا کی سب سے بڑی مسرت یہ ہے کہ آپ وہ کام کر دکھائیں جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں آپ نہیں کر پائیں گے۔
- آسمان پر نگاہ رکھو لیکن یہ مت بھولو کہ پاؤں زمین پر ہی ہیں۔
- فضول بحث بہترین دوست سے جدا کر دیتی ہے۔
- تکبر کو توڑنا چاہتے ہو تو غریب مفلس لوگوں کو سلام کرو۔

عائشہ۔ گوجرہ

پتے کی بات!

شیطان نے حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضری دی اور کہا۔

"حضرت! میں آپ کے ایک احسان کا شکریہ کس بات سے ادا کروں؟"

نوح علیہ السلام نے پوچھا۔ "کون سا احسان؟"

شیطان نے کہا۔ "آپ نے بددعا دے کر اپنی قوم کو غرق کر دیا۔ میں بہت خوش ہوں کہ تباہی تو میرا کام ہے جسے آپ نے انجام دیا۔"

نوح علیہ السلام پریشانی سے شیطان کی صورت دیکھنے لگے۔ شیطان نے کہا۔

"میں آپ کے اس احسان کے عوض آپ کو ایک پتے کی بات بتانا چاہتا ہوں۔"

حضرت نوح علیہ السلام نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

شیطان نے جواب دیا۔ "اگر آپ مجھ سے واقعی بچنا چاہتے ہیں تو غصہ پی جایا کریں۔"

اقوالِ حکمت!

- یہ ممکن ہے کہ آپ کسی چیز پر بلا استحقاق قبضہ کر لیں مگر یہ ناممکن ہے کہ آپ کسی چیز پر اپنے بلا استحقاق قبضہ کو باقی رکھ سکیں۔
- غلطی کے بعد سرکشی مت کیجیے۔ اللہ کے ہاں غلطی کی معافی ہے سرکشی کی نہیں۔
- حسد اور غرور جب انسان کے اندر داخل ہوتے ہیں تو وہ عقل کو باہر کر دیتے ہیں۔

- اتحاد کیا ہے؟ اختلاف کے باوجود متحد رہنا۔
- نفسانی خواہشات کا جنون بہت تھوڑی دیر رہتا ہے مگر پچھتاوا بہت دیر تک رہتا ہے۔

واصف خیال؛

خاک ہو جائے وہ مرتبہ جو دوسروں کے لیے مفید نہ ہو۔ لعنت ہے اس طاقت پر جو کمزور کی حفاظت نہیں کرتی بلکہ اسے ڈراتی ہے۔

نوال افضل لقمن۔ کراچی

بالو ذیب؛

اس دنیا میں سکون سے جینے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ ہر انسان کے پاس ایک وسیع قبرستان ہو جہاں وہ لوگوں کی غلطیوں اور خامیوں کو دفنا آیا کرے۔

ثمرہ عاقب۔ گرین سٹی

کیا آپ متفق ہیں؟

- خوش نصیبی ایک ایسا پرندہ ہے جو کسی کی منڈیر پر زیادہ دیر نہیں بیٹھتا۔
- پانی میں اترتے وقت یہ مت دیکھیے کہ پانی کتنا گہرا ہے۔ یہ دیکھیے کہ آپ کا قد کتنا ہے۔
- ایک چھوٹا سا کنکر جب آپ کے پاؤں تلے آکر آپ کو اذیت دیتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے حقیر مت جانو۔
- ہر شیر کی دہشت اسے شیر بنائے رکھتی ہے ورنہ ان میں بھی کئی بزدل اور کئی شیر ہوتے ہیں۔
- آگ لکڑی میں نہیں اس ہاتھ میں ہوتی ہے جو اسے لگاتا ہے۔
- تکبر سے تنی ہوئی بلند گردن دشمن کا نشانہ وسیع کر دیتی ہے۔
- زندگی اور خربوزے میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے کہ یہ پھیکی بھی نکل آئے تو اسے پھینکا نہیں جا سکتا۔

(مستنصر حسین تارڑ کی چھوٹی سی بات)

تحفت؛

ایک چیونٹی نے جلیل القدر اور عظیم الشان بادشاہ سلیمان کے لشکر کی دعوت کی جس میں چرند پرند، انسان اور جنات سب شامل تھے۔ میزبان چیونٹی کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور پوچھا۔

"بتا تیری سلطنت بڑی ہے یا کہ میری؟"

چیونٹی نے جواب دیا۔ "کس کی سلطنت پر عظمت ہے، یہ تو اللہ کو معلوم ہے مگر میں یہ جانتی ہوں کہ اس وقت میرا تخت سلیمان کا ہاتھ ہے۔"

عقل مند اور بے وقوف؛

عقل مندوں کے تین گروہ یا قسمیں ہیں۔

1. جو سن کر عمل کرے۔
2. جو دیکھ کر عمل کرے۔
3. جو نقصان اٹھانے کے بعد عمل کرے۔

لیکن اس کے برعکس بے وقوف ایک ہی طرح کا ہوتا ہے جو نقصان کے بعد بھی عمل نہیں کرتا۔

موت کا سبب؛

بو علی سینا کا بچہ مر چکا تھا۔ دوست احباب عزیز و اقارب تعزیت کے لیے آتے اور طبیب سے طرح طرح کے سوالات کرتے۔ اس دوران کسی نے ان سے سوال کیا۔

"آخر بچے کی موت کا سبب کیا ہے؟"

طبیب نے جواب دیا۔

"مجھے اس کی زندگی کا سبب نہیں معلوم ہو سکا اس کی موت کا سبب کس طرح بتاؤں؟"

www.pklibrary.com

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

یاسمین کنول ________ پسرور

جسے بھلائے اک زمانہ بیت گیا
میں اس کی یاد کی پرچھائیوں سے خائف ہوں

افشاں ناصر ________ کراچی

تو ڈھلا ہے وقت کے ہنگاموں نے
میری خواہش ہے وہی خواب دوبارہ دیکھوں
کبھی دل سے جو دکھائی نہیں دیتا مجھ کو
وہی امید کا دھندلا سا ستارا دیکھوں

ارم کمال ________ فیصل آباد

محبت ہار کے جینا بہت دشوار ہوتا ہے
اسے بس اتنا کہہ دینا بھرم توڑا نہیں کرتے

ماریہ نذیر ________ بھاگٹانوالہ

زوال یہ ہے کہ تیرے ساتھ نہیں
کمال یہ کہ جی رہے ہیں ہم

عابدہ نشاط ________ کراچی

تم نے تو کہہ دیا کہ محبت نہیں ملی
ہم کو یہ بھی کہنے کی مہلت نہیں ملی
پھر اختلاف رائے کی صورت نکل پڑی
اپنی یہاں کسی سے بھی عادت نہیں ملی

آسیہ جاوید ________ علی پور چٹھہ

وہ تجھ کو بھولے ہیں تو تجھ پہ بھی لازم ہے میر
خاک ڈال آگ لگا، نام نہ لے یاد نہ کر

عائزہ سلیم ________ کے وقتی لشکا

آنکھیں جلائے بھی اور ہی آشنا
مجھے اتنا بھی بد گمان ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی
مجھے زندگی کا شعور ہے

شاداں منظر ________ گوجرانوالہ

ہم فرشتے کے شوقین زیادہ تو نہیں لیکن
کچھ خواب نہ دیکھیں تو گزارا نہیں ہوتا

نادیہ فیصل ________ گجرات

قیام فراق اب نہ پوچھ آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب تیرا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

عائشہ شکیل ________ نامعلوم

میری نسبت کو تو نہ پوچھ
میں تو خود ہی اک راز ہوں
مجھ پر تو عیاں نہ ہو اس طرح
میں تو اک پنہاں پڑا ہوا ہوں

عظمیٰ عباسی ________ حویلیاں

بھراؤ نظر میں، بچھڑ اور دامن، بدل کر رستہ بڑھا کرو انجمن
نہیں دعاؤں سے جو پھر بھی میں نے پالیا تو کیا کرو گے

فرحانہ مہناز ________ گوجرہ

خموشی میں خاموش صدائیں کیسی تھیں
ٹوٹ رہے تھے ہاتھ دعائیں کیسی تھیں

بریرہ مشتاق ________ کوٹ نجیب اللہ

یہ ٹوٹے کھائے کو ٹوٹتا ہے مجھ سے
ہم دل کی تباہی کا سبب ڈھونڈ رہے تھے

رابعہ نشاط ________ فاروق آباد

ہم بھی ہیں ایک اجڑے ہوئے شہر کی مثال
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ویران ہم بھی ہیں

دلآویز سہیل ________ اوچ شریف

چلے تھے اور کسی راستے کی دھن میں مگر
ہم اتفاق سے تیری گلی میں آ نکلے

فائزہ بھٹی ________ پتوکی

میری بے بسی کی کتاب کا کوئی ورق تو نے پڑھا نہیں
تجھے کیا خبر کہاں کھو گئیں میری خواہشیں تیرے شہر میں

واصفہ سہیل

خواہش

گزشتہ دنوں اداکارہ میرا دبئی کے ایک اسپتال میں زیر علاج رہیں۔ ان کو معدے میں تکلیف کی شکایت تھی۔ ڈاکٹر نے میرا کے خون کے مختلف ٹیسٹ کیے ہیں اور انہیں آپریشن کا مشورہ دیا ہے۔ میرا چند دن پہلے ہی امریکا سے واپس آئی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ درد تو کئی دن سے محسوس کر رہی تھیں لیکن مصروفیت (مصروفیت! کیسی مصروفیت بھئی؟) کے باعث اپنی بیماری پر توجہ نہیں دے سکیں۔ ایک جگہ انٹرویو دیتے ہوئے میرا نے کہا کہ کیریر کے آغاز میں ریما اور صائمہ نے انہیں بہت پریشان کیا (کیسے؟ بھئی پریشان کیا) اور ان کے ساتھ میں نے مشکل وقت گزارا (اور انہوں نے؟) ایوارڈ کے بارے میں میرا کا کہنا ہے کہ میرے لیے اب صرف میرا کام اہم ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ایسے کردار ادا کروں جو دنیا بھر میں پسند کیے جائیں (مثلاً کیسے؟) لیکن یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگ آپ کے کام کو اس وقت پسند کرتے ہیں جب آپ مرجاتے ہیں (کبھی کبھی تو جب بھی نہیں کرتے) اس وقت انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے انڈسٹری کے لیے کتنا کام کیا ہے۔''

پسند

اداکارہ صبا قمر نے ماڈلنگ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اور محنت کرکے (کیا واقعی؟) بڑی اسکرین تک پہنچیں۔ صبا قمر کا کہنا ہے کہ ''میرے پرستاروں نے مجھے ہر کردار میں پسند کیا جس سے مجھے مزید بہتر کام کرنے کا حوصلہ ملا۔ میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں اللہ بہت جلد شہرت اور عزت سے نوازتا ہے (اور یہ ــــ؟) اور میں اس پر اس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔

www.pklibrary.com

اپنی پسند کے بارے میں صبا قمر نے کہا کہ مجھے — مزاحیہ کردار بہت پسند ہیں اور میں انہیں اپنی شخصیت کے قریب سمجھتی ہوں (اور سنجیدہ کردار ......؟) لیکن کسی پروجیکٹ میں ملنے والے کردار کو اس کی ڈیمانڈ کے مطابق ادا کرنا پڑتا ہے (ورنہ ......؟ بھی کردار نہیں ملتے پھر)

آج کل صبا قمر کو مزاحیہ کردار نہیں مل رہے بلکہ انہیں سنجیدہ ڈراموں میں کاسٹ کیا جا رہا ہے (ویسے ہمارے یہاں مزاحیہ ڈرامے بنتے کب ہیں......؟)

خمیازہ

جو لوگ اپنی دھرتی کی عزت نہیں کرتے اور اپنے ملک سے نام کما کر بھی پیسے کی ہوس میں کسی دوسرے بلکہ دشمن ملک کی شہریت حاصل کرتے ہیں وہ کبھی نہ کبھی اس کا خمیازہ بھی بھگتتے ہیں۔ عدنان سمیع خان کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بھارت جا کر پاکستان کی برائیاں کر کے انڈین شہریت حاصل کی۔ اب عدنان سمیع پر ممبئی میں آٹھ فلیٹ خریدنے پر پچاس لاکھ بھارتی روپیہ کا جرمانہ عائد کیا گیا ہے (ملے بھی ملے) بھارتی قانون کے مطابق کسی غیر ملکی کو بھارت میں جائیداد حاصل کرنے کے لیے ان کے ایک ادارے سے اجازت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ عدنان نے یہ فلیٹس شہریت ملنے سے پہلے خریدے تھے۔ یہ بھارت میں کمائی گئی رقم سے ہی خریدے گئے تھے جن کا عدنان انکم ٹیکس ادا کر چکے تھے (آ گیا گھر کے کہنا ہے کیا؟ بھی ...... کیا ہو گیا؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ ...... پاکستان ...... قمر کے ...... ہونے ...... ایل جی معاہدے ...... تو دور ...... کے ساتھ کیے گئے ایل این جی معاہدے کی وجہ سے گیس سے بجلی پیدا کرنے کی وجہ سے پاکستان کو سالانہ 150 سے 250 ارب روپے کی بچت ہو گی۔ دیگر فوائد الگ ہیں۔ یہی نہیں کہ ٹیب کو اس معاہدے سے کچھ نہیں ملا۔ بلکہ حال ہی میڈیا نے یہ خبر دی ہے کہ اس پروجیکٹ کو سیاست کی نذر کرنے پر قطر حکومت عمران خان حکومت سے ناراض ہے۔ قطر کی وزارت توانائی کے چیف ایگزیکٹیو سعد الکعبی نے صرف چار گھنٹے کے لیے پاکستان کا دورہ کیا اور وزیراعظم عمران خان سے کہا۔

”این ایل جی چاہیے تو ٹھیک بصورت دیگر اسی ٹھیکہ کو منسوخ کر دیں۔ ہمارا نام اپنی سیاسی کیچڑ میں نہ گھسیٹیں، پھر دیکھتا ہوں آپ کو کون این ایل جی فروخت کرتا ہے۔“ (انصار عباسی کی رپورٹ)

☆ یہی چند وانے جو کاندھوں پر بٹھائے جانے کے مستحق ہیں لیکن افسوس ملک ایسے لوگوں کے پنجے میں آ گیا ہے جو بے شرم اور بے وفا لوگوں کو نوازتے ہیں اور بہادری اور اپنی قیادت سے وفاداری ان کے نزدیک ناقابل تلافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ پشتو میں کسی کی بہادری اور وفاداری کی تعریف کرنا ہو تو کہا جاتا ہے کہ فلاں نر کا بچہ ہے۔ آج شاہد خاقان عباسی نے ہمیں یہ کہنے پر مجبور کیا کہ وہ ہیں بہر حال نر کا بچہ۔

(سلیم صافی ...... جرگہ)

بقیہ خط آپ کے

ہے ہمارے معاشرے میں۔ ''عورت نامہ'' بہت اچھی رہی، واقعی عورت کی قربانیاں ساری عمر بھی دیتی رہے تو کم نہیں اور کوئی ستائش نہیں۔

''اسیر عشق'' مکمل ناول بہت زبردست رہا۔ اینڈ بھی اچھا تھا۔ ''اک دیا رہنے دیا'' بہت زبردست جارہا ہے، دیکھیں اینڈ کیا ہوتا ہے۔ ''ہم بے چارے'' پڑھ کر مزہ نہیں آیا۔ ''آپ کے ہم بچھڑے'' بہت اچھا ناولٹ تھا۔ بہت اچھا لگا۔ ''شکست فاش'' بہت اچھا رہا۔ فوزیہ نے اپنے شوہر کو سبق سکھایا۔ ''دل میں رکھ لینا'' بھی پسند نہیں آیا، عجیب الجھا ہوا سا تھا، پڑھ کر کچھ نہیں ملا۔ ''شام کی حویلی'' میں زبردست جارہا ہے۔ اللہ پاک حرا ملک وہاڑی کے والدین کی مغفرت فرمائے، آمین۔

☆ پیاری خدیجہ! آپ کے والد کی وفات کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ اچانک موت کا صدمہ زیادہ ہوتا ہے پھر والد کی وفات بلاشبہ بہت بڑا دکھ ہے۔ والدین کی کمی کوئی پوری نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔

معذرت خواہ ہیں کہ آپ کا خط اور سروے دونوں ہی شامل نہ ہوسکے۔ آئندہ سروے میں آپ کا نام سرفہرست رکھیں گے۔ ان شاءاللہ

تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

بشریٰ رضوان، شاہدرہ بہاول پور سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ہر ماہ شعاع کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ اسکول لائف سے شعاع پڑھنا شروع کیا جب میں خود طالبہ تھی اور اب جب میں خود پڑھاتی ہوں اب بھی پڑھتی ہوں، نہایت سبق آموز کہانیاں ہوتی ہیں۔ زندگی میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

☆ پیاری بشریٰ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ شعاع کی دیرینہ قاری ہیں۔ آپ کا اور شعاع کا اتنا طویل ساتھ ہے۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ شعاع کی کامیابی میں آپ اور آپ جیسی بہت سی قارئین کا بڑا حصہ ہے۔ یہ شعاع کے لیے آپ کی پسندیدگی اور پذیرائی ہی ہے جس کی بنا پر اس کا شمار مقبول ترین پرچوں میں ہوتا ہے۔ بہت شکریہ

سعدیہ خان نے چوک شاہدرہ بہاول پور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ہم نے 2008ء سے شعاع اور خواتین پڑھنا شروع کیا اور اب تک پڑھ رہے ہیں۔ آسیہ رزاقی کی وفات کا بہت دکھ ہوا، جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ شعاع اور خواتین وہ ڈائجسٹ ہیں جن سے ہمیں بہت سبق آموز کہانیاں ملتی ہیں اور اس سے ہمیں نیا سبق ملتا ہے جس سے عملی زندگی گزارنے میں بہت آسانی ہوجاتی ہے۔ ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' لازمی پڑھتی ہوں پھر ''تاریخ کے جھروکوں سے'' لے کر مسکرائیں اور باتوں سے خوشبو آئے۔ اس کے بعد افسانے اور ناولٹ، ناول ''شام کی حویلی'' پڑھتی ہوں۔ ہر لفظ پر دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔ رخسانہ جی پلیز کشف پر تھوڑا رحم کریں، اسے اس کے بابا سے ملادیں، اس کے بعد ''شہر تمنا'' بھی بہت اچھا ناول ہے لیکن اس میں الجھنیں بہت ہیں، پلیز جلدی سلجھادیں۔ ''اک دیا رہنے دیا'' بہت اچھا ناول ہے۔ نگہت جی آپ وطن سے محبت کا حق ادا کررہی ہیں۔ میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور تاحیات کرتی رہوں گی جنہوں نے اپنی جان اور مال کی قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا اور میں ان بہنوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جو لکھ کر ہمیں اپنے لفظوں سے احساس دلاتی ہیں کہ یہ ملک ہمیں تھالی میں رکھ کر نہیں ملا، اس کے لیے ہم نے قربانیاں دی ہیں۔

☆ پیاری سعدیہ! شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔ 2008ء سے شعاع کی قاری ہیں تو پہلے خط کیوں نہیں لکھا۔ آپ لوگوں کے خطوط سے ہمیں نہ صرف آپ کی رائے سے آگاہی ملتی ہیں بلکہ ایک محبت

اور اپنائیت کا احساس بھی ملتا ہے۔

بلاشبہ آزادی اور اپنا وطن بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ شروع میں ہی ملک میں جمہوری روایات پروان نہ چڑھ سکیں اور عوام کا وطن سے تعلق مضبوط بنیادوں پر استوار نہ ہو سکا۔ پھر وطن کا آدھا حصہ ہم سے جدا ہو گیا اور اس وقت تو حالات بہت ہی دگرگوں ہیں۔ چاروں طرف سے ہمیں چیلنج کا سامنا ہے اور حکومت حالات کے سامنے بے بس نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے، آمین۔

صبا انصاری اور ثنا انصاری ضلع لودھراں سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

چار سال سے شعاع باقاعدہ خریدنا شروع کیا۔ اگرچہ پرانے شمارے کافی پڑھے۔ مکمل ناول ''حاصل زندگی'' اچھا لگا۔ عمدہ تحریر تھی۔ رابعہ حسین نئی رائٹر ہیں شاید۔ افسانوں میں ''یار دلدار'' کو بہت مس کیا۔ سلسلہ وار ناول ''شام کی حویلی میں'' بے حد پسند آرہا ہے۔ میں شعاع کا ہر سلسلہ پڑھتی ہوں۔ خصوصاً ''خط آپ کے'' شاہین رشید سے سمیرا حمید کے انٹرویو کی فرمائش ہے۔

ج: صبا اور ثنا......! آپ اب شعاع کی باقاعدہ قاری ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ سمیرا حمید کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ اگر انہوں نے انٹرویو دیا تو ضرور شامل کریں گے۔

حسنیٰ اقبال نے منڈی فیض آباد سے شرکت کی ہے،

لکھتی ہیں

ہم آپ سے سخت ناراض ہیں کوئی ایسا بھی کرتا ہے سات ماہ ہو گئے ہم آپ کو خط لکھ رہے ہیں آپ نے ان سات ماہ میں ایک بار بھی خط یا کوئی اور چیز شائع نہیں کی۔

ہمیشہ کی طرح سارا کا سارا شعاع بہت اچھا تھا اس دفعہ 5 تاریخ کو ہی شعاع مل گیا ٹائٹل بھی پیاری لگ رہی ہے میچنگ ہر کسی پر بہت اچھا لگتا ہے۔ ہر کہانی ہر سلسلہ بہت اچھا ہے۔

ایک خاص بات اس ماہ اکتوبر میں فوزیہ ثمر بٹ کی سالگرہ ہے اگر آپ اس کو میری طرف سے وش کر دیں گی تو ہمارا دل اور ہم بہت خوش ہو جائیں گے۔ فوزیہ میری سب سے پیاری دوست سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔

ج: حسنیٰ! ہم اپنی پیاری قاری بہن کے لیے دل کیسے اتنا سخت کر سکتے ہیں کہ سات ماہ میں ایک بھی خط شائع نہ کریں۔ آپ کی غلطی کوئی نہیں ہے۔

آپ کے خط ہمیں موصول نہیں ہوئے یہ ممکن نہیں کہ آپ سات خط لکھیں اور ایک بھی خط شائع نہ ہو۔ آپ کی محبتوں کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں اور یقین کریں کہ ہم بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔

فائزہ بھٹی پتوکی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

7 تاریخ کو ابو شہر گئے تو واپسی پر شعاع اور خواتین لے کر آئے۔

شعاع کا ٹائٹل بحال ہے جو ذرا بھی اچھا لگا ہو...... میک اپ تو اناڑی آرٹسٹ کا کمال لگتا تھا۔

فہرست اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پہلی شعاع میں مدیرہ جی پاکستان کے حالات پر تبصرہ کرتی نظر آئیں۔

حمد و نعت اور احادیث کے بعد سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے ''خط آپ کے'' پر ڈیرہ ڈالا۔

زیادہ تر نئے لوگ دکھائی دیے۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ اب آتی جاتی رہنا تم لوگ۔ کنزیٰ اختر بہاول پور مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کو ٹرین میں بیٹھ کر میرا گھر نظر نہیں آئے گا۔ میرا گھر ٹرین کے راستے سے بہت دور ہے۔ آپ ٹرین میں بیٹھ کر شمال کی طرف دیکھ کر سلام دینا ان شاء اللہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔

خوش رہو آباد رہو مجھے خوشی ہوئی تم نے میرا گھر تلاش کرنے کی کوشش تو کی۔

''شام کی حویلی'' کشف ڈیئر مجھے تمہارے حالات پر دکھ ہے۔ ''شہر تمنا'' نائلہ مجھے افسوس ہے تم کھرے اور کھوٹے میں پہچان نہیں کر پائیں۔

''اک دیا رہنے دیا'' نگہت سیما آپ کا انداز نرالا ہے۔

''اسیر عشق'' تیمور محبت میں شرائط نہیں ہوا کرتیں۔ ام رباب اور عون تمہاری جوڑی اچھی لگی مجھے۔ مگر کیا ہی

اچھا ہوتا۔ اگر سرزا کا وورانیہ درمیان میں آتا۔

"اب کے ہم بچھڑے تو" ورشن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم ہی انصر کی محبت ہو۔ میں واقعی میں حیران رہ گئی۔

"دل میں رکھ لینا" سدرۃ المنتہیٰ کا نام بھی ان ناموں میں شامل ہے جن کو پڑھ کر یقین ہوتا ہے کہ ہم بور نہیں ہوں گے۔

عافیہ جہبیں اور سالک صاحب کو دیکھ کر، پڑھ کر رائٹرز سے ملنے کی حسرت نئے سرے سے جاگ اٹھی۔ رائٹرز سے ملنے، ان سے بات کرنے کا خواب میرا بھی بہت پرانا ہے۔

ج: فائزہ! آپ ہم سے ملنے آئیں، ہمیں خوشی ہوگی۔ عمیرہ احمد اور سمیرا حمید کراچی میں نہیں رہتیں۔ لاہور میں رہتی ہیں۔

شہرین نے چوک شاہدرہ بہاول پور سے لکھا ہے

بہت عرصہ ہو گیا شعاع کا مطالعہ کرتے ہوئے مگر لیٹر فرسٹ ٹائم لکھا ہے بہت کچھ سیکھنے کو ملا شعاع سے۔ اب بات ہو جائے ٹائٹل کی تو بس ٹھیک تھا ماڈل کی چوڑیاں بہت پسند آئیں آسیہ رزاقی صاحبہ کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ نعیمہ ناز کی کا شہر تمنا فاسٹ جا رہا ہے۔ رخسانہ نگار عدنان صاحبہ شام کی حویلی بہت اچھا ناول ہے باقی مکمل ناولز میں مدیحہ سعید کا ناول امیر عشق نے ہمیں اپنا اسیر کر لیا۔ اتنی زبردست شاعری کمال کے ڈائیلاگ تھے اس کے علاوہ تمام ناولٹ افسانے بیسٹ تھے افسانوں میں یار دل دار، اور عورت نامہ بہت پسند آئے۔

ج: پیاری شہرین! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔

ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔ اب ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

ماریہ نذیر بھاگٹانوالہ سے لکھتی ہیں

شعاع ستمبر 2019ء کا شمارہ 5 ستمبر کو ملا۔ ٹائٹل اک دم لاجواب۔ ماڈل کے بالوں کے سوا سب کچھ پرفیکٹ تھا۔ چوڑیاں تو مجھے ہی لے دیں رفیہ آنی اس سے (ہاہاہا) "پہلی شعاع" کشمیر کے حالات کے بارے میں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کشمیریوں پر مظالم پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ حمد اور نعت ہمیشہ کی طرح بہت اعلا۔

"پیارے نبی کی پیاری باتیں" اعلیٰ ترین سلسلہ ہے۔ ادارے کا تہہ دل سے شکریہ اس سلسلے کے لیے۔ "دستک" حرا مانی اور شاہ جاوید کو سرسری سا دیکھا۔ دونوں ہی پسند نہیں آئیں (معذرت)۔ صبیحہ ہاشمی سے ملاقات سو سو رہی "جب تجھ سے ناتا جوڑا" اللہ سے دعا ہے "ح سکین" کو صبر اور تحمل دے (آمین) اور دوسری بہن کو بھی خوش رکھے۔ (آمین)

"خط آپ کے" سب کے تبصرے بھرپور تھے۔ حرا ملک بہت مبارک ہو۔ میرا خط شامل نہیں ہوا تھا۔ میرے بھانجے نے پوسٹ کرنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ شامی (شاہ میر، میرا بھانجا)

"شہر تمنا" قسط اچھی تھی، ذرا جلدی سے گتھیاں سلجھا دیں۔ پلیز دوسرا قسط وار ناول "شام کی حویلی میں" ناول بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے زینب اور منصور کے درمیان کیا ہوا تھا۔

"اے ہمدم دیرینہ" ثمرین اعجاز کا افسانہ اچھا لگا۔

"عورت نامہ" نزہت جبیں ضیاء کا افسانہ ٹاپ پر رہا۔ مکمل ناول "امیر عشق" میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو یہی موضوع پر مشتمل ناول پہلے بھی پڑھ چکی ہوں۔ مدیحہ سعید شاعری لاجواب تھی۔ سب سے اچھا کردار تیمور ملک کا تھا۔ بے انتہا محبت کرنے والا شخص۔ "اک دیا جلے بجھے" تبصرہ مکمل ہونے پر۔

"ہم بے چارے" تو شاہ بز عزت والی۔ ہلکا پھلکا افسانہ دل کو چھو گیا۔ "اب کے ہم بچھڑے ہیں" فرح بخاری کا نام ہی کافی ہے۔ "بن پا کھی" ابھی تک یاد ہے۔

"شکست فاش" حنا بشریٰ کا افسانہ ٹاپ آف دی لسٹ رہا۔ "دل میں رکھ لینا سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول ابھی نہیں پڑھا۔ اس پر تبصرہ ادھار۔ ادھار آدھا چکا دیتی ہوں اور آدھا ادھار اکتوبر میں چکا دوں گی (ہاہاہا) تو جناب بات یہ ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کے ناول پہلے بھی پڑھے ہیں۔ یہ ناول بھی دوسروں کی طرح بہت اچھا ہوگا۔ سمیرا حمید اور فرزانہ کھرل سے کچھ لکھوائیں پلیز۔ دو تین ماہ سے دونوں

نے کچھ نہیں لکھا۔

ج: پیاری ماریہ......! شاہ میر کی سستی کی وجہ سے آپ پچھلے ماہ شرکت نہ کرسکیں۔ اس میں شاہ میر کی غلطی نہیں ہے اگر آپ خط کے ساتھ اسے بھی پڑھوا دیتیں یا چیک کرلیتیں تو وہ بھی سستی نہ کرتا۔ تو ثابت ہوا غلطی آپ کی ہے۔

تسنیم کوثر کراچی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ستمبر کا شعاع پڑھ کر ایک خوش گوار سا احساس ہوا ماشاء اللہ تقریباً زیادہ تر ناول اور افسانے بہت بہت عمدہ رہے۔ لگتا ہے ہمارا شعاع خوب صورتی سے نکھر رہا ہے ناولز کی بات کریں تو نگہت سیما اک دیا رہ گیا بے مثال اور لاجواب لکھ رہی ہیں اسی طرح مدیحہ عبید نے امیر عشق نہایت دلکش اور خوب صورت سی اسٹوری رقم کی پڑھ کر دل خوش ہوگیا اور جناب فرح بخاری نے بھی اب کے ہم بچھڑے تو غضب کا کمال کمال کا لکھا ہے افسانوں میں عنبرین اعجاز کا اے ہمدم دیرینہ نے بہت لطف دیا۔ نزہت جبیں ضیاء کے عورت نامہ نے دل دکھا دیا۔ بھئی ہم بے چارے تو شاید زینت نے تو کھلکھلا دیا بڑا مزہ آیا ہے ان کی پرلطف کہانی پڑھ کر۔ نفیسہ ناز شمیم تمنا بہت اچھا لکھ رہی ہیں مگر کردار زیادہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ اور شام کی حویلی بھی رخسانہ نگار عدنان بہت جم کر لکھ رہی ہیں دل لگتا ہے ان کے ناول میں۔ ایک بات یہ کہ دل چاہتا ہے کہ ہم بھی کھلا کسی پہ کیوں یہ میرے دل کا معاملہ کی حسین بزم میں شرکت کریں۔ معذرت کے ساتھ یار دلدار میں دلچسپی ختم ہوتی جارہی ہے۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ عمدہ سلسلہ ہے مگر خواتین پر ظلم و ستم۔

ج: پیاری تسنیم! محفل کو رونق بخشنے کا شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کھلا کسی پہ کیوں سلسلے میں ضرور شامل ہوں اور ہمیں اچھے اشعار انتخاب کرکے بھجوائیں۔

عروسہ شہزاد فتح نے کالا گوجراں جہلم سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

1982ء سے 2019 تک میں اور ”شعاع“ ساتھ ساتھ ہیں۔ اور آج میں تو شعاع سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ میں نے بہت کچھ نہیں بلکہ سارے کا سارا شعاع کو با مقصد پایا۔ ساری تہذیب و تمیز شعاع سے حاصل کی اور الحمدللہ گھر کا ماحول بھی ادبی اور پڑھا لکھا ملا ہم سب بہن بھائیوں، کزنز کو کبھی بھی رسائل پڑھنے سے منع نہیں کیا کسی بھی بڑے نے ہمیشہ بچوں کی دنیا، پھول کلیاں، جیسے رسائل لا کر دیے پھر زیب النساء حور اور ناول بھی پڑھنے کی اجازت تھی۔ بعدازاں، شعاع، کرن اور خواتین ڈائجسٹ ذوق و شوق سے پڑھے اور کزنز نے خوب شیئر کیے۔ میرے لیے ماضی، حال اور مستقبل کا ہر رائٹر قابل قدر و احترام ہے۔ مجھے حرفوں، لفظوں سے پیار ہے یہی وجہ ہے۔ یہ میرا خط ”شعاع“ سے تجدید وفا ہے۔

تحریروں کے معاملے میں معیار برقرار رکھنے پر تمام اسٹاف کو خراج تحسین۔

پیاری عروسہ! ایک طویل مدت بعد آپ کا خط ملا تو ایسی خوشی ہوئی جیسے مدتوں پرانا کوئی بچھڑا ہوا دوست مل جائے۔ بہت شکریہ کہ آپ نے ہم کو یاد کیا اور ممنون تو ہم شعاع سے آپ کی محبت کے لیے بھی ہیں۔ اتنا طویل ساتھ کوئی محبت کرنے والا ہی نبھا سکتا ہے۔ اب دوبارہ خاموش نہ ہو جائیے گا۔ خط کے ساتھ ساتھ شعاع کے دیگر سلسلوں میں بھی شرکت کیجیے گا۔

نورین نے بنوں کے پی کے سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ڈائجسٹ ہاتھ میں لیتے ہی میں سب سے پہلے ”باتوں سے خوشبو آئے“ پڑھتی ہوں مطلب میں ڈائجسٹ حضورﷺ کی حدیث سے شروع کرتی ہوں۔ کچھ سلسلے میں صرف سرسری دیکھتی ہوں جیسے انٹرویو اور اشعار وغیرہ۔

کہانی شمیم تمنا مجھے کچھ خاص پسند نہیں کیونکہ ابھی تک اس میں کچھ واضح ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اتنی اقساط پڑھ کر کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ پلیز نفیسہ ناز جی مائنڈ نہ کریں۔

”شام کی حویلی“ میں بھی سب کچھ واضح ہوگیا ہے اب پڑھ کر مزا آتا ہے۔

مکمل ناول ”امیر عشق“ اچھا تھا۔ فرح بخاری صاحبہ کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔

"تاریخ کے جھروکوں سے" پڑھ کر گھر بیٹھے ہم بہت سی چیزوں کے بارے میں جان جاتے ہیں۔
پیاری نورین! شعاع آپ کو پسند آیا۔ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر۔ آپ نے تبصرہ بھی بہت اچھا کیا ہے۔ شرکت کرتی رہیے گا۔

الف انا واہوا تحصیل تونسہ شریف سے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے میں اپنا تعارف کرواتی چلوں میرا نام فرح انا ہے لیکن لکھتی الف انا کے نام سے ہوں۔ خواتین و شعاع کی بہت بہت پرانی قاری ہوں گھر میں بابا جانی تمام ڈائجسٹ پڑھتے تھے سو ہم بھی شروع ہو گئے روک ٹوک کوئی نہیں تھی پھر بیچ میں کچھ سالوں تک دوری رہی (ڈائجسٹ سے بھی) اب تقریباً آٹھ سال سے خواتین کی باقاعدہ خریدار ہوں (سالانہ)۔ پلیز آپ جواب ضرور دینا۔ کیا میری کہانی شائع ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اصل میں آپی یہ گاؤں ہے یہاں پردہ کرتے ہیں اس لیے پوسٹ کا مسئلہ ہوتا ہے۔ آپی آج گرمی بہت زیادہ ہے بارہ بج چکے ہیں دن کے میں ابھی روٹی بنا کر آئی ہوں املی بھگو دی ہے، ابھی سب کچھ دیر میں آ جائیں گے پھر ٹھنڈا ٹھنڈا املی کا شربت پی کر نماز کے لیے چلے جائیں گے جب تک میں سلاد چٹنی بنا کر دستر خوان لگا دوں گی ڈیڑھ بجے ہم لوگ کھانا کھاتے ہیں کیونکہ یہ کراچی نہیں گاؤں ہے۔ یہاں ہم ساڑھے چھ بجے تک ناشتہ کر لیتے ہیں پچھلی شعاع میں آپ نے پاکستانی سیاسی قوتوں کو کشمیر کے لیے آواز اٹھانے کا مشورہ دیا ہے تو میں آپ کو بتاتی چلوں یہاں تو اپنے وطن والوں کو کوئی نہیں پوچھتا آپ کو پتا ہے ہمارا شہر وزیر اعلیٰ پنجاب کے آبائی علاقہ سے کوئی 60 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور یہاں پینے کا پانی دو دو ماہ بعد آتا ہے۔ ویسے آپ کو سچی بات بتاؤں شہباز شریف کے دور میں بجلی اور پانی کا نظام اس سے بہتر تھا۔ پندرہ بیس دنوں بعد نلکا آ جاتا تھا اور بجلی کی وولٹیج بھی پوری تھی۔

اقرار طارق، دعا اور سندس بخاری کے خط اچھے تھے۔ دل آویز سیال کا خط بھی اچھا تھا ویسے میرے بھانجے کا نام بھی آویز ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ میرے سامنے ہیں اور میں بول رہی ہوں اور آپ مسکراتے ہوئے توجہ سے سن رہی ہیں۔ اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ میرا خط پڑھتی بھی ہیں یا سیدھا...
پیاری فرح! جب اتنا باحتی اور خوب صورت نام ہے آپ کا تو الف انا کے نام سے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کا خط ہم نے ردی میں نہیں ڈالا۔ مسکراتے ہوئے پڑھا اور اب شائع بھی کر رہے ہیں۔ آپ کی کہانیاں مل گئی ہیں۔ ابھی پڑھی نہیں گئیں۔

ایمن فاطمہ اور مریم عطاء اللہ نے بحریہ ٹاؤن لاہور سے لکھا ہے

سب سے پہلے حمد و نعت سے دل منور کیا۔ پھر سیدھی چھلانگ لگائی (اک دیا رہنے دیا) کی طرف اف آپی اور کتنا برا ہو گا عروج کے ساتھ؟ (یار دل دار) اس بار عادل کے ساتھ کچھ زیادہ ہی برا ہو گیا۔ (اسیر عشق) اچھی کہانی تھی۔ (ہم بے چارے) دونوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے (اب کے ہم بچھڑے تو) بس ٹھیک تھی۔ (شکست فاش) واہ کیا ذہن پایا تھا فوزیہ نے۔ ویلڈن (دل میں رکھ لینا) سر کے اوپر سے گزر گئی۔ (شام کی حویلی میں) ناول اس بار کچھ الجھا الجھا سا تھا۔
(تاریخ کے جھروکوں سے) اچھا معلوماتی سلسلہ ہے۔ آخر میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ اگر آسیہ رزاقی کی کوئی تحریر ہو تو ضرور شائع کیجیے گا۔
ایمن اور مریم! آسیہ رزاقی کی تو بہت پیاری تحریریں ہیں ہم اور ضرور شائع کریں گے۔ خط اور تفصیلی تبصرہ کے لیے شکریہ۔

کومل یٰسین نے سمندری فیصل آباد سے لکھا ہے

ہم سب مکمل شعاع بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ امی کی ڈانٹ کے باوجود ہم شعاع کو لازمی پڑھتے ہیں۔ میں پہلی دفعہ شعاع کا حصہ بن رہی ہوں۔ مکمل ناول "اک دیا رہنے دیا" "شہر تمنا اور ایک بیانیہ پر" بھی بہت اچھے لگے۔

★ پیاری کومل! کہانی ضرور لکھیں لیکن شاعری رہنے دیں۔ شاعری کے لیے ابھی آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ، ماشیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات سے

www.pklibrary.com

شریکِ محفل ہیں لکھا ہے

جدائیاں تو مقدر ہیں لیکن اے غم ہجراں
عجیب بھول سے ساتھی بچھڑ گئے اب کے

آسیہ رزاقی صاحبہ اور حیا بخاری صاحبہ کا دلی افسوس ہے۔ شعاع کے آسمان کے دو ستارے تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ پہلی شعاع ہمیشہ کی طرح ہر موضوع اچھوتا ہوتا ہے۔ شعاع کے ناولز کی طرف آتے ہیں۔

شہر تمنا بیسٹ جا رہا ہے۔ چنبیلی، طلال کی اسٹوری جلدی سامنے لائیں۔ نائلہ نے خود کو کھائی میں گرا لیا ہے۔ پلیز عائشہ کے ساتھ کچھ برا نہ کریں۔ خالہ مجھے کچھ مشکوک لگ رہی ہیں۔ بہرحال اس ناول نے اپنے سحر میں جکڑ ہوا ہے۔

شام کی حویلی میں آذر نے تو کمینگی کی حد ہی کر دی۔ ثمینہ جیسے کردار بہت اذیت ناک ہوتے ہیں ایسا کردار میں نے لائیو بھگتا ہے۔

اک دیا رہنے دیا۔ کیا لکھ دیا ہے۔ نگہت جی۔ میرے ابو جی نے خود اڑھائی سال انڈیا میں قید کاٹی ہے شادی سے پہلے جنگیں لڑی تھیں۔ غازی تھے، وہ کہتے ہیں ہندو درندے تھے ایسی ایسی سزائیں دیتے ہیں کہ لگتا ہے اب جان نکلی۔ میری دوست فرح نعیم پہلوان کی بیٹی کا نام نور فاطمہ ہے۔ اس کا پہلا بیٹا کیم اکتوبر اور نور فاطمہ 9 اکتوبر کی پیدائش ہے۔ خوش ہوتے ہیں خالہ ہم آپ کے برتھ ڈے والے مہینے میں پیدا ہونے یا آپ ہمارے والے۔

اسیر عشق، اس تحریر نے تو ہمیں بھی اپنا اسیر بنا لیا۔ شاعری کیا موقع کی مناسب سے کی گئی تھی۔

دل میں رکھ لیتا سدرۃ المنتہیٰ کی بڑی پیچیدہ اور سنجیدہ سی تحریر تھی۔ پلے کچھ نہیں پڑا میرے۔ تحریر کا اسٹائل اچھا تھا۔

حاضری کیا غضب کی تحریر۔
ہم بیچارے چھوٹی تحریر کی پہ ہے حرے کی تھی۔

شعاع کے باقی سلسلے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ خط [illegible] کیری اختر کے خط سے میرا

خون بڑھا۔ چلو جی ہم بھی کسی کی یادوں میں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ اس بار کیری اختر صاحب جب گجرات سے گزریں تو ریلوے اسٹیشن سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہمارا گھر ہے۔ موسٹ ویلکم

شاعری کچھ ماہ سے اچھی لگ رہی ہے۔ آئینہ خانے مسالے دار چٹخارے والی چیزیں ہیں۔ منیب بٹ تیری خیر ہوئے۔ خیر بٹ ایسی قوم ہے اس سے بھی بھی کسی بھی بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ بقول کی لقمان کے چاچا بٹ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ حلیم میں باجرہ ڈال کر بھی پکا سکتے ہیں۔ خوبصورت بچے عارف لوہار صاحب فرماتے ہیں جوانی جتھوں نہیں آنی بے لاکھ خوراکاں کھائیے۔ میں نے تو آج تک کسی بوڑھے کو جوان اور سفید بالوں کو کالا ہوتا نہیں دیکھا، ہاں خون سفید ہوتے بڑی دفعہ دیکھا ہے۔

پیاری فوزیہ! سالگرہ مبارک ہو آپ...... دعا گو ہیں کہ آپ کی زندگی کے سارے سال خوش گوار اور خوش و خرم گزریں۔ یہ بٹ والی بات آپ نے خوب لکھی۔ یعنی ہم توقع رکھیں کہ فوزیہ بی بی کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ فوزیہ آپ سب کچھ کیجیے گا مگر لڑائی جھگڑا نہ کیجیے گا۔ ہمیں لڑائی سے بہت ڈر لگتا ہے۔

بارہ برجوں پر مکمل کتاب

آپ کا بُرج

مصنف:
کیرو

قیمت
-/150 روپے

منگوانے اور حق خریدنے کا پتہ
مکتبہ و عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

خوب صورت جملے میں جوانی واپس آنے کی بات نہیں کی، بڑھاپا روکنے کی بات کی ہے۔ جو چیز چلی جائے وہ تو واپس مشکل سے ہی آتی ہے۔

بشریٰ صدیق عطاریہ نے چیچہ وطنی سے لکھا ہے

پچھلے پورے سال سے ایک بات بہت شدت سے نوٹ کی ہے کہ ہماری معزز رائٹرز نے لفظ (عمدہ، شاندار) بہت اچھا اور زبردست کی جگہ بڑھیا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے یہ لفظ جس تحریر میں آجائے میرے لیے وہ تحریر بدمزہ اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

بات کچھ اس ماہ کے شعاع کی۔ پہلی شعاع پڑھی، لفظ کشمیر پڑھ کر ہی دل دکھی اور اداس ہو گیا۔ پچھلے پورے سال میں ایسی ایسی غیر دلچسپ تحاریر شائع ہوئیں کہ خطوط میں ان کے بارے میں پڑھ کر ذہن پہ زور ڈالنے کے باوجود یاد نہ آسکا کہ کس تحریر کا ذکر ہو رہا ہے۔ اگست کا شمارہ بھی انتہائی غیر دلچسپ تھا۔ حمد و نعت پڑھی، سبحان اللہ کیا اور پیارے نبی کی باتیں سے مستفید ہوتے آگے بڑھے۔

دستک میں حرا مانی مجھے پسند نہیں۔ ثناء جاوید اچھی لگیں۔ صبیحہ ہاشمی سے ملاقات بڑی سویٹ رہی۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا" پہلا ناتا تجھ سے باہر رہا، دوسرا ناتا اچھا تھا۔ اقراء طارق کا حقیقت پر مبنی خط اچھا لگا۔ "شہر تمنا" نعیمہ ناز کا انداز تحریر مجھے پسند نہیں۔ مجھے یہ پوچھنا ہے کہ ہر دوسرے سلسلے وار ناول میں بازار حسن ڈالنا کیوں ضروری ہے۔

"یار دل دار" کچھ بہتر ہے مگر عطیہ خالد کی "خالہ سیریز" بالکل پسند نہیں۔ "عورت نامہ" نزہت جبین ضیاء اچھا لگا۔ "اسیر عشق" انتہائی فضول، بے مقصد تحریر صرف شاعری اچھی تھی۔ "اک دیا رہنے دیا" نگہت سیما کی تو میں ڈائی ہارٹ فین ہوں، مجھے پوچھنا ہے کہ "پل صراط" اور "رقص طاؤس" کتابی شکل میں دستیاب ہیں یا نہیں اگر ہیں تو کس نام سے۔

"اب کے ہم بچھڑے" پرانا موضوع، پرانا انداز مزہ نہیں آیا۔

"شکست فاش" میں عثمان کے ساتھ زیادتی نہیں کردی رائٹر نے۔ "دل میں رکھ لینا" سدرۃ المنتہیٰ روشن سے ہٹ کر اچھا لگا۔ "شام کی حویلی" بہت سست جا رہا ہے اور متاثر کرنے میں ناکام۔ منیر نیازی، اعجاز توکل کی غزلیں پسند نہیں آئیں۔ باتوں سے خوشبو آئے، ہمارے کا سارا زبردست۔ تاریخ کے جھروکے اور پاکستان کے لیے بہت افزا میٹو۔

ہم بے چارے، کچھ زیادہ ہی بے چارے، مزہ آیا پڑھ کر۔

پیاری بشریٰ! ہمیں یاد نہیں کہ ہماری کس کس رائٹر نے "بڑھیا" کا لفظ استعمال کیا۔ دراصل کہانیوں میں الفاظ ماحول اور کرداروں کی مناسبت سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو کرداروں کو واضح کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ بہرحال آپ کو اعتراض ہے تو آئندہ خیال رکھیں گے کہ "بڑھیا" کا لفظ استعمال نہ ہو۔

انڈین فلم کا تذکرہ آپ کو غیر مناسب لگا۔ آپ کی دلیل بھی درست ہے۔ اس لیے ہم نے آپ کے خط کا یہ حصہ ایڈٹ کر دیا ہے کہ کسی کے دل میں تجسس نہ ہو۔ آئندہ بھی احتیاط کریں گے۔

پچھلے پورے سال کی کوئی تحریر آپ کے معیار پر پوری نہ اتر سکی۔ اس کا ہمیں واقعی افسوس ہے۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ آپ کے لیے بہترین تحریروں کا انتخاب کریں۔ لیکن آپ کو کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

کتابوں کے لیے آپ اس نمبر پر فون کرلیں۔

021-32735021

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

امتہ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

قائد اعظم محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لعل نہرو، یہ دونوں شخصیات بیسویں صدی کی اہم ترین شخصیات تھیں، جنہوں نے تاریخ کا رخ بدل دیا، قائد اعظم نے کبھی اصول پرستی اور شرافت ہاتھ سے نہ چھوڑا جبکہ پنڈت نہرو کے نزدیک اصول پرستی اور شرافت کا معیار بالکل ہی الگ تھا بلکہ یہ دونوں اقدار اس کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ وہ ایک مجسم شاطر، فریب کار اور سازشی انسان تھا جو مطلب براری کے لیے سازش، فریب، منافقت، دھوکہ دہی حتیٰ کہ قتل تک سب کچھ جائز سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کو عموماً اور پاکستان کا خصوصاً شاطرانہ اور گمراہ کن چالوں سے اس ایک شخص اور اس کے خاندان نے جتنا نقصان پہنچایا، اتنا اور کسی بھارتی سیاست دان نے نہیں پہنچایا۔ یہ شخص کون تھا۔ اس کا اور اس کے خاندان کا کردار کیسا تھا اس کے متعلق حال ہی میں ایک دلچسپ تحقیق سامنے آئی ہے۔ معلوم نہیں یہ تحقیق درست ہے یا محض افسانہ لیکن جس مدلل انداز میں مع ثبوت پیش کی گئی ہے، یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو اور اس کی بیٹی اندرا گاندھی کی تاریخ نا قابل یقین حد تک دلچسپ بلکہ سنسنی خیز ہے۔ اس خاندان کا شجرہ نسب ایک مغل شہزادے غیاث الدین غازی سے شروع ہوتا ہے جو 1857ء کی جنگ آزادی (انگریزوں کی نظر میں بغاوت) کے وقت دلی شہر کا کوتوال تھا اور بہادر شاہ ظفر ہندوستان کا حکمران تھا۔ اس دور میں مغل حکمران کوئی بھی اہم عہدہ کسی ہندو کو نہیں دیتے تھے۔

اس دور میں شہر کا کوتوال خصوصاً دلی شہر کا کوتوال اہم ترین عہدہ تھا لہٰذا وہ کسی مغل خاندان کے فرد کو ہی دیا جا سکتا تھا، جس پر اس وقت غیاث الدین غازی متمکن تھا۔ یاد رہے کہ اس دور میں شہر کا پولیس کوتوال موجودہ دور کے پولیس کمشنر کے برابر تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں مغلوں کو شکست ہوگئی اور انگریز مسلمانوں کے عموماً اور مغلوں کے خصوصاً دشمن بن گئے۔ انہوں نے ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس کا ذرہ برابر بھی مغل خاندان سے تعلق تھا بلکہ بہت سے لوگ تو محض شک کی وجہ سے بھی موت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جہاں مسلمانوں کا یہ حشر ہوا، وہاں ہندو اور سکھ مکمل طور پر محفوظ رہے کیونکہ ان سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ ان حالات میں بہت سے مسلمان اپنی جانیں بچانے کے لیے ہندو بن گئے یا ہندوؤں کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ان ہی لوگوں میں دلی شہر کا کوتوال غیاث الدین غازی بھی تھا۔

1857ء کی شکست کے بعد انگریزوں نے دلی میں مغلوں کا قتل عام شروع کیا تو غیاث الدین غازی نے ہندوانہ لباس زیب تن کیا۔ اپنا نام گنگا دھر رکھا۔ اس کا گھر لال قلعہ دلی کے نزدیک ایک نہر کے کنارے تھا۔ اسی مناسبت سے اس نے نام کے ساتھ لفظ ''نہرو'' کا اضافہ کیا اور یوں ''گنگا دھر نہرو'' بن کر اپنی فیملی کے ساتھ آگرہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

اپنے خدوخال کی وجہ سے راستے میں یہ شخص پکڑا گیا لیکن اپنے آپ کو کشمیری پنڈت ظاہر کر کے بچ نکلا۔ یہ نام اس لیے بھی سچ معلوم ہوتا ہے کہ پوری بھارتی تاریخ میں کوئی بھی شخصیت، فیملی ''نہرو'' نام کے ساتھ وجود نہیں رکھتی۔ صرف ''گنگا دھر نہرو'' واحد شخص ہے جو 1857ء کی شکست کے بعد تاریخ میں اس لقب کے ساتھ ہی ظاہر ہوا۔ اس پس منظر کی

تفصیل ایم۔ کے۔ سنگھ نے اپنی مشہور ریسرچ ''انسائیکلوپیڈیا آف انڈین وار آف آزادی'' کی جلد نمبر 13 میں دی ہے۔ یہ حقیقت حکومت ہند نے چھپا رکھی ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی شواہد ہیں جو اسی نتیجہ کی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً جواہر لعل نہرو کی دوسری بہن کرشنا ہوتی سنگھ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔

''میرا پردادا 1857ء سے پہلے جب بہادر شاہ ظفر سلطان ہند تھا تو وہ دلی شہر کا کوتوال تھا۔''

جواہر لعل نہرو نے بھی اپنی سوانح عمری میں اعتراف کیا ہے۔

''اس کے پردادا کے ایک پرانے فوٹو میں اس نے مسلمانوں والی ٹوپی اور لمبی داڑھی دیکھی تھی۔ سر پر مغلوں والی ٹوپی تھی اور ہاتھوں میں دو تلواریں تھیں۔ وہ بالکل مغل ''نوبل مین'' کا شاہکار لگتا تھا۔''

نہرو نے اپنی بائیوگرافی میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اس کے پردادا جب دلی سے آگرہ جا رہے تھے تو راستے میں انگریزوں نے انہیں پکڑ لیا تھا جس کی وجہ ان کے مغلوں والے خدوخال تھے لیکن اس نے اپنے آپ اور اپنی فیملی کو کشمیری پنڈت کے طور پر پیش کر کے جان بچائی۔

اس خاندان نے بعد میں الٰہ آباد کے ایک بدنام علاقے میں جا کر پناہ لی تاکہ کسی کو شک نہ گزرے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ مغلوں میں ہندو لڑکیوں سے شادیاں کرنے کا رواج عام تھا۔ شاید غیاث الدین غازی کی بیوی کا تعلق بھی کسی کشمیری پنڈت فیملی سے تھا۔ اس لیے غیاث الدین غازی نے اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچانے کے لیے کشمیری پنڈت کا روپ دھارا اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔

جواہر لعل نہرو وہ شخص تھا جس کی بھارتی عوام پوجا کرتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم الشان انسان اور عظیم سیاست دان تھا، لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اس کی جنم بھومی پر حکومت ہند نے کسی قسم کی یادگار تعمیر نہیں کی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اس کی پیدائش الٰہ آباد میں میرگنج کے محلے کے 77 نمبر مکان میں ہوئی اور یہ علاقہ الٰہ آباد کا مشہور ''ریڈ لائٹ ایریا'' (بازار حسن) ہے۔ اس دور میں بھی یہ محلہ پورے بھارت میں مشہور تھا اور یہ جواہر لعل نہرو کی پیدائش سے پہلے بھی اسی طرح مشہور تھا۔ اس آبائی گھر کا ایک حصہ جواہر لعل نہرو کے باپ موتی لعل نے ایک مشہور طوائف لالی جان کے ہاتھ بیچ دیا اور اس طوائف نے اسے امام باڑہ بنا دیا۔

بعد میں موتی لعل میرگنج کا علاقہ چھوڑ کر آنند بھون منتقل ہو گیا جہاں نہرو کی پرورش ہوئی۔ آنند بھون جواہر لعل نہرو کے آباؤاجداد کی خاندانی رہائش گاہ ضرور تھی لیکن اس عظیم سیاست دان کی جنم بھومی ہرگز نہ تھی۔

جواہر لعل نہرو اور اس کا خاندان کردار کے لحاظ سے بھی کوئی قابل رشک خاندان نہ تھا۔ جواہر لعل نہرو جب بھارت کا وزیراعظم بنا تو انڈین سول سروس کا مشہور بیوروکریٹ مسٹر ایم او متھائی اس کا پرائیوٹ سیکریٹری مقرر ہوا جس نے کافی عرصہ وزیراعظم کے ساتھ گزارا۔ بعد میں اس نے نہرو کے ساتھ گزارے گئے ایام پر کتاب لکھی۔

اس کتاب میں متھائی نے انکشاف کیا ہے کہ نہرو اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن (آخری وائسرائے ہند) کی بیوی ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کے درمیان پاگل پن کی حد تک معاشقہ تھا جو اکثر اندرا گاندھی کے لیے پریشانی اور ندامت کا باعث ثابت ہوتا۔ اندرا گاندھی جب بہت زیادہ پریشان ہوتیں تو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات حاصل کرتیں کہ وہ نہرو کو سمجھائیں تاکہ وہ اپنے معاشقے میں اعتدال سے کام لے اور یوں پورے خاندان کو تضحیک سے بچائے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن جب وائسرائے ہند تھا تو اس عشق کا پتا تو بہت سے لوگوں کو تھا لیکن وائسرائے کی وجہ سے لوگ زبان نہیں کھولتے تھے۔ بعد میں جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور نہرو وزیراعظم بنا تو یہ

www.paklibrary.com

تعلقات اور بھی مضبوط ہوئے۔ نہرو کی بیوی مر چکی تھی۔ ایڈوینا اکثر ہندوستان آتی اور وزیراعظم کے ذاتی مہمان کے طور پر وزیراعظم گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرتی۔ سرکاری اور نجی تقریبات میں دونوں ایک ہی صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھتے اور ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کرتے۔

نہرو بھی اکثر نجی دوروں پر انگلینڈ جاتا تو ایڈوینا ایئرپورٹ پر انتظار کرتی۔ جوں ہی نہرو جہاز سے اترتا وہ اسے ذاتی کار میں لے کر فرانس چلی جاتی، وہاں وہ اسے اپنے ساتھ اپنی خاندانی رہائش گاہ میں ٹھہراتی اور یہ سارا عرصہ دونوں باہر کہیں گھومنے پھرنے نہ جاتے۔

دونوں کی وفات کے بعد دونوں کے عشقیہ خطوط — اسکینڈل کی شکل میں سامنے آئے لیکن پیشتر اس کے کہ یہ اسکینڈل بہت زیادہ رنگ پکڑتا، دونوں طرف سے وضاحتی بیانات کے ساتھ معاملہ دبا دیا گیا۔

نہرو کا معاشقہ صرف لیڈی ماؤنٹ بیٹن تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بیک وقت کئی ایک اور خواتین بھی اس کی منظور نظر تھیں۔ اسے سروجنی نائیڈو کی بیٹی پدماجی نائیڈو سے بھی شدید عشق تھا اور اس عشق کی وجہ سے اسے بنگال کا گورنر بنوا دیا۔ یہ عشق بھی اتنا شدید تھا کہ نہرو ہر وقت پدماجی کی تصویر اپنے بیڈروم میں رکھتا تھا جسے اندرا اکثر وہاں سے ہٹا دیتی اور وہ دوبارہ رکھ دیتا۔ اس معاملے پر کئی دفعہ باپ بیٹی میں تکرار بھی ہوئی۔ ان دو خواتین کے علاوہ نہرو کو بنارس کی ایک سنیاسن شردھا ماتا بھی بہت پسند تھی۔ اس کے ساتھ بھی نہرو کے خصوصی تعلقات تھے۔ یہ خاتون بہت خوب صورت اور سنسکرت کی مسلمہ اسکالر تھی۔ اسے پرانی ہندو دیومالائی تاریخ پر عبور حاصل تھا۔

نہرو اور شردھا ماتا کے گہرے تعلقات بالآخر رنگ لائے اور یہ خاتون حاملہ ہوگئی۔ اس نے نہرو کو شادی کے لیے بہت مجبور کیا لیکن نہرو اپنے سیاسی کیریئر تباہ ہونے کے ڈر سے ایسا قدم نہ اٹھا سکا۔

بالآخر اس خاتون نے بنگلور کے ایک کانونٹ میں ایک ناجائز بچے کو جنم دیا۔ اسے کرسچین مشن اسکول میں تعلیم دی گئی۔ اندازاً اس کی تاریخ پیدائش 30 مئی 1949ء ہے۔ ہوسکتا ہے وہ تادم تحریر زندہ ہو لیکن چونکہ کانونٹ ایسے معاملات مکمل طور پر خفیہ رکھتا ہے تاکہ کسی کی تضحیک نہ ہو اس لیے ناجائز بچے کا کسی کو پتا نہ چل سکا۔ شاید اسے خود بھی پتا نہ ہو۔ ایم۔ او۔ متھائی نے اپنی کتاب میں اس بچے کی پیدائش اور موجودگی کا ذکر کیا ہے لیکن کسی نے اس کی تلاش کی کوشش نہ کی۔ کانونٹ میں پیدائش اور تربیت کی وجہ سے یہ شخص یقیناً کیتھولک عیسائی ہوگا اور اسے بھی اپنے باپ کا علم نہیں ہوگا۔

نہرو بچپن سے آزاد خیال اور رنگین مزاج شخص تھا۔ اس کی شادی بھی کملا نہرو کے ساتھ اس کی پسند کے خلاف کی گئی۔ کملا ایک باعزت اور خوددار خاتون تھی۔ اس کا خاوند سیاست اور دوسری عورتوں میں اتنا مصروف ہوا کہ اس کے پاس اپنی بیوی کے لیے وقت ہی نہ بچا۔ اسی غم میں اسے ٹی بی ہوگئی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی لیکن نہرو اس کے لیے وقت نکال سکا نہ دل میں جگہ بنا سکا۔

نہرو کا ذاتی کردار اور بھی کئی صورتوں میں سامنے آیا مثلاً پٹیل جی، سبھاش چندرا بوس اور ڈاکٹر شیام پرساد مکھرجی، آزادی کے بعد وزیراعظم کے عہدے کے مضبوط دعوے دار اور نہرو کے حریف تھے۔ حیران کن بات ہے کہ دونوں کی موت بہت ہی پراسرار انداز میں ہوئی جس کا آج تک پتا نہیں چلا۔

مسٹر ایس۔ سی بھٹ نے اپنی کتاب "دی گریٹ ڈیوائڈ مسلم سپریشن" میں نہرو خاندان پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ مسٹر بھٹ کے مطابق نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت کے اپنے والد کے ایک مسلمان ملازم سید حسین کے ساتھ تعلقات تھے۔ یہ تعلقات اس حد تک چلے گئے کہ وہ سید حسین کے

ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ موتی لعل نہرو زبردستی اسے واپس لائے اور پھر رنجیت پنڈت نامی شخص کے ساتھ زبردستی شادی کی۔

نہرو خاندان کے ذاتی کردار بڑے رومانوی قسم کے ہیں۔ نہرو کی بیٹی اندرا پریادرشنی (بعد میں اندرا گاندھی) نے بھی خاندان کی اس اخلاقی بے راہ روی کی روایت جاری رکھی۔ ذہین و فطین اندرا گاندھی کو تعلیم کے لیے آکسفورڈ میں داخل کرایا گیا لیکن وہاں اپنی غیر تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے اچھی کارکردگی نہ دکھا سکی جس وجہ سے اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔ بعد میں اس نے شانتی نکیتن یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن یہاں سے بھی اسے گرودیو رابندرا ناتھ ٹیگور نے اس کے غیر اخلاقی رویہ پر بھگا دیا۔ یونیورسٹی سے تو بدنام ہو کر نکل چکی تھی۔ والد سیاست میں مشغول تھا جس کے پاس اندرا کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ والدہ ٹی بی کی مریضہ تھی اور سوئٹزرلینڈ میں زیر علاج تھی تو اب اندرا تنہائی اور ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔

اس موقع پر فیروز خان اس کی زندگی میں داخل ہوا اور وہ اس کی طرف کھنچی چلی آئی۔ فیروز خان ایک کریانہ مرچنٹ نواب خان نامی شخص کا بیٹا تھا۔ نواب خان کی الہ آباد میں کریانہ کی دکان تھی اور موتی لعل کے گھر شراب فراہم کرتا تھا۔ اس حوالے سے فیروز خان کا آنند بھون میں آنا جانا ہوا۔ اندرا کو اپنی تنہائی اور بوریت دور کرنے کا موقع ملا اور فیروز خان کو زندگی کی رنگینی دوبالا کرنے کا۔ دونوں اس حد تک قریب آ گئے کہ تمام فاصلے مٹ گئے۔ اسی دوران فیروز خان بھی انگلینڈ چلا گیا، جہاں وہ اندرا کی والدہ کی تیمارداری بھی کرتا اور اندرا کو بھی خوش رکھتا بلکہ ماں بیٹی دونوں کے لیے مسیحا بن گیا۔

اس وقت کے مہاراشٹر کے وزیراعظم شری پرکاش نے نہرو کو اندرا کے فیرز خان کے ساتھ تعلقات کے بارے میں خبردار بھی کیا لیکن نہرو شدید سیاسی مصروفیات کی وجہ سے بیٹی کے لیے وقت ہی نہ نکال سکا۔ جب اس نوجوان جوڑے کے تعلقات خطرناک حد تک بڑھ گئے تو نوجوان اندرا مسلمان ہو گئی اور لندن کی ایک مسجد میں دونوں نے شادی رچالی۔ شادی کے بعد اندرا پریادرشنی نہرو نے اپنا نام تبدیل کر کے اسلامی نام میمونہ بیگم رکھا۔ اندرا کی والدہ کملا نہرو اس شادی کی سخت مخالف تھی لیکن اندرا نے اس کی ایک نہ سنی۔ نہرو بھی اس لیے سخت ناراض تھا کہ اندرا کے مسلمان بننے سے اس کا وزیر اعظم بننے کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا۔ یاد رہے کہ یہ آزادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔

اب نہرو نے اپنے نوجوان داماد فیروز خان کو مجبور کیا کہ وہ بے شک مذہب تبدیل نہ کرے لیکن صرف اپنے نام کے ساتھ خان ہٹا کر گاندھی بطور لقب لگانے۔ ایسا کرنے کے لیے زیادہ کاروائی کی ضرورت بھی نہ تھی بلکہ یہ تبدیلی صرف ایک بیان حلفی سے ممکن تھی۔ اس نام کا اسلام یا ہندو ازم سے کوئی تعلق نہیں تھا تو یوں نہرو کے اصرار پر وہ فیروز خان سے فیروز گاندھی بن گیا۔ یہاں یہ باریک سا نکتے کا فرق واضح ہونا چاہیے کہ Gandhi تو ہندو لقب ہو سکتا ہے لیکن Gandhy ہندو لقب یا ہندو نام نہیں ہے۔ گو یہ ہے بڑا عجیب سا نام اردو میں Gandhi اور Gandhy کے ہجے ایک جیسے ہیں۔ اس لیے فرق کا پتا نہیں چلتا۔ فیروز خان اور اندرا دونوں نے اپنے اپنے نام بھارتی عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے بدلے تھے۔

جب وہ واپس ہندوستان آئے تو ان دونوں کی ایک نقلی قسم کی شادی ہندوانہ رسم و رواج کے مطابق بھی رچائی گئی۔

اندرا گاندھی کے دو بیٹے تھے جن کا نام تھا راجیو گاندھی اور سنجے گاندھی (اردو میں ان ناموں کا فرق مکمل طور پر واضح نہیں ہوتا) سنجے گاندھی کا اصل نام سنجیو گاندھی تھا کیونکہ راجیو اور سنجیو ہم قافیہ نام ہیں۔ اس نام کی تبدیلی کا بھی بڑا دلچسپ پس منظر ہے۔ وہ

www.pklibrary.com

یوں کہ سنجیو گاندھی انگلینڈ میں زیر تعلیم تھا۔ وہاں اس نے ایک کار چوری کی اور پکڑا گیا۔ چوری کا الزام ثابت ہو گیا اور یوں وہ اس مقدمے میں گرفتار ہو گیا۔ کرشنا مینن اس وقت انگلینڈ میں بھارتی سفیر تھا۔ اندرا گاندھی نے اسے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے سنجیو کو چھڑانے کا ٹاسک دیا۔ کرشنا مینن اور کچھ تو نہ کر سکا لیکن سنجیو کا نام تبدیل کر کے سنجے یعنی Sanjiv Gandhi سے Sanjay Gandhi کر کے نیا پاسپورٹ بنا دیا اور اس "i" اور "a" کے فرق سے سنجے رہا ہو گیا۔

اندرا کی موت کے بعد ایک بھارتی اسکالر کے۔ این۔ راؤ نے دی نہرو ڈائنسٹی نام سے کتاب لکھی جس میں اندرا گاندھی کے خفیہ تعلقات سے پردہ اٹھایا۔ کے این راؤ کے مطابق راجیو گاندھی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد اندرا گاندھی (مسز فیروز خان) اور اس کے خاوند فیروز خان کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہو گئے اور دونوں علیحدہ علیحدہ رہنے لگے۔ دونوں کے درمیان کوئی میل ملاپ نہ رہا لیکن باقاعدہ طلاق بھی نہ ہوئی۔

اس علیحدگی کے دوران اندرا پریگننٹ ہوئی اور سنجے گاندھی پیدا ہوا۔ مصنف کے مطابق سنجے گاندھی فیروز خان کا بیٹا نہیں تھا بلکہ یہ ایک اور مسلمان جنٹل مین یونس خان کا بیٹا تھا جو اندرا گاندھی کا رائٹ ہینڈ تھا اور ان دونوں کے درمیان بہت نزدیک تعلقات تھے۔ دراصل اندرا گاندھی ایک ضدی اور ہٹ دھرم قسم کی خاتون تھی۔ شادی کے وقت اس نے اپنے ماں باپ کی بھی نہ مانی۔

یہی رویہ اس کا ازدواجی زندگی میں بھی برقرار رہا۔ وہ ہر بات طاقت سے منوانے کی عادی تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنے خاندان کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کی وجہ سے بالآخر ہر بات اسی کی مانی جاتی۔ اندرا کے سیاست میں آنے کے بعد فیروز خان کی حیثیت ایک گھریلو ملازم سے زیادہ نہ تھی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ عموماً ہندو اور خصوصاً برہمن فیملی کی خواتین ایسے کردار کی مالک نہیں ہوتیں۔ خاندانی ہندو خواتین میں تو خاوند کی حیثیت ایک دیوتا کی سی ہوتی ہے جس کو راضی رکھنا، اس کی خدمت کرنا اور قدم چھونا وفاداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اندرا کی عادات بالکل اس کے برعکس مغل شہزادیوں والی تھیں۔ کسی قسم کی اپوزیشن برداشت نہیں کرتی تھی حتیٰ کہ خاوند کی بھی نہیں۔

سنجے کی پرورش بھی مغل شہزادے کی طرح ہوئی۔ ہر بات میں صرف اپنی ہی منواتا۔ جب جوان ہوا تو کئی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بنا لیکن خود وہ اپنا دل ایک سکھ لڑکی مانیکا کو دے بیٹھا اور یہ معاشقہ بھی بالآخر شادی پر ہی اختتام پذیر ہوا۔ جب اس نے شادی کا فیصلہ کیا تو اس وقت اندرا اور اس کا خاوند فیروز گاندھی علیحدہ علیحدہ رہ رہے تھے۔ سنجے کی شادی کا بندوبست یونس خان کے گھر میں کیا گیا۔ یونس خان اس شادی پر بہت رنجیدہ تھا کیونکہ وہ سنجے کی شادی اپنی پسند کی ایک مسلمان لڑکی سے کرنا چاہتا تھا لیکن سنجے نے خاندانی روایات برقرار رکھتے ہوئے یونس خان کی بات نہ مانی۔ تو یوں یہ شادی بھی خاندانی روایات کا تسلسل تھی۔

سنجے ایک آزاد خیال نوجوان تھا۔ فلائنگ کا بڑا شوقین تھا۔ بالآخر اس کی موت بھی بڑے پراسرار انداز میں جہاز اڑاتے ہوئے واقع ہوئی۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب سنجے ہوائی حادثے میں مرا تو سب سے زیادہ غم یونس خان کو ہوا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رویا۔ یونس خان کی ذاتی "پرسن، پیشن اینڈ پولیٹکس" میں یونس خان خود تحریر کرتا ہے کہ سنجے کے ختنے کرائے گئے تھے جو اسلامی روایات کا واضح ثبوت ہے۔

------ سنجے گاندھی اندرا گاندھی کا بہت ہی لاڈلا بیٹا تھا۔ اندرا اس سے دبتی تھی۔ اصل حالات سے واقف

کاروں کے مطابق سنجے کو اپنے اصل والد کا علم تھا۔ وہ اندرا کو اپنے اصل باپ کا بتا کر بلیک میل کرتا تھا۔ راز افشا ہونے کے ڈر سے اندرا ہمیشہ اس سے مغلوب رہتی اور یوں بالواسطہ طور پر حکومت وہی چلاتا تھا۔ وہ ہر حکومتی کام میں دخل اندازی کرتا اور اندرا اسے برداشت کرتی۔

اندرا اس کی تربیت مستقبل کے وزیراعظم کے طور پر کر رہی تھی۔ جب وہ ہوائی حادثے میں مرا اور اطلاع اندرا گاندھی تک پہنچی تو سب سے پہلے اس نے سنجے کی ذاتی چابیوں اور ڈائری کا پوچھا جن میں سب خاندانی راز مدفون تھے۔ سنجے کی ہوائی حادثے میں موت بھی پراسرار انداز میں واقع ہوئی۔ وہ ایک نیا جہاز اڑا رہا تھا جو نیچے گرا اور اس انداز میں جہاز تب ہی گرتا ہے جب اس کا فیول ختم ہو لیکن فلائٹ رجسٹر کے مطابق اڑان سے پہلے جہاز میں پورا فیول بھرا گیا تھا۔ اس طرح کسی طریقے سے بھی اس کے یوں گرنے کا خطرہ نہ تھا۔ اندرا گاندھی اس وقت وزیراعظم تھی۔ اس نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرکے انکوائری بھی نہ ہونے دی۔ ان تمام شواہد کو یکجا کرکے دیکھا جائے تو بہت سے شک و شبہات جنم لیتے ہیں۔

بھارت کے اس وقت کے وزیر خارجہ کے نٹور سنگھ نے اندرا گاندھی کے مغلوں سے تعلق داری کے متعلق اپنی کتاب پروفائل اینڈ لیٹرز میں دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ نٹور سنگھ کے مطابق 1968ء میں اندرا گاندھی افغانستان کے سرکاری دورے پر گئی اور نٹور سنگھ ساتھ تھا۔ وہاں سارا دن اپنا کام ختم کرنے کے بعد اندرا گاندھی نے شام کے وقت گھومنے پھرنے کا اظہار کیا جو پروگرام میں شامل نہ تھا۔ فوراً سیکیورٹی مہیا کر دی گئی اور اندرا گاندھی گھومنے نکل گئی۔

کافی دیر گھومنے کے بعد اندرا گاندھی نے مغل خاندان کے بانی ظہیر الدین بابر کے مزار پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پورے بھارتی اسٹاف اور افغان سیکیورٹی اہلکاروں نے ہر ممکن طریقے سے اسے وہاں جانے سے روکا کیونکہ یہ وزٹ دورے اور روٹ سے بالکل ہٹ کر تھا۔

اندرا کی ضد کی وجہ سے اندرا کو بابر کے مزار پر لے جایا گیا۔ یہ ایک سنسان اور بے رونق جگہ پر تھا۔ اندرا مقبرے کے اندر گئی۔ بابر کی قبر کے سامنے کھڑے ہو کر احتراماً سر جھکا کر چند منٹ خاموش کھڑی رہی۔ نٹور سنگھ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

جب وہ غمگین انداز میں وہاں سے نکلی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"آج میرا تاریخ سے ٹاکرا ہوا ہے۔"

یاد رہے کہ بابر ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا بانی تھا جس سے نہرو خاندان چلا۔

نہرو خاندان کی اگلی اہم شخصیت راجیو گاندھی تھا جسے حادثاتی وزیراعظم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی والدہ آنجہانی اندرا گاندھی نے تو راجیو کے چھوٹے بھائی سنجے کو وزارت عظمیٰ کے لیے "گروم" کیا تھا لیکن وہ ہوائی حادثے کا شکار ہو گیا پھر اندرا قتل ہو گئی تو یوں اقتدار کا ہما اچانک راجیو کے سر پر آ بیٹھا جو بعد میں اپنی ہی لاپروائی سے خود بھی حادثے کا شکار ہو گیا۔

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ شبینہ گل کی والدہ ڈینگی بخار میں مبتلا ہو کر اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں جیسی ہستی جس کا کوئی نعم البدل نہیں، اس کا دنیا سے رخصت ہو جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم بہن شبینہ گل کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ ان کی والدہ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

برصغیر کے لیڈروں بلکہ صاحب اقتدار لوگوں کا سب سے بڑا شوق اپنی ''شخصیت پرستی'' کا ہے۔ نیک کام تو شاید ہی ان سے سرزد ہوتا ہو لیکن قومی اداروں کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنے کا جنون ہے۔ یہی شوق آنجہانی وزیراعظم راجیو میں بھی تھا۔ اس وقت ان گنت ادارے اس کے نام کے ساتھ منسوب ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو حالات نے اسے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا وزیراعظم بنادیا لیکن اس میں ''لیڈروں'' والی کوئی خاصیت تھی ہی نہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک نالائق۔ ڈرپوک اور کرپٹ انسان تھا۔

بزدل اور متلون مزاج اتنا تھا کہ کوئی اہم فیصلہ کرہی نہیں سکتا تھا۔ بعض معاملات میں اس کی سوچ شیخ چلی والی ہوتی مثلاً اپنی والدہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے آپ کو عظیم اور تاریخی ہیرو ثابت کرنے کا شوق سمایا۔ بیٹھے بٹھائے پاکستان پر حملے کا حکم دے دیا۔ فوج نے کئی راتیں جاگ کر حملے کا منصوبہ تیار کیا جس میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں چھاتہ بردار فوج اتارنی تھی لیکن یہ منصوبہ آشکار ہوگیا۔ پاکستان کے صدر ضیاء الحق مرحوم نے ''کرکٹ ڈپلومیسی'' کے نام پر بھارت کا دورہ کیا۔ راجیو کو کچھ اس طرح آنکھیں دکھائیں کہ رات بھر سو نہ سکا۔ اسی رات حملے کا منصوبہ ختم کردیا۔

یہاں ایک اور بھی دلچسپ انکشاف ہے اور وہ ہے اندرا گاندھی کی موت کا۔ عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس کے سینے اور سر میں گولیاں لگی تھیں جس سے ان کے دل اور دماغ میں سوراخ ہوئے اور وہ مرگئی۔ حقیقت یہ نہ تھی۔ دراصل جب اسے گولیاں لگیں اور وہ گر پڑی تو اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اگر اس کا خون روک لیا جاتا تو شاید وہ بچ جاتی۔

وزیراعظم اور دیگر وی وی آئی پیز کی فوری طبی امداد کے لیے مخصوص ادارہ ہے جہاں ایسے ایمرجنسی کیسز کو فوری امداد پہنچائی جاتی ہے۔ پروٹوکول کے مطابق زخمی ہونے کے بعد اندرا گاندھی کو فوری طور پر (اے آئی آئی ایم ایس) لے جانا چاہیے تھا لیکن سونیا گاندھی نے وہاں لے جانے سے روک دیا بلکہ ایمبولینس کو ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہسپتال جانے کے احکامات دیے جو کچھ فاصلے پر تھا۔ جب ایمبولینس وہاں پہنچی تو سونیا نے اپنا ارادہ تبدیل کرلیا اور واپس اے آئی آئی ایم ایس جانے کے احکامات دے دیے۔ وہاں پہنچنے تک چوبیس قیمتی منٹ ضائع ہوگئے۔

اس دوران اس کا اتنا خون بہہ گیا کہ وہ جانبر نہ ہوسکی۔ یہ ایک قسم کا عملاً قتل تھا۔ یہ سوال اب تک حل طلب ہے کہ آیا سونیا گاندھی نے اپنی بے وقوفی سے ایسا کیا یا جان بوجھ کر، تاکہ اس کا خاوند فوری طور پر وزیراعظم بن سکے کیونکہ راجیو کے مقابلے میں راجیش پائلٹ اور مدھاو راؤ سندھیا بھی مضبوط امیدوار تھے۔

اگر یہ تاریخی حقائق سچ ہیں تو یہ تاریخ کا ایک دلچسپ تضاد ہے۔ وہ یوں کہ جواہر لعل نہرو کے جد امجد مسلمان تھے اور وہ آزاد ہند کا ہیرو بنا۔ علامہ سر محمد اقبال کے جد امجد ہندو تھے اور وہ پاکستان کا ہیرو بنا۔

(تاریخ کے زخم...... سکندر خان بلوچ)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

اسپیگھٹی سلاد

ضروری اشیاء

اسپیگھٹی	ایک کپ
مرغی کا گوشت	ایک کپ
ٹماٹر	ایک عدد

پکوان......خواتین...... Pakwan

مکئی کے دانے	آدھا کپ
ہری پیاز	آدھا کپ
وائٹ سوس	ایک کپ
نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:
اسپیگھٹی کو پیکٹ پر دی گئی ہدایات کے مطابق ابال لیں۔ پتیلے میں تیل گرم کرکے ابلی ہوئی مرغی ڈال کر فرائی کریں۔ اس میں کیوب کی طرح کٹے ہوئے ٹماٹر، مکئی کے دانے، ہری پیاز، وائٹ سوس، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر اور اسپیگھٹی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ چولہے سے اتار کر سرو کریں۔

اسپیگھٹی اور سبزی ساس

ضروری اشیاء

اسپیگھٹی	ایک پیکٹ
چکن	ایک پاؤ
ٹماٹو پیوری	دو عدد
پھلیاں	ایک کپ
ہری پیاز	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
پسی سیاہ مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی لال مرچیں	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:
اسپیگھٹی کو پیکٹ پر دی گئی ہدایات کے مطابق تیار کرلیں۔ دیگچی میں تیل گرم کرکے اس میں چوپ کی ہوئی پیاز ڈال کر لائٹ براؤن ہونے تک فرائی کریں۔ اس میں بون لیس چکن، ٹماٹر، کٹی ہوئی پھلیاں، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، کٹی لال مرچیں اور چینی ڈال کر تھوڑا پانی ڈالیں اور ڈھک کر گوشت گل جانے تک پکائیں۔ ہری پیاز ڈال کر دو منٹ تک ڈھک کر پکانے کے بعد چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ پلیٹ میں ایک طرف اسپیگھٹی رکھیں۔ دوسری طرف سبزیاں رکھ کر سرو کریں۔

اسٹیم چنیوٹی ران

ضروری اشیاء:

ران	ڈیڑھ کلو
سرکہ	آدھا کپ
پپیتا	چار کھانے کے چمچے
لہسن، ادرک	دو کھانے کے چمچے
مرچ	دو چائے کے چمچے
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
لیموں	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
آلو بخارے	بارہ عدد
ہری مرچ پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
پسی بڑی الائچی	چار عدد
دار چینی	دو ٹکڑے
تیل	آدھا کپ

ترکیب:
ران کو گود لیں پھر لہسن، ادرک، سرکہ، نمک، پپیتا لگا کر چار سے پانچ گھنٹے چھوڑ دیں۔ اب گرم تیل میں ران کو فرائی کر لیں۔ ران ٹھنڈی کر کے دہی میں تمام مسالا آلو بخارے کا گودا مکس کر کے ران پر لگا کر دو گھنٹے چھوڑ دیں اب دیگچی میں پانی گرم کریں اور اس پر چھلنی رکھ کر ران رکھیں اور ایک گھنٹے اسٹیم دیں۔ سلاد نان یا چاول کے ساتھ سرو کریں۔ ہری پیاز سے سجا دیں۔

لاہوری مرغ ملائی کباب

ضروری اشیاء:

مرغی	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
پسی سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
کچری پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
پسا لہسن، ادرک	دو چائے کے چمچے
دودھ	آدھا کپ
فریش کریم	ایک پیکٹ
تیل	دو کھانے کے چمچے
کوئلہ	ایک عدد

ترکیب:
ایک پیالے میں سیاہ مرچ مسالا، گرم مسالا، لال مرچ، کچری پاؤڈر، لہسن، ادرک دودھ اور فریش کریم ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے اس میں گوشت ڈالیں اور ایک اور بار مکس کر کے آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں میرینیٹ کیا ہوا گوشت ڈال کر پانی ڈالے بغیر ڈھک کر پکائیں۔ پانی خشک ہونے پر ایک سے دو منٹ تک بھون لیں۔ کوئلہ دہکا کر دم دیں۔ مزیدار مرغ ملائی کباب تیار ہے چٹنی اور سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

مرغ نہاری

ضروری اشیاء:

چکن	ایک کلو
لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچے
دہی	آدھا کپ
پیاز	ایک عدد
آٹا	آدھا کپ
گھی	ایک کپ
پسی مرچ	دو چائے کے چمچے
ہلدی	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ان مسالوں کو باریک پیس لیں

سونف	ایک کھانے کا چمچہ
سونٹھ	دو کھانے کے چمچے
چھوٹی الائچی	چار عدد
بڑی الائچی	دو عدد
لونگ	پانچ عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
کالی مرچ	چھ عدد
زیرہ	دو چائے کے چمچے

(ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں، ادرک سلائس)

ترکیب:
تیل میں پیاز چوکور کاٹ کر ڈالیں۔ لائٹ براؤن ہو جائے تو چکن کے بڑے ٹکڑے لہسن، ادرک، نمک، پسی مرچ ہلدی ڈال کر بھونیں۔ اب پسا ہوا باریک مسالا اور دہی ڈال کر بھونیں اور چکن گلنے کے لیے پانی ڈال دیں۔ چکن گل جائے تو حسب ضرورت شوربے میں ابال دے کر آٹا گھول کر ڈالیں۔ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا ہری مرچ، ادرک اور لیموں سے سجا دیں۔ نان کے ساتھ پیش کریں۔

عمر رسیدگی کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ بہت ہی کم ایسی خواتین ہوتی ہیں جو اپنی بڑھتی عمر اور قریب آتے بڑھاپے کو باوقار انداز میں قبول کرتی ہیں۔ عمر رسیدگی کے اس قدرتی عمل کو درست غذا سے سست روی کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ بچپن سے صحت بخش غذا کی عادت ڈالی جائے تو انسان اندر سے صحت مند رہتا ہے۔ یہ غذائیں اور جسمانی نظام کے لیے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ عمر رسیدگی کے عمل کو بھی سست بناتی ہیں۔

رنگین سبزیاں و پھل

بند گوبھی، بروکلی، شلجم، مولی، آملہ، گاجر وغیرہ وٹامن A اور C سے مالا مال ہوتی ہیں۔ یہ بینائی کے لیے انتہائی مفید ہیں اور بصری مسائل کا قدرتی حل بھی۔ پالک اور ہرے پتوں والی دیگر سبزیاں آئرن سے بھرپور ہوتی ہیں۔ رنگین سبزیوں میں موجود غذائی خزانے دماغ کو الزائمر کی بیماری کے جھٹکوں سے محفوظ رکھنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہ سرطان سے بچاؤ بھی کرتے ہیں۔ پپیتا، چیکو، کیلے جیسے پھل آئرن، پوٹاشیم اور وٹامن E کے حصول کا وسیلہ ہوتے ہیں اور یہ جلد کو جوان و کم عمر رکھتے ہیں۔ سبزیوں کو ہمیشہ بہت تھوڑی دیر پکائیں پھر کھائیں کیونکہ اگر ان کو ضرورت سے زیادہ پکایا تو ان میں موجود نمکیات ضائع ہو جاتے ہیں۔

ٹماٹر

دائمی عارضہ قلب و معدے، منہ اور آنت کے سرطان کے خلاف تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس میں وٹامن A اور E موجود ہوتے ہیں جو آنکھوں اور جلد کے لیے نعمت ہیں۔ اس کی علاوہ بیوٹی پارلر میں اس کو فیس ماسک میں شامل کر کے بھی جلد پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ادارہ

خوبصورت بنیں

لہسن

لہسن کو کولیسٹرول گھٹانے اور ہائی بلڈ پریشر کو کم کرنے کے لیے مفید جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لہسن سے آنت، تنفس اور جلد کی بے قاعدگیوں کے علاج میں بھی مدد لی جاتی ہے۔ جن لوگوں کو دل کی بیماری لاحق ہوتی ہے۔ ان کے لیے بھی لہسن فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ لہسن کھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ شروعات میں اس کی مقدار کم رکھیں۔ اس کے بعد بتدریج یہ مقدار بڑھائیں۔ بصورت دیگر متلی یا اسہال جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کیونکہ زیادہ مقدار میں کھانے سے یہ معدے پر گراں گزرتا ہے۔

گری دار میوے

بادام، پستے، اخروٹ وٹامن E، آئرن، پوٹاشیم، زنک اور اومیگا تھری روغنی تیزابی اجزاء سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ تمام اجزاء ہی ہمارے جسم کے صحت مند رہنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہ فشار خون کو قابو میں رکھتے اور عمر رسیدگی کے عمل کو بھی سست کرتے ہیں۔ بادام اور سادی مونگ پھلیوں میں ایسے لازمی روغنیات ہوتے ہیں جو جلد کو جوان و شگفتہ رکھنے کے لیے مددگار و ہم اہوتے ہیں۔ اخروٹ اور حل غیر معیاری کولیسٹرول کو کم کر کے معیاری و مفید کولیسٹرول کی سطح کو جسم میں بڑھانے کا باعث ہیں۔

دہی اور شہد

دہی ہمارے مزاحمتی نظام جسم کو زبردست توانائی فراہم کرتا ہے اور ہمارے جسم کو ٹھنڈک بھی پہنچاتا ہے

یہ نظام ہضم کے لیے نہایت مفید ہے اور غذا کو ہضم کرنے میں مددگار بھی۔ شہد فوری توانائی مہیا کرتا ہے۔ شہد سے بے چینی، گھبراہٹ اور دباؤ تناؤ میں کمی آتی ہے اور اس یادداشت کی خرابی کے مسائل کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

پھل

اسٹرابیریز، سیاہ انگور، رس بھری، بلیو بیری، جامن یہ سب ہی نمکیات کا ایک وافر ذخیرہ اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں۔ جامن میں وٹامن A,B,C ہوتے ہیں اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں جامن سے ذیابیطس کے علاج اور نظام ہضم کی خرابیوں میں مدد لی جاتی ہے۔

سویابین

سویابین ہارمون کے غیر متوازن ہوجانے کے باعث پیدا ہونے والی عمر رسیدگی کے لیے لڑتا ہے یہ کیلشیم کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے اوسٹیو پروسس سے تحفظ فراہم کرنے میں مددگار بھی۔ سویابین کو چھاتی کے سرطان آنت اور پروسٹیٹ گلینڈ سے تحفظ حاصل کرنے کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ الزائمر کی بیماری اور عارضہ قلب سے بھی حفاظت عطا کرتا ہے۔ سن یاس کے عرصے میں سویا، خواتین کے اوسٹروجن لیول کو برقرار رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔

پانی و پھلوں کے رس

جسم و جلد کو ہر وقت نم رکھنے کے لیے سادہ پانی ہی بہترین ہے۔ جلد میں چمک و تازگی پیدا کرنے اور جسم سے سمی مادوں کے اخراج کے لیے روزانہ آٹھ، دس گلاس پانی پینا بہترین حکمت عملی ہے اسی دوران ایک یا دو گلاس کسی سبزی یا پھل کے تازہ جوس بھی لے سکتے ہیں۔ تاکہ ان کے فوائد بھی آپ کے جسم کو حاصل ہوں۔ کریلے، کھیرا، لوکی، چیکو، موسمبی، کینو اور لیموں کے رس سے بنے ہوئے مشروبات آپ کی جلد کے لیے نہایت فائدہ مند ہیں اور یہ سب ہی جسم میں نمی مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ عمر رسیدگی کے عمل میں بھی سست روی لاتے ہیں۔ ناریل پانی میں بھی بے شمار غذائی اجزاء پوشیدہ ہیں، جو ہمارے لیے اکسیر کا کام کرتے ہیں۔

تربوز و خربوزہ

تربوز اور خربوزہ کھانے سے جلد اور جسم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ تربوز میں وٹامن A,B,C ہوتے ہیں جو جسم کو تازگی و ٹھنڈک دیتے ہیں۔ اس کے بیج میں سیلیکیم، زنک اور وٹامن E موجود ہوتا ہے۔ تربوز اور خربوزہ عمر رسیدگی کے عمل میں بھی سست روی لانے کا سبب بنتے ہیں۔

کوکو

خون کی نالیوں کو اپنا کام پوری تندہی سے انجام دینے میں مدد دیتا ہے۔ اس کی مدد سے خون کی نالیاں جواں رہتی ہیں اور بلڈ پریشر، خون، گردے کی بیماریوں اور نسیان کے مرض کے امکانات معدوم ہوتے ہیں۔ کوکو کا استعمال کیک اور ملک شیک میں کریں۔ گہری رنگت اور تلخ ذائقے والی چاکلیٹ کھانا زیادہ مفید و بہتر ہے کیونکہ اس میں چینی کی مقدار کم ہوتی ہے اور کوکو زیادہ مقدار میں موجود ہوتا ہے دیگر ایسی چاکلیٹ جن میں کوکو کی مقدار کم ہو، کبھی کبھار یا بہت کم کھائیں کیونکہ ان میں مٹھاس اور روغنیات کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔